ولی دکنی کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ

(مقالہ برائے پی ایچ ڈی)

مقالہ نگار

خوشتر زریں ملک

نگراں

پروفیسر معین الدین جینابڑے

ہندُستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویجز، لٹریچر اینڈ کلچرل اسٹڈیز

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-۱۱۰۰۶۷

۲۰۲۲

Dated: 25/02/2022

Declaration

I hereby declare that the Ph.D. thesis entitled **Wali Dakhni ki Adabi Khidmaat ka Tanqeedi Motaliah Critical Study of Wali Dakhni** submitted by me is the original research work. It has not been previously submitted for any other degree in this or any other University/ Institution to the best of my knowledge.
I further declare that no plagiarism has been committed in my work. If anything is found plagiarised in my Thesis, I will be solely responsible for the act.

k.zmalik
Khushter Zarreen Malik

Scanned with CamScanner

जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
भारतीय भाषा केन्द्र
Centre of Indian Languages
भाषा, साहित्य एवं संस्कृति अध्ययन संस्थान
School of Language, Literature & Culture Studies
नई दिल्ली–110067, भारत NEW DELHI-110067, INDIA

Dated: 25/02/2022

Certificate

This is to certify that the Ms. Khushter Zarreen Malik a bona-fide Research Scholar of Centre of Indian Languages, SLL&CS has fulfilled all the requirements as per the University Ordinance for the submission of Ph.D. thesis entitled 'Wali Dakhni ki Adabi Khidmaat ka Tanqeedi Motaliah' Critical Study of Wali Dakhni This may be placed before the examiners for evaluation for the award of the degree of Ph.D.

24/2/2022m
Prof. Moinuddin A. Jinabade
(Supervisor)
CIL/SLL&CS/JNU

Dr. MOINUDDIN A. JINABADE
Professor
Centre for Indian Languages
School of Languages
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067

Prof.Omprakash Singh
(Chairperson)
CIL/SLL&CS/JNU

अध्यक्ष / Chairperson
भारतीय भाषा केन्द्र / CIL
भा. सा. एवं सं. अ. सं. / SLL & CS
ज. ने. वि. / J.N.U
नई दिल्ली / New Delhi-110067

GRAM: JAYENU, Tel.: (91-011) 26741557, 26742676 Extn.: 4217, (D) 26704217; Telefax: (91-011) 26704217;
Email: chair_cl@mail.jnu.ac.in, jnucil@gmail.com

Scanned with CamScanner

نانا مرحوم

مولانا عبدالجلیل ندوی

کے نام

فہرست

عناوین	صفحہ نمبر
پیش گفتار	۳
باب اول: ولی کے سوانحی کوائف(گجرات ، ولی اورنگ آباد)	۷
باب دوم :اردو فارسی تذکروں میں ذکر ولی	۴۲
باب سوم :ادبی تاریخوں (اردو انگریزی) میں ذکر ولی	۸۷
باب چہارم: غزلیات ولی کافنی مطالعہ	۱۴۰
باب پنجم : ولی اور ہندی ادبیات	۲۰۰
حاصل کلام	۲۲۸
کتابیات	۲۳۶

پیش گفتار

اردو شاعری کی روایت میں ولی کو ایک ایسے نقطۂ اتصال کی حیثیت حاصل ہے جو شمال و جنوب کے شعری منطقوں کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔ ولی ہمارے شعری منہج،لسانی آہنگ اور شعریاتی برتاؤ کو ایک ایسا سیال اور رواں اسلوب فراہم کرتا ہے جس سے شمال و جنوب کے امتیاز معدوم ہونے لگتے ہیں اور ایک نئی شعری فضا جنم لیتی ہے۔اس زاویے سے دیکھیں تو ولی دکنی اردو شعر و ادب کی روایت کا فیصلہ کن موڑ ہیں۔ ان کا ظہور بحیثیت تخلیقی نابغہ کے ایک ایسے عہد میں ہوتا ہے جہاں ہند ایرانی ادبی روایتیں باہم مدغم ہوتی ہیں۔ اس ادغام سے ایک نئی، اور ممتاز روایت اپنا رنگ پیدا کر لیتی ہے۔ ولی سے بہت پہلے ہی فارسی دفتری زبان تھی، اس کے علاوہ فارسی شعر و ادب سے شغف اور اس میں طباعی کو باعث افتخار سمجھا جاتا تھا،اس لیے فارسی شعریات طبقۂ اشراف میں نفوذ کر گئی تھی۔ سبک ہندی اور فارسی شعریات کے امتزاجی رنگ وآہنگ دکنی شاعری میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ ولی سے قبل دکنی ادب کی ایک توانا روایت موجود تھی، جس میں غزل،مثنوی، قصیدہ وغیرہ کی مختلف اصناف میں وافر اور لائق قدر ادبی سرمایہ تیار ہو چکا تھا۔ اس ناحیہ سے دیکھاجائے تو ولی مقامی زبان میں اولین شعری تجربے یا خلاقانہ اظہار کے شاعر نہیں۔ ان سے پہلے کئی شاعروں نے ادبی شاہکار پیش کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ولی کے عہد اورادبی و تہذیبی زندگی کو امن اور سیاسی استحکام کازمانہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کے زمانے میں اورنگ زیب نے دکن میں استحکام حاصل کر لیا تھا۔ عہد اورنگ زیب میں اردو زبان کے لئے جو سب سے اہم واقعہ ہوا،وہ یہ کہ دکن و شمال کے لسانی اور تہذیبی رابطے میں تیزی پیدا ہو گئی ۔ وہ رابطہ جو تغلق کے زمانہ سے چلا آتا تھا،اسے اورنگ زیب نے ایک سلطنت کے تابع کر کے

دونوں علاقوں کی ثقافتی سمتوں کو قریب تر کردیا۔اس تبدیلی کے اثرات لسانی ارتقاء اور ادبی پیش رفت پر بھی پڑے،اور اورنگ آباد کے مرکز سے ولی سانابغہ شاعر اردو کی شعری دنیا میں انقلاب لے آیا۔

ولی اردو شاعری کی سلیس، سہل، سبک اور معنی آفریں روایت کا نکتۂ آغاز ہیں۔فارسی اور سبک ہندی کی دو روایتوں کو ریختہ میں مدغم کرنے کا کام ولی نے بڑی باریکی سے انجام دیا۔دو لسانی ہم آہنگی،صوتی اور غنائی اشتراک کی جو صورتیں ولی نے پیدا کیں،اس سے شعر وادب میں ان کی مجتہدانہ شان قائم ہوئی۔ معنیاتی،شعریاتی اور غنائی ہم آہنگی کا وصف ولی کا اختصاص قرار پایا۔زبان کو مانجھنے، نتھارنے کا کام بھی ولی نے کیا۔اس طرح ولی شعری اظہار اور لسانی تجربے کے منطقے میں استاد قرار پائے۔اردو کے شعری آہنگ اور شعریاتی طریقۂ کار کو نئی سمت دینے میں ولی کا کردار خشت اول کا رہا ہے۔

ولی کی شاعری نے اردو کی ادبی روایت میں کئی سطحوں پر اپنی منفرد شناخت بنائی۔سادہ گوئی،ایہام گوئی کی تخلیقی روشیں کسی نہ کسی صورت ولی سے جلاپاتی ہیں۔ریختہ گویوں کی اولین نسل بڑی حد تک ولی کی رہین منت ہے۔ میر، سودا، قائم جیسے شعرا ولی کے اثر سے آزاد قرار نہیں دیے جاسکتے۔ولی کے کلام میں اسلوب اور زبان وبیان کی ارتقائی صورت یہ سوال قائم کرنے پر آمادہ کرتی ہے کہ کیا ان کے بغیر میر، سودا، اور قائم بحیثیت شاعر ممکن تھے۔ان شاعروں کے تخلیقی تجربے ولی کے رہین منت ہیں۔ہند فارسی روایت کو ہم آہنگ کیا،لسانی تعامل کے ذریعے اسلوب کو ترقی دی، معنی آفرینی کی نئی صورتوں کو سامنے لائے۔ اس طرح اردو غزل کو ایک ایسا معیار عطا کیا جو فارسی جیسی ترقی یافتہ اور توانا روایت کے ہم پلہ قرار پائی۔ولی کی اسی وضع کردہ روایت کی پیروی بعد کے شمالی ہند کے شعرا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس مقالے میں ولی کے تخلیقی اجتہاد کو روشنی میں لانے کے ساتھ ساتھ ولی کے متعلق مختلف فیہ امور کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ولی کا شاہ گلشن سے اکتساب،ولی کی دہلی آمد،اور دہلوی زبان سے ولی کی اثر پذیری کو اس مقالہ میں خاص اہمیت دی گئی ہے اور اپنے تحقیقی کار کو ان امور کے وضوح پر زیادہ مرتکز رکھا گیا ہے۔

اپنی اس تحقیق کی تبویب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلا باب ولی کی سوانح وادبی کوائف پر مبنی ہے۔اس باب میں ولی کے سنہ پیدائش،اور ولی کے نام،وطنیت،ان کے معاصرین و احباب کے متعلق مباحث کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان کے مختلف ناموں کے سلسلے میں جو تحقیقات پیش کیں گئی ہیں،ان میں کون سا نام حقیقت سے سب سے زیادہ قریب ہے،ان کے وطن اور

احباب و معاصرین کے بارے میں محققین کی آراء اور ولی سے متعلق دیگر پہلوؤں کے بارے میں محققین نے جو تحقیقات پیش کی ہیں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں ہم نے ولی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ وطنی نسبت کے سلسلے گجرات ،اور نگ آباد و دکن کی مختلف نسبتوں کے پیچھے کار موجود وجوہات تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ولی کے دبستانی نسبت کا درست اندازہ بھی اس باب میں پیش نظر رہا ہے۔

دوسرا باب "اردو اور فارسی تذکروں میں ذکر ولی" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ہم نے ولی کے متعلق تذکرہ نگاروں کی آراء کو جاننے کی سعی تو کی ہی ہے اس کے ساتھ ایک تذکرہ کا دوسرے تذکرہ سے اخذ و اکتساب نے ولی کے متعلق اختلافی امور میں کیا کردار ادا کیا ہے،اسے بھی جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ تذکروں میں دستیاب مواد کس حد تک ولی کے متعلق درست اطلاعات فراہم کرتے ہیں اور کہاں کہاں ان کی فراہم کردہ معلومات ولی کے سلسلے میں گمراہیوں کا سبب بنی ہیں۔ اس پہلو کی نشاندھی بھی اس باب میں کی گئی ہے۔

تیسرا باب "اردو اور انگریزی تاریخوں میں ذکر ولی" کے نام سے ہے۔ تاریخوں میں تذکروں کی بنبست ولی کو زیادہ معروضی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ادبی تاریخوں کی تصنیف کے وقت تک تنقیدی مطالعے کی روش میں تبدیلی آچکی تھی۔ شعر وادب کو جانچنے کا نیا پیمانہ وضع ہو چکا تھا۔ ادبی تاریخوں میں ولی تنقید کے تاریخی بیانیہ میں ایسے پہلوؤں کو نشان زد کیا گیا ہے جو ولی کے باب میں تذکروں کے بالمقابل نیا سیاق اور تناظر عطا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اس تحقیق پر بھی نظر رہی ہے کہ ان تاریخوں میں ولی پر ہوئی تحقیقات اور بہم ہوئے نئے تحقیقی نشانات سے کتنی روشنی لی گئی ہے۔

مقالے کا پانچواں باب "ولی کی غزلیات کا فنی مطالعہ" ہے۔ اس باب میں ہم نے ولی کی شاعرانہ خصوصیات،ان کے شعری کمال اور غزلیہ شعری روایت کے بنیاد گزار کی حیثیت سے ولی کا مطالعہ کیا ہے۔ اردو غزل کی کلاسیکی شعریات کو وضع کرنے میں ولی کا کتنا دخل ہے،فارسی غزل سے ولی نے کس قدر اکتساب کیا ہے اور دکنی روایت سے ولی کی شاعری کتنی فیض یافتہ ہے،ان تمام نکات کو اس باب میں بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ولی کے شعری آہنگ اور ان کے عروضی نظام پر کلام کیا گیا ہے۔ ولی کی غزلیات کے اوزان اور ان کی بحروں کی کیفیت کو بھی اس باب میں درج کیا گیا ہے۔

مقالے کا پانچواں باب "ولی اور ہندی ادبیات" ہے۔ دکنی ادب کا سرمایہ عرصۂ دراز سے ہندی اور اردو کے مابین ادبی وراثت اور ملکیت کے اعتبار سے مختلف فیہ رہا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ و تحقیق میں اس سرمایے کی علاقائی شناخت اور نشانیات کے مد نظر اسے دکنی اردو کے نام سے موسوم کیا گیا اور اسی پس منظر میں اس کی درجہ بندی اور لسانی وادبی معنویت کو نشان زد کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ ہندی کے محققین، ادبی مؤرخین اور ناقدین اس سرمایہ کو دکنی ہندی کا نام دیتے ہیں اور ہندی کا سرمایہ باور کراتے ہیں۔ ولی کی شاعری اور ان کے فن کو بھی ہندی کے ادبی مؤرخین اور ناقدین نے اپنا محور گفتگو بنا یا ہے اور ان کی ادبی حیثیت کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ اس باب میں ہندی کی ادبی تاریخ و تنقید میں ولی اور ان کے فن پر موجود تنقیدی سرمائے کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس موضوع کا انتخاب استاد محترم معین الدین جینا بڑے کے مشورے سے کیا گیا۔ کلاسیکی شاعری میں میری دلچسپی ہمیشہ سے رہی ہے۔ لیکن کلاسیک میں دلچسپی کے باوجود ولی جیسے شاعر پر کام کرنے کا حوصلہ کرنا نہایت مشکل تھا۔ استاد محترم کے مجھ پر اعتماد نے اس چوٹی کو سر کرنے کی ہمت عطا کی۔ میں استاد محترم کی مشکور ہوں کہ اس مقالہ کی تکمیل میں میری قدم قدم پر رہنمائی کی۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سینٹر آف ایڈین لینگویج کے چیر پرسن پروفیسر اوپی سنگھ کی بھی میں شکر گزار ہوں کہ ان کا تعاون بھی مجھے حاصل رہا۔ دیگر اساتذہ، محترم مظہر حسین مہدی، محترم خواجہ اکرام الدین، محترم انوار عالم پاشا کی بھی میں شکر گزار ہوں کہ ان اساتذہ کی حوصلہ افزائی میرے شامل حال رہیں۔ محترم آصف زہری صاحب کی بھی شکر گزار ہوں کہ گاہے ماہے مقالے کے متعلق استفسار اور مواد کی نشاندھی کرتے رہے۔ امی، بابا کا شکریہ کہ ان کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔

خوشتر زریں ملک

ہندستانی زبانوں کا مرکز

اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

باب اول

ولی کے سوانحی کوائف

گجرات۔۔۔ولی۔۔۔اورنگ آباد

ولی کا سنہ پیدائش:

ولی کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ بھی ان کے نام کی طرح انتشارِ آراء کا شکار ہے۔ تذکروں میں ولی کے سنہ پیدائش کے بارے میں ہمیں ٹھوس معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ البتہ عبد الجبار ملکاپوری نے اپنے تذکرے ''محبوب الزمن: شعرائے دکن کے تذکرے'' میں ولی کی سال پیدائش تخمیناً اواخر ۱۰۷۹ھ لکھی ہے۔ عبد الجبار ملکاپوری کی تحریر کچھ یوں ہے: ''محمد شمس الدین نام ۔خاندان مشائخ قادریہ سے تھا۔ اس کی تخمیناً ولادت ۱۰۷۹ھ ہجری کے آخر شہر اورنگ آباد دکن میں ہوئی۔''(۱)

عبد الجبار ملکاپوری اس اندازہ کی کوئی دلیل و سند فراہم نہیں کرتے ہیں۔ اور نہ ہی اپنے قیاس کی کوئی وجہ ہی تحریر کرتے ہیں ۔اس اندازہ کی کوئی عقلی و نقلی دلیل کی عدم دستیابی کے باوجود اس روایت کو دیگر محققین بھی روایت کرتے نظر آتے ہیں۔ شیخ چاند نے بھی ولی کی سنہ ولادت ۱۰۷۹ھ رقم کی ہے۔ حتی کہ شیخ چاند نے تخمیناً کا لاحقہ بھی نہیں لگایا ہے۔ اور نہ ہی ''محبوب الزمن'' تذکرہ کا حوالہ دیا ہے۔ اور دیگر کسی اور مآخذ کا حوالہ نہیں لکھا ہے۔ لکھتے ہیں : ''ولی تخلص، محمد ولی نام بابائے ریختہ لقب ۱۰۷۹ھ کے قریب ان کی ولادت ہوئی۔ وطن اورنگ آباد ہے۔'' (۲)

اغلب ہے کہ شیخ چاند نے ولی کے سنہ ولادت کی یہ تاریخ تذکرہ محبوب الزمن سے لی ہو، اس کی دو وجہیں سامنے نظر آتی ہیں؛ ایک تو اس تذکرے سے پہلے کہیں ولی کے سنہ پیدائش کا ذکر نہیں ملتا دوسری یہ کہ شیخ چاند نے مذکورہ تذکرے کے حوالے اس مضمون میں دوسرے مقامات پر نقل کیے ہیں؛ اس لیے شیخ چاند کے درج سنہ ولادت کا ماخذ عبد الجبار ملکاپوری کا تذکرہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

کلیات ولی مرتبہ احسن مارہروی میں ولی کے سوانحی کوائف کو مندرج کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''قرین قیاس تحقیقات یہ ہے کہ ولی کی ولادت بمقام اورنگ آباد سنہ ۱۰۷۹ ہجری میں واقع ہوئی ''(۳) احسن مارہروی نے بھی یہ تاریخ ولادت عبد الجبار ملکاپوری کے بیان کردہ تاریخ ولادت سے ہی مستعار لیا ہے

آغا مرزا بیگ نے بھی اسی تاریخ کو ولی کی سنہ ولادت کے طور پر قبول کیا ہے۔ آغا مرزا بیگ نے اپنی کتاب "ولی اورنگ آبادی" جلد اول میں بطور دلیل ایک قطعہ پیش کیا ہے اور اس سے ولی کے سنہ ولادت کا استخراج کیا ہے۔ قطعہ ہے:

شاہ عالمگیر خجستہ بنیادی بود
عاقلاں در شہر فراوانی بود
ہاتف غیب گفت ولادت ولی
صاحب سخن خجستہ بنیادی بود (۴)

اولاً یہ قطعہ وزن میں نہیں ہے۔ دوئم فن تاریخ گوئی پر پورا نہیں اترتا۔ مادہ تاریخ قطعہ کا آخری مصرعہ ہوا کرتا ہے۔ اور صاحب سخن خجستہ بنیادی سے ۱۰۷۹ھ بر آمد نہیں ہوتے۔ آغا مرزا بیگ کی تحریر ہے:

، ، لفظ خجستہ کے ۱۰۶۸ بر آمد ہوتے ہیں اور بود کے ۱۲۷ بر آمد ہوتے ہیں۔ اگر ایک کم کر دیا جائے تو ولی کی تاریخ پیدائش ۱۰۷۹ھ بر آمد ہوتی ہے نہ صرف تاریخ پیدائش بر آمد ہوتی ہے بلکہ اس کا وطن اور اس کی پیدائش سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ وہ "صاحب سخن" خجستہ بنیادی تھا۔" (۵)

آئینۂ معنی نما کے مصنف اسلم مرزا نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ آغا مرزا بیگ نے اعداد کی تخفیف و اضافہ کا سبب کچھ نہ لکھا جب کہ فن تاریخ گوئی میں مادہ کے توسط بر آمد اعداد میں تخفیف واضافہ کا قرینہ بھی قطعہ میں موجود ہوا کرتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ قطعہ کس کا ہے، کہاں سے نقل کیا ہے، اس کے بارے میں بھی آغا مرزا بیگ خاموش ہیں۔

ظہیر الدین مدنی نے بھی ولی کا سنہ پیدائش ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۴۹ء سے قبل لکھا ہے۔ ملفوظ کبیری جو کہ سید عبد الملک کی تصنیف ہے، اور جنھیں ظہیر الدین مدنی نے ولی کا ہم جد لکھا ہے، اس کے حوالہ سے ظہیر الدین مدنی نے ولی کے والد شریف محمد کی چار اولادوں کا ذکر کیا ہے، اور شریف محمد کو ۱۰۷۲ھ میں متوفی بتایا ہے۔ اس دلیل کی تقویت کے لئے سید نجیب اشرف ندوی کو حاصل شدہ تمسک نامہ ۱۱۰۷ھ کو بھی پیش کرتے ہیں، جس میں ولی نام کے شخص اور ان کے دو بیٹوں کا بطور گواہ نام پایا جاتا ہے۔ شریف محمد کے سنۂ وفات کے سبب ظہیر الدین مدنی ولی کے سنہ ولادت کا قیاس ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۴۹ء (۶) سے قبل لگایا ہے۔ سیدہ جعفر ظہیر الدین مدنی کے ان دلائل کو رقم کرتے ہوئے عبد الجبار ملکاپوری کی قیاس کی گئی تاریخ کو رد کرتی ہیں

۔ لکھتی ہیں کہ شریف محمد کی وفات ۱۰۷۹ھ ۱۶۶۱ء ہے اس حساب سے ولی کا سنہ پیدائش اس سے قبل ہونا چاہیئے ،اور ظہیر الدین مدنی کے قیاس کا اعادہ کرتی ہیں۔

محمد صادق نے ولی کا سنہ پیدائش ۱۶۶۷ء درج کیا ہے۔(۷) محمد صادق نے ولی کے سنہ پیدائش پر کلام کرتے ہوئے براہ راست ظہیر الدین مدنی کی رائے کی تردید نہیں کی ہے ،البتہ یہ ضرور لکھتے ہیں کہ ولی نام کے شخص سے متعلق دستاویزات و تمسک نامے کی دستیابی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ وہی شاعر ولی ہیں۔ یعنی محمد صادق کو ظہیر الدین مدنی کے دلائل کو قبول کرنے میں تردد ہے۔ محمد صادق نے ۱۶۶۷ء تاریخ ولادت کے تعین کی کوئی سند یا حوالہ درج نہیں کیا ہے۔ ۱۶۶۷ء عبد الجبار ملکاپوری کی رقم کردہ سنہ ۱۰۷۹ھ کا عیسوی سنہ ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے بھی ولی کی سنہ پیدائش ۱۶۶۵ء/۱۶۶۷ء رقم کی ہے۔ لکھتے ہیں : ”ولی کی پیدائش غالباً ۱۶۶۵ء/۱۶۶۷ء کی ہے۔“(۸)

ولی کی سال ولادت کے بارے میں یقینی دعوی نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورہ ولادت کی تاریخیں قیاسی ہیں۔ ولی کے سال ولادت کے متعلق کسی تذکرہ یا کسی تاریخ یا بیاض میں کوئی بیان نہیں پایا جاتا۔ مذکورہ تاریخوں کی درستگی اور عدم درستگی موہوم ہے۔

ولی کا نام:

ولی کے نام کے سلسلے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ انہیں ولی محمد لکھتے ہیں تو کچھ محمد ولی۔ کچھ تذکروں میں ولی کا اسم شمس ولی اللہ لکھا گیا تو کچھ میں شاہ ولی اللہ ،ولی،ولی اللہ، شمس الدین اور حاجی ولی نام بھی ولی کے ترجمے میں تذکروں میں درج ملتا ہے۔

گلشن گفتار میں ولی محمد درج ملتا ہے۔ مخزن نکات ،تذکرہ شعرائے اردو میر حسن، گلشن سخن ،تذکرۂ عشقی، گلشن ہند ،طبقات شعرائے ہند ، سخن شعرا، گلزار ابراہیم وغیرہ میں شاہ ولی اللہ لکھا گیا ہے۔ تذکرہ ریختہ گویاں ،تذکرہ چمنستان شعرا، مجموعۂ نغز ،تذکرہ مسرت افزا، مخزن الشعرا وغیرہ میں محمد ولی مرقوم ہے۔ طبقات الشعرا، تذکرۂ شورش، عمدۂ منتخبہ، گلشن بے خار، نکات الشعرا میں محض ”ولی “ لکھا گیا ہے۔ گلستان بے خزاں میں حاجی ولی درج ملتا ہے۔ تذکرہ شعرائے دکن محبوب الزمن میں شمس الدین لکھا ہوا ہے۔ اور آب حیات میں محمد حسین آزاد نے شمس ولی اللہ نقل کیا ہے۔

تاریخوں میں مرقوم ولی کا نام تذکروں سے ماخوذ ہے۔ نصیر الدین ہاشمی اور جمیل جالبی سید ابو المعالی کے فرزند کے نقل کردہ دیوان میں موجود نام "ولی محمد" کو ولی کا اصل نام بتاتے ہیں۔ ظہیر الدین مدنی کی تحقیق کے مطابق ولی کا نام "محمد ولی اللہ" ہے ۔(۹) ظہیر الدین مدنی کے دلائل ہیں کہ سید منظور حسین علوی المعروف بہ حسینی پیر کے دریافت کردہ دستاویزات میں ولی کا نام "محمد ولی اللہ بن شریف محمد علوی" ہے۔ پروفیسر نجیب اشرف کے پاس موجود تمسک نامہ میں ولی نے بطور گواہ اپنا نام "محمد ولی اللہ بن شریف محمد علوی" لکھا ہے۔ ولی کے بیٹوں کے دستخط میں ان کے بیٹوں نے ولی کا نام "ولی اللہ علوی" لکھا ہے ۔ ملفوظ کبیری میں محمد شریف کی چار اولادوں کے ذکر میں ولی کا نام "میاں ولی اللہ" لکھا گیا ہے۔ شاہ وجیہ الدین علوی کے خانوادے کے شجرۂ نسب میں موجود ولی کا نام "شاہ ولی اللہ بن شریف محمد متوفی ۱۰۷۲ھ" پایا جاتا ہے۔ ظہیر الدین مدنی نے ولی اللہ نام سے قبل لگے سابقہ "شاہ" کی توجیہ یہ کی ہے کہ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کے خاندان کے اکثر افراد کے آگے شاہ لفظ لگایا جاتا ہے۔ یہ اصل نام کا حصہ نہیں ہے۔(۱۰)

احباب و معاصرین:

ولی کے احباب میں سب سے مشہور نام سید ابو المعالی کا ہے۔ ان کے متعلق زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہوئی ہیں۔ تذکروں میں مرقوم ہے کہ کہ ولی دہلی سید ابو المعالی کے ہمراہ آئے۔ سید ابو المعالی کا ذکر سب سے پہلے تذکرہ گلشن گفتار کے مؤلف حمید اورنگ آبادی نے کیا ہے۔ لکھتے ہیں "بجانب میاں سید معالی کہ از مشائخ زادہ ہائے گجرات بودند، میل تمام داشت"(۱۱) یعنی سید ابو المعالی گجرات کے تھے اور مشائخ زادوں میں سے تھے، جن سے ولی کو بڑی محبت تھی۔ قائم نے اپنے تذکرہ میں ان کا نام سید ابو المعالی لکھا ہے۔ ولی کی آمد ان کی ہمراہی میں درج کیا ہے "ہمراہ میر ابو المعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتہ او بود، بہ جہان آباد"۔(۱۲) قدرت اللہ قاسم نے سید ابو المعالی اور ولی کے تعلق کو محبت سے بڑھ کر عبودیت و معبودیت کا رشتہ بتایا ہے۔ اور یہ کہ ولی انھیں کے ہمراہ دہلی آئے۔ ابو المعالی کی ولی سے محبت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ہمہ وقت ولی کے سفر و حضر میں شکار بند کے ساتھ حاضر رہتے۔ ولی کے منع کرنے پر بھی باز نہ آتے۔(۱۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید ابو المعالی اور ولی کے درمیان خاص محبت اور انسیت تھی۔ اپنے کلام میں ولی نے سید ابو المعالی کا دو جگہ ذکر کیا ہے۔

سید معالی کے علاوہ جن دیگر لوگوں کا ذکر ولی کے کلام میں ملتا ہے، ان میں محمد یار خاں، گوبند لال، امرت لال، بیر لال، کھیم داس ، اکمل، کمال، شمس الدین وغیرہ ہیں۔

تذکرۃ الوجیہ کے مصنف سید حسینی پیر علوی نے سراج نامی شخص کا ذکر کیا ہے اور انھیں ولی کا خاندانی بھائی لکھا ہے۔ لکھتے ہیں :

"اگر گجرات سے تعلق نہ ہوتا تو اس خصوصیت سے احمد آبادی احباب کا ذکر کیوں کرتے یقیناان کے کلام میں دکنی احباب کا ذکر بھی ہوتا۔ ایک جگہ اپنے خاندانی بھائی سراج الدین کی شادی کا ذکر کرتے ہیں:

پروانہ ہو کے نہ گرے چرخ چاند سے

فانوس میں شوق ترا ہے سراج آج

وہ شوخ مجھ کو آ کے ملا اس سبب ولی شادی میں اس کی صرف کیا ہوں میں لاج آج"(۱۴)

مذکورہ بالا شعر کی صحیح صورت یوں ہے :

پروانہ ہو کے کیوں نہ گرے چاند چرخ سوں

فانوس دل میں شوق ترا ہے سراج آج

دوسرے شعر میں "وہ" کے بجائے "وو" ہے۔

اسی صفحہ کے حاشیہ میں مصنف موصوف نے بزرگ کا پورا نام سید سراج الدین اور تاریخ وفات ۱۱۱۹ھ لکھی ہے۔ اور ولی کا ہم عصر بتایا ہے۔ تاریخ وفات کی دلیل میں مولانا شاہ حامد بن علاء الدین بن شاہ سراج الدین علوی کی بیاض میں مرقوم قطعۂ تاریخ بھی درج کیا ہے۔ یعنی مصنف موصوف نے شعر میں لفظ سراج اور شادی کے سبب یہ استخراج کیا کہ یہ ولی کے خاندانی بھائی ہیں جن کی شادی کا ذکر یہاں شعر میں ولی نے کیا ہے۔ اور جن کے فرزند سید شمس الدین کا بھی ذکر ولی نے اپنے کلام میں کیا ہے ۔ ممکن ہے کہ ولی کی کسی سراج نامی شخص سے خاندانی نسبت رہی ہو۔ لیکن ان اشعار کا سراج اور ان کی شادی سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ غزل کی کلاسیکی شعریات سے عدم واقفیت اسی قسم کے نتائج اپنے ساتھ لاتی ہے۔ ان اشعار پر تھوڑا سا بھی غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں سراج بمعنی چراغ ہے۔ دل کو فانوس کہا ہے اور شوق کو سراج یعنی چراغ کہا ہے۔ ظاہر ہے چراغ روشن مراد ہے جس کے گرد پروانہ نثار ہوتے ہیں۔ پروانہ اور چراغ کا تعلق اردو غزل میں بہت مشہور ہے۔ اس طرح اس شعر کی نثر یوں ہوگی کہ (تو اس قدر حسین ہے کہ) چاند پروانہ ہو کے (محبوب کے شوق میں) آسمان سے کیوں نہ گر پڑے اور میرے دل کے فانوس میں بھی ترا شوق چراغ کی طرح جل رہا ہے۔ اردو غزل میں شمع و پروانہ کو عاشق و معشوق تصور

کیا جاتا ہے ۔چاند کو اگر پروانہ کی صورت میں عاشق تصور کیا جائے اور متکلم جو یہ کہہ رہا ہے کہ اس کے دل کے فانوس میں محبوب کے شوق میں سراج یعنی چراغ روشن ہے تو یہاں دو عاشق جمع ہو جاتے ہیں ۔واضح رہے کہ دل کے داغوں کو آفتاب اور سورج سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے ۔اس صورت میں سراج کا لفظ اور با معنی ہو جاتا ہے کہ اس کے ایک معنی سورج کے بھی ہیں ۔چاند اور سورج کی مناسبتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں ۔چاند کی مناسبت سے سورج کے معنی پیدا کرنے سے شعر کے فنی حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ سراج کے ایک معنی جگنو کے بھی ہیں ۔اور جگنو کی دو خصوصیتیں ہیں ۔روشنی اور جلنے بجھنے کی کیفیت ۔یہاں سراج سے جگنو مراد لیں تو دل کے روشن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے رکنے اور چلنے کو یعنی دھڑکن کی کیفیت کا بھی بیان ہو جاتا ہے ۔اس صورت میں فانوس دل اور بھی با معنی ہو جاتا ہے کہ جگنو کی روشنی اس کے جسم کے اوپری پردے سے منعکس ہو کر ہی باہر آتی ہے ۔اس طرح ولی ایک حرکی امیجری خلق کرتے ہیں ۔اس شعر کا ایک پہلو اور دیکھیں کہ معشوق کے لئے چاند کو استعارہ کیا جاتا ہے ،اور اسے چاند کہہ کر اس کے حسن کی افزونی کا بیان کیا جاتا ہے ،یا چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے ۔یہاں چاند کو خود معشوق کا عاشق کہہ کر اس کے حسن کو لا محدود کر دیا ہے ۔ کیوں نہ گرے کے فقرہ میں ایک معنویت یہ بھی ہے کہ محبوب اس قدر حسین ہے کہ اس کے حسن کا تقاضا ہے کہ چاند اس کی دید کے اشتیاق میں یا اس کے حسن کے سحر میں گرفتار ہو کر اس پر نثار ہو جائے ۔

سراج کے لفظ کی وضاحت کے بعد دوسرے شعر کی تشریح کی ضرورت تو باقی نہیں رہ جاتی ۔ لیکن لفظ شادی کی وضاحت ضروری ہے تا کہ کوئی مغالطہ نہ رہ جائے ۔اس شعر میں معشوق کے آنے کی خوشی کا مضمون باندھا گیا ہے ۔ شعر میں موجود جس لفظ "شادی " سے بیاہ شادی کی تقریب مراد لی گئی ہے اس سے یہاں خوشی مراد ہے ۔ شوخ یعنی معشوق کے آنے اور آکر ملنے کی خوشی میں ادب و لحاظ سے دستبردار ہو گئے اور خوشی میں کیا کیا کر گئے ۔ لاج کے معنی شرم و حیا کے بھی ہیں اور لحاظ و ادب کے بھی ۔

اشعار کی ان تفصیلات کے بعد سید پیر حسینی علوی کے استنباط و استخراج کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ ذاتی پسند کے معنی کے حصول میں موصوف نے بالکل سامنے کی باتوں کو نظر انداز کر دیا ۔اکمل اور کامل کا ولی نے اپنے کلام میں ذکر کیا ہے لیکن اس سے ان کے احمد آبادی ہونے کا کہیں اندازہ نہیں ہوتا ۔ سید حسینی پیر علوی نے انھیں حقیقی بھائی اور شاہ وجیہ الدین کی اولادوں میں سے لکھا ہے ۔

ولی کے معاصرین میں آزاد،داؤد اور فراقی کا نام لیا جاتا ہے۔ میر حسن نے آزاد کا پورا نام فقیر اللہ اور آزاد تخلص لکھا ہے۔صاحب تذکرہ عشقی انھیں فقر اللہ لکھتے ہیں۔ تذکرہ شورش میں ان کا نام محمد فاضل آزاد دکھنی لکھا ملتا ہے۔ میر نے ان کے بارے میں لکھا ہے "آزاد تخلص،ہم عصر ولی بود۔ بسیار بصفا حرف می زد۔(۱۵) ۔ تذکرہ طبقات شعرائے ہند اور مخزن نکات میں بھی آزاد کا ذکر ملتا ہے۔ قائم نے نکات الشعرا میں آزاد کو متوطن حیدرآباد بتایا ہے۔یہ یتیم تھے اور نوجوانی میں کسی پر عاشق ہو گئے۔اور درد بدر پھرتے تھے۔ فراقی کے ساتھ دہلی کا سفر کیا۔ ولی نے ان کے مصرعہ پر مصرعہ لگایا ہے جس کا ذکر اکثر تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ولی کے دیوان میں بھی وہ شعر درج ملتا ہے۔

فراقی کا پورا نام سید محمد اور فراقی تخلص ہے ۱۶۸۵ء۔۱۷۳۱ء۔ولی کے ہم عصر ہیں۔انھوں نے دہلی کا سفر کیا۔اور ایک مثنوی مراۃ الحشر تصنیف کی۔ فراقی کا ذکر ولی نے اپنے شعر میں دو جگہ کیا ہے۔

ترے اشعار ایسے نئیں فراقی

کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں

دوسری جگہ فراقی کے مصرعہ پر مصرعہ لگایا ہے:

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم

کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

معتبر خاں ،عمر تخلص تذکرہ ریختہ گویاں کے مصنف نے انھیں ولی دکنی کا تربیت کردہ لکھا ہے ۔اور منصب دار تھے (۱۶)گارساں دتاسی نے بھی علی ابراہیم کے تذکرہ کے حوالے سے ولی کے شاگرد معز خاں، تخلص عمر کا ذکر کیا ہے۔اور کسی عہدہ پر ممتاز بھی بتایا ہے۔(۱۷) گراہم بیلی نے بھی معتبر خاں عمر نامی شخص کو ولی کا شاگرد لکھا ہے۔ گراہم بیلی کا کہنا ہے کہ یہ مرثیہ گو تھے اور ان کا ایک مرثیہ ایڈن برگ یونیورسٹی لائبریری میں موجود مخطوطہ میں ملتا ہے۔(۱۸)

احمد گجراتی کو قائم نے ولی کا معاصر لکھا ہے۔یہ ہندی طرز کے گیت و دوہرہ لکھتے تھے۔ سنسکرت اور بھاکا میں ید طولی رکھتے تھے ۔کبھی کبھی ریختہ میں بھی شاعری کرتے تھے۔(۱۹)

وطن:

ولی کے وطن کے سلسلے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ محققین کا ایک گروہ انہیں اورنگ آبادی ثابت کرتا ہے۔ دوسرا گروہ انہیں گجراتی الاصل بتاتا ہے۔ کچھ دیگر محققین نے متوطن گجرات و اورنگ آباد کی بابت دریافت شواہد میں تطبیق کی کوششیں کی ہیں۔

یہاں ہم ولی کے وطن کی بابت محققین کے دعاوی و دلائل کو پیش کریں گے اور زیادہ قرین قیاس بات تک پہنچنے کی سعی کریں گے۔ ۱۹۲۰ء میں ابراہیم سایانی نے ولی کا دیوان مرتب کیا۔ مقدمہ میں ولی کے وطن کے متعلق مباحث کو زیر بحث لائے۔ حکیم قدرت اللہ خاں اور میر کے اقوال ولی کے وطن کے متعلق درج کیے۔ اول الذکر ولی کو احمد آبادی اور شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کے خانوادے کا فرد لکھتا ہے اور آخر الذکر ولی کی وطنی نسبت اورنگ آباد سے بتاتا ہے۔ ابراہیم سایانی آخر الذکر یعنی میر کے قول کا تتبع کرتے ہیں اور دلیل میں ولی کا یہ شعر درج کرتے ہیں:

ولی ایران و توران میں ہے مشہور

وطن گو اس کا گجرات و دکن ہے

یہ شعر دیوان ولی مرتبہ نورالحسن ہاشمی میں یوں درج ملتا ہے۔

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

ص۔۲۸۶

ابراہیم سایانی کا نقل کردہ شعر وزن میں نہیں ہے۔ شعر کا وزن ہے۔ مفاعیلن مفاعیلن فعولان/فعولن

ابراہیم سایانی میر کے بیان کو لائق ترجیح سمجھنے کی یہ دلیل لاتے ہیں کہ ولی کے کلام میں گجراتی الفاظ کے بجائے دکنی الفاظ و محاورے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً گجراتی زبان میں 'منے' اور 'سوں' کا استعمال 'مجھے' اور 'کیا' کے معنی میں لئے جاتے ہیں۔ جبکہ ولی کے یہاں 'میں' اور 'سے' کے معنی میں مستعمل پایا جاتا ہے۔ ان لفظوں کے علاوہ مرتب نے کچھ دیگر الفاظ کا حوالہ بھی دیا ہے جو بقول مرتب بجائے گجراتی کے دکنی ہیں۔ ابراہیم سایانی نے میر اور قائم کے اشعار "قائم میں غزل طور کیا" اور

معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن سے تھا " کو کوٹ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ شعرا نے ولی کو بطور دکنی شاعر کے ہی یاد کیا ہے ۔شعر کا درست مصرعہ یوں ہے "معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا"۔

احسن مارہروی نے کلیات ولی ۱۹۲۷ء میں ترتیب دیا۔اس کے مقدمہ میں موصوف نے ولی کو متوطن اورنگ آباد ہونے پر شد و مد سے اصرار کیا ہے۔احسن مارہروی کا بیان ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے تمام تذکرہ نگاروں نے ولی کو اورنگ آبادی ہی لکھا ہے۔جن تذکرہ نویسوں نے ولی کو احمد آباد سے منسوب کیا ہے انہیں مرتب موصوف متاخرین کا نام دیتے ہیں۔مثلا حمید اورنگ آبادی،قائم،میر حسن وغیرہم کو احسن مارہروی نے متاخرین کے ذیل میں رکھا کہ انھوں نے ولی کو احمد آبادی ہی لکھا ہے۔مرتب موصوف نے ان تذکرہ نویسوں کو متاخرین کے ذیل میں کس سبب رکھا ہے،واضح نہیں کیا ہے۔احسن مارہروی لکھتے ہیں : "ایسی صورت میں متاخرین کا بغیر کسی کافی ثبوت کے احمد آبادی یا گجراتی لکھ دینا نا قابل تسلیم ہے ۔"(۲۰)

حمید اورنگ آبادی اور قائم کے بیانات سے کلیتہ صرف نظر کرنا احسن مارہروی کی ذاتی ترجیح کو ظاہر کرتا ہے۔ولی کی احمد آبادی نسبت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"قیاساً کہاجاسکتاہے کہ صوبۂ گجرات میں طالب علمی کے سوا کسی سلسلۂ معاش و ملازمت نے زیادہ تر یا تمام عمر قیام رکھنے پر مجبور کیا ہو،اور اس طرح وہ احمد آبادی مشہور ہو گئے ہوں۔" (۲۱)

ولی کو احمد آبادی تصور کرنے کی بابت احسن مارہروی لکھتے ہیں کہ جس طرح دتاسی کو شہر سورت پر نظم اور شہر بنگالہ کے شعر میں ذکر نے مغالطہ میں ڈال دیا کہ ولی سورت کے تھے اور شہر بنگالہ میں قیام کیا تھا،اسی طرح شعر میں گجرات مذکور ہونے سے یہ قیاس لگانا کہ وہ گجراتی یا احمد آبادی تھے درست نہیں۔ولی کے دکنی ہونے کے ثبوت میں احسن مارہروی نے دکنی الفاظ کا حوالہ بھی دیا ہے۔اور یہ شعر نقل کرتے ہوئے ان کے دکنی ہونے پر شد و مد سے اصرار کیا ہے۔

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

اور یہ شعر کہ

ولی پروانگی کرتا تری ملک دکن بھیتر

احسن مارہروی لکھتے ہیں کہ ”بغیر کسی تاویل و تامل کے ولی کا دکنی ہونا ان کے معتمد اشعار سے ثابت ہوتا ہے۔“ (۲۲)

سید محی الدین قادری زور کا ایک مضمون ”ولی کا وطن“ کے نام سے ”الموسی“ میگزین سٹی کالج حیدرآباد میں ۱۹۳۷ کو شائع ہوا۔ محی الدین قادری زور نے اس مضمون میں ولی کے اورنگ آبادی ہونے پر زور دیا ہے۔ اور ان کے گجراتی ہونے کو رد کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ولی گجرات بغرض سیر گئے اور آخر وقت میں احمد آباد میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ مخزن الشعرا کے مصنف کا ولی کو احمد آبادی لکھنا اور اس پر ان کی دلیل کی ولی اپنی نسبت دکن سے اس سبب کرتے ہیں کہ اس عہد میں شمال سے متمائز کرنے کے لئے اس پورے علاقہ کو دکھن کہا جاتا تھا، قاضی نور الدین فائق کے اس بیان کو رد کرتے ہوئے محی الدین قادری زور نے لکھا ہے کہ شمالی ہند سے متمائز کرنے کے لئے اس پورے علاقہ کو دکھن شمالی ہند کے لوگ کہتے تھے نہ کہ احمد آباد و گجرات کا متوطن۔ اس کے ثبوت میں محی الدین قادری زور نے گجراتی شعرا کا وہ کلام پیش کیا ہے جس میں انھون نے دکھنی شعرا کو یاد کیا ہے اور نھیں دکھنی سے منسوب بھی کیا ہے۔ مثلا:

ہزار حیف نہیں شاعران دکن
سو روحی و مرزا و قادر نہیں
ہاشم علی عجب نہیں یہ مرثیہ سن کر
تجھ پر خلیفہ قادر تحسیں کرے دکن میں
گجرات میں پڑے جب یو مرثیہ کو یاراں
سنکر چلے ہیں روتے دکھنی دکھن کو یاراں (۲۳)

گجرات کے مرثیہ گو رضا کا کلام بھی بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ جو یہاں طوالت کی غرض سے نہیں لکھا گیا ہے۔

ولی کے ان اشعار کو جن میں دکھنی نسبت ثابت ہوتی ہے محی الدین قادری زور اسے دلیل بناتے ہیں اور فرزند ابو المعالی کے اس جملہ کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں جس میں ولی کو متوطن اورنگ آباد لکھا گیا ہے۔ ”تصنیف مغفرت پناہ میاں ولی محمد متوطن دکھن“۔ محی الدین قادری زور نے ولی کے قیام گجرات اور سیاحت گجرات کے متعلق جو تاویلیں پیش کی ہیں اور بطور سند جن اشعار کا حوالہ دیا ہے وہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ غزلیہ اشعار سے کسی شاعر کی تصوراتی اور مفروضہ جاتی سوانح خلق کرنا تحقیقی

طریقۂ کار نہیں ہے۔ البتہ ذاتی میلانات اس قسم کے ناقص دلائل کی وجہ ضرور ہو سکتے ہیں۔ محی الدین قادری زور مثنوی اور غزل کے اشعار میں گجرات کے ذکر کئے جانے کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ ولی کی آزاد رو، خوش باش انسان تھے، سیر و سیاحت وغیرہ سے ولی طبیعی نسبت تھی، اورنگ آباد جو مرہٹوں کے سبب تباہ حال بھی تھا، اس وجہ سے وہاں ٹھہر نہ سکے اور گجرات کے حسن دلفریب پر فریفتہ ہو گئے۔

> ''اس افتاد طبع نے ان کو عنفوان شباب ہی میں اورنگ آباد سے باہر نکلنے پر مجبور کیا۔ اور جب وہ ایک مرتبہ مرہٹوں کے اس ستم دیدہ شہر یعنی شہنشاہ اورنگ زیب کے تباہ حال پایہ تخت سے باہر نکلے تو گجرات کے حسن دلفریب، اور خاص کر احمد آباد اور سورت کی رنگا رنگیوں نے ایسا فریفتہ کیا کہ اورنگ آباد کے فوجی دیار سے برداشتہ خاطر ہو گئے۔ اور ختم تعلیم کے بعد جب وطن واپس ہوئے تو ایک عرصہ تک اس شہر کی ہولناک جنگجویانہ فضا میں سیماب پا رہنے کے بعد پھر باہر نکلے اور اس طرح نکلے کہ سیر و سیاحت میں تمام عمر گزار دی۔ لیکن محض اس آزادہ روی اور سیر و سیاحت کی بنا پر کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ وہ دکنی الاصل یا اورنگ آبادی نہیں تھے۔''(۲۴)

اس مفروضہ جاتی دلیل کے علاوہ محی الدین قادری زور نے ولی کے کچھ اشعار کی تطبیق اس کہانی سے کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ مثلاً ولی کا شعر ہے :

جونیہ کے کوچہ میں ہے اس کوں وطن سے کیا غرض

اس مصرعہ کو کوٹ کر کے لکھتے ہیں کہ اس قدر سیر و سیاحت کے سبب جب ان سے ان کے وطن کے متعلق پوچھا جاتا تو اس کے جواب میں وہ صاف صاف کہہ دیتے۔

محی الدین قادری زور نے گجرات کے فراق میں لکھے گئے قطعہ میں مشمول اس شعر

اس سیر کے نشہ سوں اول تر دماغ تھا
آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل

کو پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ولی نے خود کہا ہے کہ وہ گجرات بغرض سیر و سیاحت آئے۔ اس کے علاوہ ولی نے دکنی شعرا کو اپنے کلام میں یاد کیا ہے۔ اگر وہ گجراتی ہوتے تو گجرات کے ماقبل گزرے ہوئے شعرا بہاؤ الدین باجن، خوب محمد، شاہ علی

گام دھنی اور امین وغیرہ کا ذکر ضرور کرتے ۔ جبکہ دکنی شعرا ملا خیالی، حسن شوقی، فراقی، آزاد، رنگین اور اشرف وغیرہ کا ذکر ولی اپنے کلام کرتے ہیں۔

اختر جونا گڑھی نے ولی کے اورنگ آبادی ہونے کی تردید شدت سے کی اور ۱۹۴۵ء رسالہ مصنف میں "ولی گجراتی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اور ولی کو گجراتی الاصل ثابت کرنے کی شد و مد سے کوشش کی۔ ان کا یہ مضمون دراصل محی الدین قادری زور کے استدلالات کا جواب ہی ہے۔ اختر جونا گڑھی ولی کو اورنگ آبادی ثابت کرنے کو "دکنی پروپیگنڈہ" کا نام دیتے ہیں۔ اور وہ تذکرہ نگار جنھوں نے ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ولی کی وفات کے ۴۰۔۵۰ سال بعد جب کہ ان کے وطن کے متعلق اس قدر اختلاف پایا جاتا رہا ہے کسی تذکرہ نگار کا ان کو اورنگ آبادی لکھنا کیسے سند ہو سکتا ہے۔ محی الدین قادری زور نے متوطن اورنگ آباد کے باب میں جتنی شہادتیں پیش کی ہیں اختر جونا گڑھی انھیں جزوی خیال کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ ولی کے سوانحی کوائف، نام، حسب نسب اور سنہ وفات وغیرہ گجرات سے دریافت ہوئے ہیں اگر وہ اورنگ آبادی تھے تو اورنگ آباد میں ان کے سوانحی حالات کے متعلق کچھ کیوں نہ دریافت ہو سکا۔

ولی نے خود کو دکھن سے کیوں منسوب کیا ہے اس کی توجیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

> "یہاں ملک دکن سے وہ خاص خطہ مراد نہیں ہے جو گجرات سے الگ نربدا کے جنوب میں واقع ہے۔ بلکہ عام طور پر دکن کا اطلاق گجرات پر بھی ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ ولی نے خود کو اور دوسروں نے ان کو ملک دکن سے کیوں منسوب کیا اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ شمالی ہندوستان سے گجرات جنوب یا دکن کی سمت میں پڑتا ہے ،اس لئے اس کو دکن کہا گیا۔"(۲۵)

قاضی اختر جونا گڑھی کے دلائل یا تو تذکرہ نویسوں کے رقم کردہ بیانات ہیں جس میں دکھن کہنے میں گجرات کا قرینہ موجود ہے ۔یا پھر تاریخ میں مرقوم تحریر ہے۔ مثلاً مرآۃ احمدی میں مذکور شیخ کمال مالوی کا قول نقل کیا ہے: "بر لوح محفوظ نظر کنید کہ ملک گجرات از حیطۂ بادشاہان دکن بر آمدہ و بنام سلطان محمود خلجی ثبت گشتہ"

یہاں شاہان دکن سے مراد شاہان گجرات مراد لیا ہے۔ اس طرح یہ دلیل بنائی ہے کہ گجرات کو دکن کہہ دیا جاتا تھا۔ اسی قسم کی اور دلیلیں بھی قاضی اختر جونا گڑھی نے پیش کی ہیں جس میں دکن کہہ کر گجرات کو شامل کیا گیا ہے۔

اختر جونا گڑھی فرزند ابو المعالی کے نقل کردہ دیوان میں متوطن دکن والی روایت کو رد کرتے ہیں اور اسے معرض شک میں لاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اول ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ سید ابو المعالی کے فرزند ہی ہیں،دوئم ہو سکتا ہے انھوں نے جس نسخہ سے دیوان نقل کیا ہو وہیں سے متوطن دکن کا جملہ بھی نقل کر لیا ہو،اوراس نسخہ کے کاتب کے علم میں وطن کی صحیح معلومات نہ ہوں۔

ان تمام بیانات و دلائل کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ولی کی وطنی نسبت کا مسئلہ علاقائی سیاست و رسہ کشی کا شکار ہو گیا ہے ۔اہل گجرات اور اہل دکن کی بھرپور کوشش رہی ہے کہ ولی کو اپنے اپنے علاقوں سے منسوب کریں۔اہل گجرات نے ولی کے سنہ وفات کی دریافت اور سوانحی حالات کے سلسلے میں کچھ معلومات کو بنیاد بنا کر انھیں متوطن گجرات ثابت کرنا چاہا ہے اور اہل دکن نے انھیں ولی کے کلام میں موجود دکنی نسبت اور فرزند ابو المعالی کے جملہ کے سبب انھیں دکنی اور اورنگ آبادی ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ان میں تطبیق کرنے کی کچھ دیگر محققین نے کوشش کی ہے۔ محمد صادق نے ظہیر الدین مدنی کے ان دلائل کے جواب میں جن میں ولی کا نام و نسب دریافت ہونے کے سبب اور ان کے گجراتی تعلق کے امکان کے سبب انھیں گجراتی الاصل کہا گیا،لکھا کہ اگر ہم یہ بات مان بھی لیں کہ یہ وہی شاعر ولی ہیں، پھر بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ولی گجراتی الاصل ہیں۔ آگے محمد صادق نے قیاس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ ولی کی پیدائش گجرات کی ہو اور ان کی تعلیم خانقاہ علوی سے متصل درسگاہ میں ہوئی ہو۔ لیکن بعد میں وہ مع اپنے خاندان کے اورنگ آباد دکن منتقل ہو گئے ہوں۔ولی کا خود کو دکھنی لکھنے کا اور کیا سبب ہو سکتا ہے۔ محمد صادق لکھتے ہیں کہ یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ ان حالات میں ایک گجراتی خود کو دکنی لکھے لیکن یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں کہ ایک شاعر گجرات کا متوطن ہو، گجراتی میں شاعری کرے اور خود کو دکنی کا شاعر کہے۔

دبستان اورنگ آباد:

دبستان اورنگ آباد کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے اورنگ آباد کی تشکیل، تعمیر وارتقا پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ جس طرح زبان کی شناخت اس کے جغرافیائی محل وقوع سے علاقہ رکھتی ہے،اسی طرح جغرافیائی محل وقوع کسی مخصوص زبان و کلچر کا

نمائندہ بننے اور دبستان کی شکل اختیار کرنے کے اسباب بھی رکھتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے کسی دبستان کو نشان زد کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم دبستان کے اہلیتی عوامل کا جائزہ لیں۔ اگر کوئی ایک قصبہ مختصر مدت میں دبستان کی شکل اختیار کرتا ہے تو اجتماعی تبدیلیاں ناگزیر ہوں گی۔ ان تبدیلیوں میں مقتدرہ کا عمل دخل بھی کسی نہ کسی حد تک ہوگا۔ کسی مقام کو لسانی تہذیب وسماج میں مبدل کرنے والی صورت حال سے صرف نظر کرنا اپنی راہ کھوٹی کرنے کے مترادف ہے۔ دکن میں لسانی تشکیل کے بارے میں ہمارا عام معلومہ یہی ہے کہ یہ سلسلہ تغلق کے عہد سے شروع ہوا اور دیوگری کی فتح کے بعد شمالی ہند کے باشندوں کی اس علاقے میں سکونت نے زبان کی نئی شکل پیدا کی، جو فی الاصل شمالی ہند سے اٹھ کر جانے والی زبان تھی۔ اس بیانیے سے بادی النظر میں یہی تاثر ملتا ہے کہ زبان کی یہ پود شمالی ہند سے لے جا کر دکن میں لگائی گئی۔ اس مقام پر بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زبان کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جا کر کیا کسی پود کی طرح لگانا اور اس کی نشو نما کرنا ممکن ہے؟ جب تک کہ اس کی زمینی بنیادیں وہاں موجود نہ ہوں؟ بہر کیف عام معلومہ یہی پیش کیا گیا کہ شمالی ہند سے ہی اٹھ کر زبان جنوبی ہند پہنچی۔ بعض مؤرخین نے زبان کی منتقلی کے اس عمل کو مسلمان افواج کے ساتھ مختص کیا ہے۔ یہ پہلو تحقیق طلب ہے کہ انتقال آبادی کا کل مجمع کیا مسلمانوں پر مشتمل تھا یا پھر فوج میں شامل تمام طبقات کے لوگ اس کا حصہ تھے۔ یہ دوسرا امکان زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ نوآبادیاتی تصور علم و تاریخ کے جبر کی وجہ سے انتقال لسان کے اس عمل کو مسلم افواج سے متعلق کرنے اور ورناکولر زبان کو جنوبی ہند تک لے جانے کا نقطۂ نظر رام بابو سکسینہ نے بھی پیش کیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے قطع نظر بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا زبان پود کی طرح لگائی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر فضا ماحول اور لسانی اشتراک کا ساز گار مظہر میسر نہ آئے تو ایسا ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ زبانیں اپنے لانے والے نواردوں کے ساتھ فنا ہو جاتی ہیں، باقی نہیں بچتیں۔ پارسی اور انگریزی اس کی روشن مثالیں ہیں کہ پارسی اپنی زبان کو زندہ زبان کی طرح جاری نہ رکھ سکے اسی طرح انگریزی مختصر ثروت مند طبقے کی زبان ہونے کے باوجود ملک گیر عوامی زبان بننے کا رتبہ نہ حاصل کر سکی، یہ الگ بات ہے کہ کچھ اور اسباب کے سبب وہ دفتری زبان کے طور رائج ہے۔ کوئی بھی لسانی مظہر جو اپنی جائے پیدائش سے اٹھ کر کسی اور سرزمین پر برگ وبار لائے، لسانی نقطۂ نگاہ سے تعجب خیز ضرور ہے اور زبان کے طالب علم کو الجھن میں ضرور مبتلا رکھتا ہے کہ وہ اس مقام و ماحول میں نشو و نما پانی والے زبان کی بنیادیں تلاش کرے۔ رام بابو سکسینہ اس صورت حال پر اپنے تعجب کا اظہار کرتے ہیں اور اس

لسانی مظہر کی تشفی بخش تعبیر موجود نہ ہونے پر سوال قائم کرتے ہیں کہ اس سمت میں ابھی کوئی مناسب پیش رفت نہیں ہوئی۔ یہ سوال بیک وقت زبان کی تاریخ کے ساتھ لسانیات سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> The Muhammadan armies carried vernacular to the South before it was standardized and it then contained many idioms which are now excluded from literary prose. The contact with the surrounding dialects, Marathi, Tamil, and Telegu affected the idiom and construction to a certain extent……
>
> It is interesting to trace the reasons which led to the phenomenal rise of Urdu poetry in the Deccan. It would have been natural to expect that Urdu poetry would start its career in its home-Delhi. Instead, we find the centre of poetic activities in the Deccan so remotely situated from its cradle. What is the reason of this? No attempt has yet been made to answer this all important, question and to explain this phenomenon a reference to the history of that period of the Deccan would be necessary.(۲۶)

مسعود حسین خاں لسانی تشکیل کے حوالے سے ایک معتبر نام کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ بھی اسی لسانی بیانیے سے اتفاق کرتے ہیں کہ دہلی کی کھڑی بولی مسلمان لشکر اور صوفیا کے توسط سے اطراف ہندستان میں پھیل رہی تھی۔ چودھویں صدی عیسویں تک یہ نرگن بھکتوں کے تصرف میں آکر دکن سے پورب تک پھیل گئی تھی۔ اس نکتے پر کم توجہ دی گئی ہے کہ مسعود حسین خاں بھی دہلی کی کھڑی بولی پر اصرار کرتے ہیں۔ یعنی شمال کی زبان جنوب کی طرف نہیں گئی بلکہ دہلی کی کھڑی بولی گئی۔ وہ چودھویں صدی کے مراٹھی شاعر نام دیو نامی شاعر کا حوالہ بھی دیتے ہیں کہ اس نے مراٹھی چھوڑ کر کھڑی بولی میں شاعری کی۔(۲۷) جمیل جالبی محمد تغلق کے دہلی سے دیوگری انتقال سلطنت و پایۂ تخت کو اہم عامل کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ (۲۸) اس لسانی بیانیے کے وجوہ کیا ہیں؟ کیا زبان ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچ کر اپنی زمین خود تیار کرنے پر مجبور تھی یا پھر ایسے اجتماعی حالات تہذیبی تعامل کی سطح پر ناگزیر ہو چکے تھے جو ملک گیر زبان کی تشکیل کو ملک گیر پیمانے پر لازم کرتے تھے۔ زبان لسانی ارتقا کی منزلیں مختلف علاقوں میں بیک وقت قطع کر رہی تھی۔؟ آخر الذکر خیال کو تسلیم کرنے میں کوئی مانع نہیں ہوگا اگر ہم سلطنت کی منتقلی کے واقعے سے پہلے جنوبی ہند میں کھڑی بولی کے نقوش حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ اس طرز فکر کی اہم وجہ مسعود حسین خاں کی شہادت میں ہی تلاش کی جاسکتی ہے، ان کا ماننا یہ ہے کہ نرگن وادی بھکتوں نے رابطے کی زبان کے طور پر ملک کے طول و عرض میں کھڑی بولی کو رواج دیا یا پھر وہ اس کا سبب بنے۔ اب اگر نرگن وادی بھکت ملک گیر سطح پر چودھویں صدی سے پہلے موجود ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کے رابطے کی کوئی زبان ہوگی اور کھڑی بولی کا ہونا

زیادہ قرین قیاس ہے۔ یہ محض ایک مفروضہ یا قیاس نہیں ہے بلکہ اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ پروفیسر معین الدین جینابڑے نے اس سمت میں ایک نئی تحقیق سے اہل اردو کو روشناس کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق چودھویں صدی عیسوی سے پہلے یعنی تیرھویں صدی عیسویں میں بھی کھڑی بولی کے نمونے ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ شری چکر دھر سوامی (م ۱۲۷۴) کے مہانو بھاؤ پنتھی سدھوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انھوں نے شری چکر دھر سوامی کی زندگی ہی میں ایسے پدوں کی تخلیق کی تھی جو کھڑی بولی کا ٹھاٹھ رکھتے ہیں۔ ان پر برج اور اودھی کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ معین الدین جینا بڑے نے بطور شہادت مہادائی ساکے پد نقل کیے ہیں:

نگر دوار ہو، بچھا کرو ہو، باپورے موری اوستھالو
جیہان جابو، تیہان آپ بسا، کوؤنا کرے موری چنتا ہو
ہاٹ چوہاٹ پڑ رہوں۔ مانگ پنچ گھر بچھا
باپوڑ لوک موری اوستھالو، کوؤنہ کرے موری چنتا

ان پدوں کے تقریباً ستر پچھتر برسوں بعد نام دیو نے یہ پد رچے ہیں:

مائی نہ ہوتی، باپ نہ ہوتے، کرم نہ ہوتے کایا
ہم نہیں ہوتے، تم نہ ہوتے کون کہاں تے آیا
چند نہ ہوتا، سور نہ ہوتا، پانی پون ملایا
شاستر نہ ہوتا، وید نہ ہوتا، کرم کہاں تے آیا(۲۹)

معین الدین جینابڑے کی اس تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنوبی ہند میں کھڑی بولی کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں اور وہ اپنے پیچھے مضبوط و مستحکم اجتماعی عوامل رکھتی تھیں، اس لیے جنوب میں لسانی ارتقا کو شمال یا دہلی کا ممنون احسان قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ معین االدین جینابڑے شری چکر دھر سوامی کے مہانو بھاؤ پنتھ کے ساتھ سگن و نراکار بھکت سمپردایوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس سلسلے کے اثرات ملک گیر تھے۔ افغانستان سے لے کر دکن اور شمالی ہند تک یہ سلسلے دراز تھے اور سیاسی تغیرات سے بے نیاز مسلکی وحدت میں لوگوں کو پرونے اور ملک گیر رابطے کی اہلیت رکھنے والی زبان میں شاعری کر رہے تھے۔ (۳۰)اس نئی معلومات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انتقال سلطنت کے ساتھ انتقال زبان کا لسانی بیانیہ اپنی ٹھوس

بنیادیں نہیں رکھتا،اس لیے ہمیں لسانی تشکیل کے ایسے بیانیے تک رسائی حاصل کرنا چاہیے جو مرکز جو (اردوئے معلیٰ یا دہلی) تصور لسان کے ساتھ ساتھ ایسے تصور لسان کے لیے گنجائشیں نکالے جو زبان (اردو) کے تمام اشکال کے لیے، معقول حد تک قابل قبول ہو سکے۔

اردوئے معلیٰ اور دہلی سے نفسیاتی طور پر شدید وابستگی رکھنے والے بیانیے کی حقیقت جان لینے کے بعد ہمیں اپنی اس بحث کو آگے بڑھانا زیادہ آسان ہے۔ یہاں چند نکات کا اعادہ کر لینامناسب ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کھڑی بولی مسلمانوں یا ہندستانی فوج و سلطنت کے دیو گیری منتقل ہونے سے پہلے وہاں موجود تھی اور مذہبی اجارہ ادری کے خلاف ایک خاموش احتجاج کے طور پر ترسیل کے کاموں میں لائی جارہی تھی۔ دیو گیری سے دولت آباد اور دولت آباد سے اورنگ آباد کے طویل سفر میں زبان کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ زبان کی بنیادیں اس علاقے میں پہلے سے موجود تھیں، انتقال آبادی نے اسے مزید زمین فراہم کی اور علاقائی زبانوں کے مقابلے میں اسے برتنے والے مزید لوگ اسے میسر آگئے، اس لیے جو زبان زمین میں پہلے سے اپنی جڑیں رکھتی تھی، وہ ایک دم تیزی سے آگے کو چل پڑی۔ ان پنتھوں کی شاعری اور ادب کو ایک مخصوص طبقے اور متوسلین کی ایک جماعت تک ہی رسائی رہی ہوگی، سلطنت کا یہ تغیر تصوف اور بھکتی کے لئے ساز گار ہوا ہو گا اور اس طرح نرگن اور سگن و نراکاری شاعری کو پروان چڑھانے والے لسانی معاشرے کو ایک قوت بھی ضرور حاصل ہوئی ہوگی جس نے مذہبی اجارے کے خلاف انھیں مستحکم ہونے کا حوصلہ دیا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس میں انتقال آبادی کا بھی اثر رہا ہو گا۔ اب ہم بڑی حد تک رام بابو سکسینہ کے قائم کردہ سوال کا جواب پانے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ دکنی کا لسانی مظہر کیسے تشکیل پایا اور اسے ایک نئی زمین میں اس قدر سرعت اور تیزی سے مقبولیت اور استحکام کیوں نصیب ہوا۔ یہ نیا لسانی بیانیہ کئی طرح کے دوسرے مسائل بھی حل کرتا ہے۔ یہ نئے ہندستان کے تمام علاقوں کو لسانی سطح پر مرکز جو (اردوئے معلیٰ یا دہلی) ہونے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ لسانی ارتقا کے مراحل کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف علاقوں اس زبان (کھڑی بولی) میں معیاری شاعری کے امکان کو ثابت اور متحقق کرتا ہے۔

ولی کی شخصیت ایسی ہے کہ اسے کئی دبستان اپنے خانے میں شامل کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس کشمکش میں علاقائی عصبیتوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ولی دکن، گجرات اور اہل دہلی کے مابین تختۂ مشق بنتا ہے۔ اہل دہلی کے پاس ولی پر دعویٰ کرنے معتد بہ دلائل نہیں ہیں، اس لیے وہ اسے دہلی کا فیض یافتہ باور کرا کے اپنی تسلی کر لیتے ہیں۔ دکن کی علاقائی نہیں بلکہ ملکی بنیاد

اسے اپنے حلقے میں شامل رکھنے پر آمادہ رکھتی ہے اور ولی شمال و جنوب کو دکن اور ہندستان کی ثنویت میں دیکھتا ہے اور خود کو دکنی یا ملک دکن کا شاعر بلاتا ہے، اس لیے بھی اسے دکنی ثابت کرنے والے بطور دلیل اس کی اس نسبت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے ولی کس دبستان کی نمائندگی کرتا ہے، آیا وہ دکن بنام دہلی کا نمائندہ یا گجرات کی وطنی نسبت اسے دکن اور اورنگ آباد دونوں سے آزاد کرتی ہے یا پھر وہ اورنگ آباد کی نمائندگی کرتا ہے اور اسے بطور دبستان قائم کرتا ہے۔ مسئلہ ولی کی وطنی نسبت کا نہیں، اس کی دبستانی نسبت کا ہے۔ ولی اپنی نسبت دکن کی طرف کرتا ہے تو کیا دکنی سرمایۂ ادب کی لسانی ترکیب اس کے کلام سے میل کھاتی ہے یا پھر دونوں کا تقابل اسے لسانی ارتقا کے زمرے میں لاتا ہے اور اسے ایک مستقل لہجے اور شناخت کا شاعر بناتا ہے۔ یہی بات گجرات کی نسبت بھی کہی جاسکتی ہے۔ اگر بطور دبستان سخنوران گجرات ولی کو گجرات میں شامل کرنے پر آمادہ ہوں۔ ادبی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اردو زبان کا اسم لسان علاقائی بنیادوں پر تبدیل ہوتا رہا ہے، اسی طرح اردو کا مرکز ثقل بھی لسانی ارتقا کے مختلف مراحل میں ایک خطے سے دوسرے خطے کی طرف منتقل ہوتا رہا ہے۔ گجری کو ادبی وسیلۂ تخلیق کے طور پر فوقیت حاصل ہے۔ دکنی کے شاعروں نے بھی اپنی زبان کو گجری کہہ کے بلایا ہے۔ ظہیر الدین مدنی لکھتے ہیں:

> گجری کا حلقۂ اثر دکنی تک پھیلا ہوا تھا۔ دکن میں دکنی بولی کی حیثیت سے موجود تھی۔ مگر ادب میں یہ گول کنڈہ میں روشناس کرائی جاتی ہے لہذا دکن میں ادبی تقاضے گجری ہی پوری کرتی رہی۔ پندرہویں صدی کے شاعر نظامی اور میرانجی کے ہاں گجری روایات ملتی ہے۔ نظامی پندرہویں صدی کے نصف اول اور میرانجی نصف آخر کے شاعر ہیں۔ یہ لوگ اپنی زبان کو ہندی کہتے ہیں۔ لیکن نام ہندی سے گجری ہی مراد لی جاتی ہے۔ مرأت احمدی کا مصنف باجن کام دھنی وغیرہ کی زبان کو ہندی کہتا ہے حالانکہ خود وہ لوگ اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں۔ (۳۱)

ظیر الدین مدنی کے اس بیان سے ہمیں دکنی اور گجری کے مابین رشتے کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہندی کے ساتھ گجری کا اسم لسان گجرات کے ساتھ بیدر کے شاعر فخر دین نظامی بیدری بھی استعمال کرتا ہے۔ بیدر سے اورنگ آباد کی مسافت اور زبان کے ارتقائی سفر کو سامنے رکھا جائے تو اسلوبیاتی اختلاف اور اتفاق دونوں کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ جنوبی ہند میں اس زبان کو قبولیت کیوں حاصل ہوئی، اس کے اسباب پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ جنوب کے سرحدی علاقوں میں ہند آریائی زبانیں موجود تھیں اور دکن کی تشکیل جنوب و شمال کے درمیان بین لسانی و تہذیبی اتصال کے اہم واقعے کے طور پر بھی دیکھی جاسکتی

ہے کہ دکن صرف دراوڑ زبانوں تک محدود نہ تھا بلکہ یہاں ہند آریائی اور دراوڑی دونوں ہی زبانیں روبہ عمل تھیں۔ علاء الدین کی فتح کے بعد جنوب میں موجود ہند آریائی زبان کو رفتار ملی اور اس نے جلد ہی ایک ادبی زبان کے منصب پر خود کو فائز کرنے میں کامیابی پائی۔ اس کامیابی گجری کے کردار سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ دکن اور گجرات کے تعلق کی نوعیت بھی قرابت قریبہ کی ہو گئی۔

۱۲۹۶ء میں علائی فتح کے بعد تو ہزاروں کی تعداد میں فارسی ترکی بولنے والے دکن پہنچ گئے۔ دکن جانے والوں کے لیے دکن میں زبان کا مسئلہ بہت ٹیڑھا تھا۔ دکن کی غیر آریائی زبانیں سیکھ لینا مشکل تھا۔ دوسرے کوئی مشترک زبان اظہار خیال کا ذریعہ موجود نہ تھا۔ لہذا قدرتیطور پر دہلی کی مخلوط بولی کو اظہار خیال کرنے کا ذریعہ بننے کا موقعہ مل گیا۔ اس میں گجری کا بھی ضرور حصہ ہو گا کیوں کہ گجرات دکن میں گھر آنگن کا تعلق تھا۔(۳۲)

اب یہ بات ضرور توجہ طلب ہے کہ علاقائی زبان کا سیکھنا یہاں کے لوگوں کے لیے بہت مشکل کام تھا۔ آریائی زبان کو وہاں پروان چڑھانا زیادہ آسان تھا۔ دو زبانوں کے مابین کسی نہ کسی طرح کا تعلق تو ضرور پیدا ہوا ہو گا جس کی وجہ سے وہ اس لائق بن سکی کہ ترسیل کے مقامی تقاضے کو مکمل کر سکی باوجودیکہ وہاں ایک مستقل خاندان کی زبان پہلے سے موجود تھی۔ ظہیر الدین مدنی یہ کہتے ہیں کہ دہلی کی مخلوط بولی کو اظہار خیال کا موقعہ مل گیا۔ مناسب بات یہی ہے کہ وہ بولی کہتے ہیں۔ ورنہ ادبی نمونوں کو پیش نظر رکھا جائے تو کھڑی بولی کا ارتقا کسی ایک مقام کا تابع نہیں تھا۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اس کے نمونے تیرہویں صدی سے ہی دکن کے علاقے میں پائے جانے لگے تھے۔ بعد کے سولہویں صدی کے نصف آخر کی سیاسی صورت حال نے گجرات کے اہل علم کو بیجاپور کا رخ کرنے کے اسباب پیدا کیے۔ اس طرح دکنی اور گجری کی لسانی قرابت کے مزید امکانات مہیا ہو گئے جو بعد میں زبان وادب میں ظہور پذیر ہوئے۔ ظہیر الدین مدنی لکھتے ہیں:

> ۱۵۷۲ء میں اکبری فوجوں نے گجرات کو روند ڈالا اور ایک نیا نظام حکومت قائم ہو گیا۔ اس افراتفری میں بعض علماء اور ادباء صوفیا نے بھی بیجاپور کا رخ کیا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۰تا ۱۶۲۷علوم وفنون کا بڑا قدردان تھا۔ اس کے دور میں تحائف بھیج کر علماء اور شعراء کو بیجاپور آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ گجرات کے مہاجرین کی وجہ سے گجری کا حلقۂ اثر بڑھتا گیا۔(۳۳)

ظہیر الدین مدنی نے دکنی کی تشکیل میں گجری کے کردار کو جس طرح ثابت کیا ہے، اس سے اس بات کا ثبوت بہر صورت ملتا ہے کہ دکنی شاعری میں کسی شاعر کے یہاں دکنی کے ساتھ ساتھ گجری کے لسانی عناصر کی نشان دہی اس شاعر کی دبستانی نسبت کو مشکوک بنانے کا باعث نہیں بن سکتا۔ ظہیر الدین مدنی مزید لکھتے ہیں :

> ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور سے ادبی گجری پر فارسی اور دکنی لفظوں، محاوروں اور لہجے وغیرہ کا اثر پڑنے لگا۔ دوسری طرف دہلوی بولی سے بھی دکنی متاثر ضرور ہو گئی اس طرح ایک نیا مقامی روپ وجود میں آ گیا اس کو دکنی نام دیا گیا۔(۳۴)

اس پوری تفصیل کا مقصد ولی کی دبستانی حیثیت کو متعین کرنے میں ہونے والی بے اعتدالیوں کا تدارک ہے۔ اس سلسلے کی اولین بے اعتدالی اہل دہلی کی طرف سے سامنے آئی کہ انھوں نے ولی کے سارے شعری کمال کو شاہ گلشن کے مشورے کا مرہون منت باور کرایا۔ ولی کی قبر اور شاہ وجیہہ الدین سے ان کی نسلی نسبت، شاہ صاحب کے مدرسے میں ولی کی تعلیم، یہ مختلف پہلو ہیں جن کی وجہ سے اختر جونا گڑھی، ظہیر الدین مدنی اور دوسرے لوگوں نے ولی کو گجراتی باور کرانے میں اپنی ساری توانائی خرچ کی۔ ان دونوں محققین کے دلائل بھی تذکروں، کلام ولی کے مختلف نسخوں یا مخطوطات میں درج باتیں ہیں جو ولی کے بارے میں یک سطری اور دو سطری ملتی ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے دکن کے توسیعی اطلاق کو ثابت کیا ہے یعنی ولی دکنی کہنے کا مطلب اسے ہندستان سے متمائز کرنا ہے، نہ کہ انھیں دکن کا باشندہ قرار دینا۔ گجرات کا خطہ دکن میں شامل رہا ہے۔ اسی عموم کے پیش نظر ولی کو دکنی کہا گیا۔ یہ استدلال قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی اور سید ظہیر الدین مدنی دونوں کے درمیان مشترک ہے۔ جونا گڑھی کا اعتراض ولی کو صرف دکنی بلانے پر نہیں ہے بلکہ اسے اورنگ آبادی قرار دینے پر بھی ہے۔ ولی کو دکنی کہنا جونا گڑھی کے نزدیک ایک نوع کا پروپیگنڈہ ہے اور یہ ہو بھی سکتا ہے لیکن ان کا ولی کے اورنگ آبادی ہونے پر معترض ہونا قرین انصاف معلوم ہونے کے بجائے گجرات سے پابند کرنے کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ اور اس میں ولی کے ادبی قد و قامت کا بڑا دخل ہے۔ دکنی پروپیگنڈے کی جو وجہ وہ بیان کرتے ہیں، بہت ممکن ہے وہی وجہ ولی کو گجراتی ثابت کرنے کی ہو۔ جونا گڑھی لکھتے ہیں:

> دوسری طرف بعض دکنی مصنفین اور اہل قلم نے حب وطن کی بنا پر یا عصبیت کے جوش میں آ کر ولی کو دکنی ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ انھوں نے بعض تذکرہ نویسوں کے بیانات اور خود ولی کے بعض اشعار کو اپنی قیاس آرائیوں کا ماخذ بنا کر ولی کو دکنی بلکہ اورنگ آبادی بنا دیا، حالانکہ ان کے پاس کوئی ثبوت اس

بات کا موجود نہیں ہے جو قطعی اور یقینی ہو، صرف استقرائی اور قیاسی استدلال سے انھوں نے ولی کے متعلق دور از کار نظریے قائم کیے ہیں۔ (۳۵)

یہاں پر سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اگر دکن کے جغرافیائی حدود میں گجرات کا شمار ہونا ولی کو دکنی ثابت کرنے کی کفایت کرتا ہے تو کیا وہ ان کے اورنگ آبادی ہونے کی نفی کے لیے بھی کافی ہے یعنی کسی ایک امر کا اثبات باقی امکانات کی نفی ہے یا پھر بیک وقت کئی باتیں مختلف سیاقات اور نسبتوں کی وجہ سے درست ہو سکتی ہیں؟ جو ناگڑھی ولی کو دکنی کہنے کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ ولی اور دوسرے لوگ اسے ملک دکن سے اس لیے منسوب کرتے ہیں کیوں کہ گجرات ہندستان سے جنوب میں واقع ہے۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ مرہٹہ حکومت سے پہلے دہلی والے گجرات دکن میں شمار کرتے تھے۔ وہ عرب جغرافیہ نویسوں کی تقسیم ملک ہند، سندھ، ہند اور دکن کا ذکر کرتے ہیں۔ ہند کا رقبہ راوی سے برہم پتر تک، اور دونوں کے نیچے دکن ہے۔ مرآۃ احمدی، طبقات محمود شاہی کے حوالے درج کرتے ہوئے جو ناگڑھی نے گجرات کو دکن بلانے اور لکھنے کے رواج کو ثابت کیا ہے۔ (۳۶) ولی کی وطنی نسبت کے بارے میں ہماری تلاش قدم بہ قدم خلط مبحث کا شکار ہوتی جاتی ہے۔ ظہیر الدین مدنی کا طریقۂ استدلال جو ناگڑھی سے زیادہ مختلف نہیں ہے البتہ اس کا بیان اور طریقۂ استدلال زیادہ مربوط اور منضبط معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> قدماء نے لفظ دکن کا اطلاق جس حصۂ ملک پر کیا ہے وہ محض اورنگ آباد یا بیجاپور نہیں ہے بلکہ دریائے نربدا کے اس کنارے سے مع سلسلہ کوہ ست پڑا، راس کماری تک سرزمین اس میں شامل ہے۔ اس خطے میں گجرات اور خاندیش بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دکن کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن جب اس کے وسیع علاقے میں اس کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد گجرات اور برار کو چھوڑ کر باقی علاقہ ہوتا ہے۔ اس امر سے ہر شخص واقف ہوگا کہ بمبئی بلکہ پورے گجرات کاٹھیاواڑ، نیز دکن میں شمالی ہند کے تمام باشندے ''ہندستانی'' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں خواہ وہ دہلوی ہوں، بنارسی ہوں یا بہاری لیکن وہی لوگ شمالی ہند میں ہوتے ہیں تو دہلوی، بنارسی، بہاری وغیرہ کہلاتے ہیں۔ (۳۷)

اب یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ ولی اپنی ذات کو دکنی کیوں بلاتے یا خود کو دکنی کا شاعر کیوں کہتے تھے۔ بیرون کے لوگ انھیں دکنی بلائیں تو معقول معلوم ہوتا ہے لیکن ایک بعید نسبت کا استعمال ولی کیوں کرتے تھے کیا وہ دکنی کی پوری شعری روایت سے خود کو منسلک کر کے اس روایت میں خود کو نمایاں کرنا چاہتے تھے۔ یا پھر ہندستان میں کوئی اس نوع کی روایت موجود تھی اور وہ اپنے اس ادعا سے انھیں جتانا چاہتے تھے کہ دکن کا شعر خوب ہے۔ دوسری بات کا تو دور تک کوئی امکان نہیں ہاں پہلی بات کے صائب

ہونے کے امکانات بہر کیف موجود ہیں کہ وہ اپنے دائرۂ شعر کو ایک وسیع علاقے کا نمائندہ جانتے تھے۔ اور اس پورے علاقے میں ہی اس کی درست قدردانی ہو سکتی تھی، اس لیے انھوں نے دکنی کی نسبت پر زور دیا۔ یہ باتیں استقرائی ہی کہی جا سکتی ہیں انھیں جب تک دلائل نہ مل جائیں ایک حقیقت کے طور پر قبول کرنا مشکل ہے۔ اب جن اشعار پر اہل تحقیق ولی کے دکنی ہونے کی بنیاد رکھتے ہیں، ولی کی گجراتی نسبت پر اصرار کرنے والے اس نوع کے اشعار کی تعبیر اپنے حسب مطلب بتاتے ہیں۔ وہ اشعار جن میں ولی خود کو دکن کا نمائندہ قرار دیتا ہے وہاں دکن کو عموم کے معنی میں لیتے ہیں اور جہاں وہ گجرات کے فراق میں شعر کہتا ہے اسے گجرات سے باہر کی سیر و سیاحت کے دوران کہے گئے اشعار پر محمول کرتے ہیں۔ ہمیں ان اشعار پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہیے:

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل
بے تاب ہے سینہ نئیں آتش بہار دل
مرہن نہیں ہے اس کے زخم کا جہان میں
شمشیر سے ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل
اول سوں تھا ضعیف پر پابستہ سوز میں
جیوں بال ہے اُگن کے اپر بے قرار دل
اس سیر کے نشے سوں اول تر دماغ تھا
آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل
میرے سینے میں آئے چمن دیکھ عشق کا
ہے جوش خوں سوں تن میں میرے لالہ زار دل
حاصل کیا ہوں جگ میں سراپا شکستگی
دیکھا ہے مجھ شکیب سوں صبح بہار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز
عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل
لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں

پھر اس کے دیکھنے کا ہے امید وار دل

اس قطعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ولی کو گجرات سے خاص نسبت ہے اور شاہ وجیہ الدین گجراتی کے خاندان سے ولی کی نسلی نسبت سے متعلق دلائل کو مزید پختگی حاصل ہوتی ہے۔ اس قطعہ سے یہ نتیجہ اخذ کئے گئے کہ ولی گجرات بغرض سیاحت گئے تھے، سیر کے لفظ سے یہ امکان بھی ہو سکتا ہے کہ ولی گجرات سے دوسرے مقام کی سیاحت پر ہے۔ اس صورت میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سفر گجرات سے ہوا اور اس میں گجرات واپسی کا قصد ظاہر کیا گیا ہے۔ ولی کی تخلیقی شخصیت نے ریختہ میں جو انقلاب آفریں تغیرات پیدا کیے اور زبان و شاعری کے جن امکانات کو روشن کیا، ان امکانات کی وجہ سے وہ تمام ادبی دبستانوں کی توجہ کا مستحق ٹھہرا۔ اہل دہلی کے پاس ایسے دلائل نہ تھے کہ اسے وہ دہلوی شاعر کہتے تو انھوں نے شاہ سعد اللہ گلشن کا فیض یافتہ بنا دیا۔ بات میر کے می گویند سے شروع ہوئی اور قائم کی واقعہ سازی تک پہنچی یہاں تک ایک تذکرہ نگار نے اس روایت میں اردوئے معلیٰ کی زبان کا اضافہ بھی کر دیا، اس طرح اہل دہلی کی ترغیبات سامنے آئیں کہ ان کی خواہش تو اس بڑے شاعر کو اپنے دبستان میں شامل کرنے کی تھی لیکن بوجوہ ایسا وہ کرنے پر قادر نہ تھے تو شاہ گلشن سے ولی کی ارادت کا فائدہ اٹھایا اور یوں ان کی تخلیقیت میں دہلویت کو حصہ دار بنانے کی کوشش کی۔ ولی کی نسبت کی توجیہ، اورنگ آبادی ہونے کا انکار یہ بتاتا ہے کہ اس مقام پر بھی حلقہ بگیر کرنے کے داعیہ پوری طرح موجود ہیں۔ ورنہ فائق کے یہاں درج معلومات یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ ولی کو اورنگ آباد سے تعلق ہے۔ وہ ولی کا مولد و مدفن احمد آباد بتاتے ہیں۔ ہندستان اور دکن کے شاعروں میں وہ ولی کی اولیت اور فنی استادی کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتاتے ہیں کہ ولی کی وطنی نسبت میں اختلاف ہے بعضے انھیں گجراتی اور بعض دکنی کہتے ہیں۔ فائق کی زبانی روایت جسے وہ احمد آباد کے ثقہ لوگوں سے نقل کرتے ہیں کہ وہ اسی شہر کے تھے لیکن انھوں نے ایک طویل عرصہ دکن میں بھی گزارا ہے۔ فائق کا تذکرہ گجرات کا اور گجرات کے ثقہ کی طرف سے یہ اطلاع ملی ہے کہ ولی نے ایک طویل عرصہ دکن میں گزارا ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد گجرات کے حدود اربعہ سے باہر کا وہ علاقہ ہوگا جسے اہل گجرات دکن سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہاں ولی کی دکن میں مدت اقامت کا تعین نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس بات کی کوئی صراحت ہے کہ دکن میں ولی کی اقامت کس سلسلے میں ہے اور وہ عرصہ ان کی شخصیت کے تشکیلی دور سے تعلق رکھتا ہے یا پھر کوئی اور زمانہ ہے۔ حمید اورنگ آبادی ولی کی وطنی نسبت احمد آباد بتاتے ہیں اور شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے ولی کی نسبت بھی متحقق ہو چکی ہے، اسی

طرح ان کے مولد اور جائے وفات کے بارے میں جس مقام کی طرف اشارے اور تصریحات ملتی ہیں وہ احمد آباد ہے۔ ان قرائن سے یہ نتیجہ نکالنا ممکن ہے کہ ولی کی دکن میں اقامت کا زمانہ نہ آخر عمر کا ہو سکتا ہے اور نہ ہی اوائل عمر کا۔ یہ دورانیہ ان کی زندگی کی اہم تشکیلی عہد کا ہے جب وہ شعر و سخن کی دنیا میں قدم رکھ کر پختگی کی عمر کو بڑھ رہے تھے۔ اب اخیر میں جو دلیل ہمارے پاس ولی کی اورنگ آباد سے متعلق ہونے کے بارے میں بچتی ہے وہ ان کے کلام کی نوعیت اور اسلوب ہے۔ یہ بات پہلے ہی زیر بحث آچکی ہے کہ دکنی اور گجری میں لسانی لین دین کا سلسلہ ادبی سلسلے کے اوائل سے چلا آتا ہے۔ گجری کا ادب جو تصوف کے مسائل سے متعلق ہے وہی سرمایہ دکنی سرمائے کے بالمقابل رکھا جاسکتا ہے ورنہ عشقیہ مثنوی جو روایت اور قصوں کو منظوم کرنے کا جو ادبی سلسلہ دکن میں قائم ہوا اور تادیر جاری رہا، اس کے سامنے کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے گجری ادب کو رکھا جانا ممکن نہیں ہے۔ اب ولی کے زمانے تک آتے آتے زبان کے ارتقائی مدارج پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ لسانی ارتقا گجری اور دکنی سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ ولی کے شعری نظام کی ترکیب میں جس محاورے اور زبان کو دخل ہے اس میں گجری کے عناصر دکنی کے مقابلے میں بہت تھوڑے ہیں اور دکنی کا عنصر بھی ان کے اپنے شعری و لسانی اجتہادات کی بنسبت کم ہیں اس لئے یہ خیال کرنا کہ ولی کے یہاں شعری تشکیل و تنقیح کا عمل گجرات کے بجائے دکن یعنی اورنگ آباد میں انجام پایا۔ دکن میں بالخصوص بیجاپور میں گجرات سے ہجرت کرکے جانے والے مصنفین اپنی زبان کو گجری کے نام سے موسوم کرتے رہے، اب ایسے شعرا کا دکن میں قیام ان کی زبان واسلوب پر اثرانداز ہوا ہوگا اور ان کی زبان میں دکنی اور گجری عناصر کا امتزاج بھی ہوا ہوگا۔ محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

> اس عہد کی تواریخ دکن سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ گجرات سے بہت سے ادیب اور عالم بیجاپور آیا کرتے تھے وہاں کی سلطنت کے زوال پر ابراہیم عادل شاہ نے وہاں کے تمام ادیبوں کو اپنے دربار میں بلا لیا چنانچہ گجرات کے ان پناہ گزینوں نے دکن میں اردو کا ادبی ذوق بڑھانے میں حصہ لیا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بیجاپور کے بعض اردو مصنفین جیسے شاہ برہان اپنی زبان کو گجری ہی کہتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ گجرات کے اثر سے دکن کی ادبی زبان بڑی حد تک بدل گئی ہو اور جو لوگ اس متبدلہ زبان میں لکھتے تھے وہ اپنی زبان کو گجری کو کہنے لگے اور پرانی زبان دکنی کہلانے لگی مگر یہ فرق زیادہ عرصہ تک نظر نہیں آتا کیوں کہ متاخر اہل قلم ہمیشہ اپنی زبان کو دکھنی کہتے رہے۔ (۳۸)

ایسی صورت میں ولی کے یہاں گجری عناصر کی نشان دہی ہو بھی جائے تو اس سے ان کی دبستانی نسبت کو متعین کرنا آسان نہیں ہے کہ یہ اثرات بہت سے ایسے شعرا کے یہاں بھی ملیں گے جو مہاجر نہ تھے بلکہ دکن بطور ادبی ادبستان اور وطن ان کا مرجع وماویٰ تھا۔ اس لیے ہمیں دوسرے دلائل بھی تلاش کرنے ہوں گے جن سے ہم ولی کی دبستانی نسبت کو مزید متحقق کر سکیں۔ ولی کے بارے میں ہم یہ بات پڑھتے سنتے آئے ہیں کہ انھوں نے جس اسلوب شاعری کو ایجاد کیا وہ اسلوب بہت جلد ہی لائق تقلید اسلوب میں بدل گیا اور اہل ہند ودکن دونوں ہی ان کے اسلوب کی پیروی کرنے لگے۔ اس سلسلے میں جو ناگڑھی بھی اس بات سے متفق ہیں کہ گجرات، شمالی ہند اور دکن کو ولی نے بیک وقت متاثر کیا اور تینوں مقامات میں انھوں نے دبستانی حیثیت کی تقلیب میں اہم کردار ادا کیا۔ (۳۹) شمالی ہند اور دکن کے شعرا نے شاعری میں ولی کی پیروی اختیار کی۔ یہاں وہ کم ازکم یہ بات قبول کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ ولی نے گجرات، دکن اور شمالی ہند تینوں کے لیے ایک نیا اسلوب وضع کیا، اب یہاں پر دیکھنے والی بات یہ ہوگی کہ ولی نے کن شعرا کو اپنے پیش نظر رکھا یا پھر کن شاعروں کی تحسین اور ان کے طرز سخن سے وہ متاثر ہوئے۔ ولی کے کلام میں ناصر علی سرہندی کے ساتھ حسن شوقی کو بطور مقابل دیکھا جاسکتا ہے۔

ولی کی اورنگ آباد سے دبستانی نسبت کا تعین بہت کچھ شمالی ہند کے اس رویے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے جو اس نے دکن کو بطور دبستان قبول اور رد کرنے میں روا رکھا۔ میر کے بیان کو لیجیے کہ انھوں نے ولی کو اورنگ آباد کا باشندہ لکھا یا وہاں کی خاک سے بتایا۔ ان کے شعری رتبے کا ایک طرح اعتراف بھی کیا۔ قائم کے بیان کو دیکھیے کہ انھوں نے ولی کی شاعری کے تمام حسن وخوبی کو شاہ گلشن کے مشورے کا رہین منت بتا کر ولی پر صاف دہلی کے اثر کو غالب کرنے کی اپنی سی ایک کوشش کی، اگرچہ انھوں نے میر کے مقابلے ولی کی شعری منزلت کا اقرار ان سے بڑھ کر کیا۔ بعد میں ایک تذکرہ نویس نے باقاعدہ ولی کو اردوئے معلیٰ کی زبان میں شاعری کرنے کی نصیحت شاہ گلشن سے دلوادی اور اس طرح اہل دہلی کے دبے ہوئے داعیے بالکل واضح ہو کر سامنے آگئے کہ شاہ گلشن سے ولی کا شعر و سخن کے سلسلے میں فیضیاب ہونا کیوں ضروری تھا، اس لیے اس سے ان کے اپنے دبستانی شان کی تقویت ملتی تھی اور دہلویانا توانا ہوتی تھی۔ اب دیکھیے کہ اہل دہلی نے دکنی کے بارے میں دو طرح کے رویے اختیار کیے ایک تو اس کی تضحیک کا رویہ اور دوسرے ولی کی تحسین کا رویہ۔ ولی کی تحسین کی گنجائش شاہ گلشن والی روایت سے نکلتی تھی اور تضحیک کا رستہ علاقائی عصبیت اور ادبی انانیت صاف کرتی تھی۔ یہ دونوں رویے ہم قائم کے یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ شمالی ہند کا سب سے بڑا شاعر میر ہے۔ میر کا دکن کے بارے میں کیا رویہ تھا یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ میر کو دکن کے

شاعروں میں چند ہی مربوط گو شاعر نظر آتے ہیں۔ سراج، آزاد، عاجز دبستان اورنگ آباد کے شاعر ہیں اور عزلت گجرات کے باشندے ہیں اور میر کے یہاں دکنی شعرا میں شمار ہوئے ہیں۔ یوں عزلت کو دکن سے بالکل ہی تعلق نہ ہو ایسا نہیں ہے۔ عبدا لرزاق قریشی نے دیوان عزلت کے مقدمے میں ایسی باتیں لکھی ہیں جو کہ نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ ولی کی دبستانی نسبت کے بارے میں حاصل ہونے والی معلومات کو قدرے پختہ کرتی ہیں۔ ان کے مقدمے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عزلت حیدرآباد میں امیر الممالک سید محمد آصف کی عنایتوں سے بہرہ ور ہوئے، انھیں شفیق اورنگ آبادی کی کوشش سے ایک گاؤں بھی بخشا گیا۔ عزلت کا دکن میں مدت قیام بیس برس ہے، اس طرح انھیں وہاں کے شعری ماحول سے بالکل علاحدہ خیال کرنا مناسب نہیں ہے۔ کسی نہ کسی لحاظ سے وہ اس دبستان سے اثر پذیر ہوئے ہوں گے۔ اس طرح میر کے نزدیک پایۂ فن شعر پر فائز دکنی شاعر اورنگ آباد یا حیدرآبادی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جو ولی کے زیر اثر اپنی تقلیب ماہیت کر چکا تھا۔ (۴۰) میر کا یہ بیان دبستانی جانب داری سے اگرچہ خالی نہیں ہے۔ دیکھیے کہ میر کو دکن میں چند ہی مربوط گو شاعر دکھائی دیتے ہیں لیکن جب میر اپنے فن میں کمال یا اپنی مقبولیت کا اثبات کرتے ہیں تو وہ دکن کو یاد کرنا نہیں بھولتے۔ کہتے ہیں :

سر سبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میرؔ
یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا
خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے
معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا
کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانہ دکن تمام

پہلے شعر میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دکن وہی کلام جاتا تھا جو ہند میں قبول پا جائے اور اسے مقبولیت اور پسندیدگی کی انتہا حاصل ہو جائے۔ اس سے یہ نکتہ نکلتا ہے کہ اہل دکن ہر کس و ناکس کو قبول نہ کرتے تھے بلکہ دیکھے بھالے ہوئے فنی لحاظ سے پختہ لوگ ہی وہاں بار پاتے تھے جو اپنے اہل وطن کو اپنا قائل کرنے میں کامیاب ہوں۔ دوسرے شعر میں ہم ولی کی تحسین اور فنی مرتبے کو صاف محسوس کر سکتے ہیں۔ آخری شعر میں میر اس بات پر نازاں ہیں کہ ہند تو ہند دکن بھی انھیں ہاتھوں ہاتھ لیے ہوئے ہے۔ دیکھیے کہ میر دکن میں اپنے شعری رتبے کی قبولیت پر نازاں ہے اور دکن میں وہ ایسے شاعروں کا نام لیتا ہے جن میں بیشتر

اورنگ آباد یا سلطنت سے آصفیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے ولی کی دکنی نسبت صرف گجرات تک محدود خیال نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی انھیں دبستان گجرات کا نمائندہ اور اورنگ آباد سے گریزاں ہی کہا جاسکتا ہے۔

پرانے تذکرہ نویسوں میں میر اور شفیق اورنگ آبادی ولی کو اورنگ آبادی لکھتے ہیں۔ عبدالرزاق قریشی کے مقدمے کا ذکر اوپر ہو چکا ہے (۴۱) جس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عزلت ۱۶۹۲ء میں پیدا ہو چکے تھے۔ عزلت کا مولد سورت یعنی گجرات کا علاقہ ہے۔ وہیں عزلت کی ابتدائی نشوونما ہوئی۔ شفیق اورنگ آبادی سے عزلت کے گہرے مراسم تھے۔ دہلی آمد ولی نے دکنی شعرا کے تراجم عزلت کی بیاض سے ہی لکھے۔ ولی سنہ وفات نئی تحقیق کے مطابق ۱۷۰۷ء بتایا جاتا ہے۔ یعنی عزلت کی عمر جب چودہ پندرہ سال کی رہی ہوگی، اس وقت ولی کی وفات ہوئی۔ کیا عزلت ولی سے ناواقف ہوں گے کہ احمد آبادی تھے، گجراتی تھے یا پھر اورنگ آبادی تھے۔ ایک لحاظ تو عزلت ولی کے ہم عصر تھے۔ عزلت ولی کی طرح ہی صاحب علم و فضل گھرانے کے فرد تھے۔ اس لیے وہ ولی کی نسبت وطنی یا دبستانی سے ناواقف رہے ہوں، ایسا امکان نظر نہیں آتا۔ اس لیے ولی کو میر کا اورنگ آبادی بتانا اور شفیق کا ان کی گجرات کی طرف نسبت پر معترض ہونا بتاتا ہے کہ یہ صاحبان ولی کی دبستانی اور وطنی نسبت کے بارے میں معلومات رکھتے ہوں گے یا ان کے ذہن پر ولی کی دبستانی نسبت اس قدر حاوی اور مستحکم تھی کہ دوسرے پہلو کے بارے میں غور کرنے پر آمادہ نہ ہوسکے، اسی وجہ سے انھوں نے ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مولد کی تعیین میں شفیق یا حمید و قائم وغیرہ سے سہو ہوا ہو۔ میر اور شفیق کے نزدیک ولی کی اورنگ آباد سے نسبت اس قدر پختہ تھی کہ انھوں نے اورنگ آباد کو نہ صرف ولی کا مسکن بتایا بلکہ مولد بھی قرار دیا۔ حمید ولی کو اورنگ آبادی بتاتے ہیں تو اصل بات کا سرا کس سے زیادہ ملتا ہے۔ جونا گڑھی اور حسینی پیر علوی کی تحقیقات کے بموجب ولی کا مولد و مدفن احمد آباد ہے۔ حسینی پیر علوی کی تحقیق میں اصابت کا فیصلہ قائم چاندپوری کے حق میں دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی وہ شاہ گلشن والی روایت میں کوئی سقم نہیں دیکھتے۔ وہ رسالہ نورالمعرفت کو ولی کا تصنیف کردہ خیال کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا بڑا حصہ تذکروں اور دیگر تحقیقات پر استوار معلوم ہوتی ہے۔ اسم، سنہ ولادت، مولد و مدفن کے بارے میں حسینی پیر علوی کی باتیں بیرونی شہادتوں کی روشنی میں قبول کی جاسکتی ہیں۔ وہ ولی کی ولادت کا سال تخمینا ۱۰۵۰ھ کے آس پاس بتایا ہے۔ یہ ۱۶۴۹ یا پچاس کے آس پاس کا کوئی سنہ ہوسکتا ہے۔ تاریخ وفات ۱۱۱۹ھ درج کی ہے۔ جو ۱۷۰۷ عیسوی بنتی ہے۔ (۴۲) باقی تفصیلات تحقیق طلب معلوم ہوتی ہیں۔ صاحب تذکرۃ الوجیہ نے وطنی نسبت سے متعلق ولی کا ایک شعر نقل کیا ہے جس میں ولی خود کو گجرات اور دکن کا باشندہ کہتا ہے۔ اس

استشہاد میں بظاہر صراحت معلوم ہوتی ہے کہ ولی دکن اور گجرات دونوں میں مقامات پر سکونت رکھتا تھا۔ لیکن پھر دکن کے اطلاقی عموم کا پہلو اس استشہاد سے باز رکھتا ہے۔ یہ بات کیوں کر ہو سکتی ہے کہ ولی دکن اور گجرات دونوں کا متوطن ہے اور ایک کو وطن اول اور دوسرے کو وطن ثانی کی حیثیت حاصل ہے۔

ضروری ہے کہ ہم ولی کی زندگی سے متعلق ایسے شواہد پیش کریں جو اس بات کی تائید کرتے ہوں کہ ولی بیک وقت دکن اور گجرات کے متوطن تھے۔ ولی کا جو خاندانی پس منظر اب تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دکن سے رابطے اور تعلق و سکونت کی روایت ولی سے پہلے ہی ان کے خاندان میں موجود تھی۔ حسینی پیر علوی لکھتے ہیں:

> تحصیل علم کے بعد اردو ریختہ کی جدید شاعری کے شوق میں آپ نے سیاحی اختیار کی۔ دکن میں چونکہ ریختہ کا رواج زیادہ تھا اور آپ کی طبیعت کا میلان بھی اسی طرف تھا۔ دوسرے ولی کے خاندانی بزرگ بھی احمد آباد سے برہان پور اور بیجاپور میں ولی سے سو سال پیشتر سکونت گزیں ہو چکے تھے۔ حضرت شاہ وجیہ الدین کے فرزند اور آپ کے بھائی برہان الدین سلاطین فاروقیہ کے عہد میں احمد آباد سے جا کر برہان پور مقیم ہوئے۔ اسی طرح ولی کے اقربا اور بنی عم بھی برہان پور میں سکونت رکھتے تھے۔ حضرت شاہ ہاشم حسینی متوفی ۱۰۵۶ھ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانۂ سلطنت میں برہان پور سے بیجاپور تشریف لے گئے۔ آپ کی اولاد فی الحال بیجاپور میں موجود ہے۔ شاہ حفیظ اللہ علوی نے احمد آباد سے غالباً ۱۰۹۰ھ میں دکن میں سکونت اختیار کی۔ اورنگ آباد میں اپنے دادا مرشد سید احمد گجراتی شطاری کی خدمت روحانی سے فیض حاصل کرتے رہے۔

اسی طرح ولی کے برادر نسبتی مولانا شیخ فرید صدیقی متوفی ۱۰۹۲ھ ہیں۔ جن کے نامور شاگردوں میں مولانا برہان الدین گجراتی اور مولانا احمد بن سلیمان کردی ہیں۔ مولانا نورالدین صدیقی سہروردی مولانا احمد کردی کے شاگرد ہیں۔ ان کے لڑکے جمیل اللہ اور عزیز اللہ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں اورنگ آباد میں بود و باد اختیار کی تھی جن میں مولانا کے پوتے شیخ فرید بن جمیل اللہ کا ۱۱۴۸ھ میں وصال ہوا۔ اور اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔ ان کی لڑکیاں ولی کے لڑکے سید احمد اور سید مجتبیٰ سے منسوب تھیں۔ ان وجوہات کے سبب ولی نے عمر کا بیشتر حصہ دکن و گجرات میں گزارا۔ (۴۳)

اس تفصیل کے معلوم ہو جانے کے بعد اگر پیر حسینی علوی کے درج کردہ شعر کی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو ولی کے دو وطن کے امکانات سامنے آتے ہیں۔ پھر بھی یہ سوال ہنوز باقی رہتا ہے کہ ولی صرف قرابت داری کی وجہ سے دو مقامات پر توطن کیوں اختیار کریں گے۔ اس کی بھی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ اورنگ آباد کی بدلتی حیثیت کو ہم اس کی بڑی وجہ قرار دے سکتے

ہیں۔ شیخ چاند کے مضمون (۴۶) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب سے پہلے اورنگ آباد نام کا وجود نہ تھا، اگرچہ جس مقام پر اورنگ آباد کی بنا پڑی کسی زمانے میں ملک عنبر متمکن تھا اور اس جگہ کو کھڑکی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مغل سرداروں نے کھڑکی کی آرائش وزیبائش کی اور ۱۶۵۳ میں دکن کا گورنر بننے کے بعد اورنگ زیب نے اس کا نام اورنگ آباد خجستہ بنیاد رکھا۔ اس کے بادشاہ بننے کے بعد تو اس علاقے کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ جب اورنگ زیب سریر آرائے سلطنت ہوا تو بقیہ دکن کی تسخیر اس کا ہدف بنی اور تادیر اورنگ آباد میں مقیم رہا۔ بادشاہ کے امرا اور وُسا دھیرے دھیرے یہاں آتے گئے۔ اہل علم وفن نے بھی اورنگ آباد کا رخ کیا۔ دکنی کی ریاستیں جب مسخر ہو گئیں تو وہاں کے اہل علم وفضل اور متوسلین بھی اس طرف رجوع ہوئے، بیرونی ملکوں سے بھی تجار اور علما اور اہل سلطنت یہاں وارد ہونے لگے اس طرح اورنگ آباد کی اہمیت روز بہ روز بڑھتی ہی گئی۔ گو ہم کہہ سکتے ہیں اورنگ زیب کے عہد میں مقامی حکومتوں کے مغلیہ حکومت میں ضم ہو جانے کے بعد زبان وادب کا مرکز ثقل اورنگ آباد ہونے لگا۔ یہاں اہل زبان کا ایک نیا اجتماع وجود میں آرہا تھا۔ شمال کے لوگ بھی یہاں آموجود ہوئے تھے اور دکنی کی ریاستوں کے جوہری بھی یہاں جمع ہو گئے تھے۔ اس طرح ایک لسانی وادبی سنگم کی صورت پیدا ہو چلی تھی۔ ایسی صورت حال میں اگر ولی اورنگ آباد کو آتے جاتے ہیں اور گجرات کے ساتھ اسے اپنا وطن قرار دیتے ہیں تو اس میں کوئی بات خلاف واقعہ نہیں جاتی۔ حسینی پیر علوی کی تحقیق میں بعض پہلو توجہ طلب ضرور ہیں لیکن وہ ہمیں تطبیق کی ایک صورت نکالنے کا راستہ ضرور دکھاتے ہیں۔

اگر بغور دیکھا جائے تو ان تمام باتوں میں تطبیق کی صورت بھی نکل سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ شاہ گلشن سے ولی کا استفادہ شاعری سے نہیں بلکہ سلوک سے تعلق رکھتا ہے۔ ولی کا شاہ وجیہ الدین سے نسبی تعلق ہے اور اس نے ان کے مدرسے میں تعلیم پائی۔ اس کا وطن احمد آباد ہے لیکن اس نے خاندانی قرابتوں کی وجہ اورنگ آباد کو مرکز ثقل میں بدلتے دیکھ کر اورنگ آباد ہجرت کی اور اورنگ آباد ہی میں مدت مدید تک مقیم رہا۔ ہم کہہ سکتے ہیں اس نے دہلی کا سفر اواخر عمر میں کیا اس لیے اس کا اورنگ آباد قیام اس کی پختگی کی عمر سے لے کر عمر کے اواخر یعنی احمد آباد مراجعت تک خیال کرنا چاہیے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ سفر دہلی، سفر حج وغیرہ کے بعد احمد آباد جا مقیم ہوا اور وہیں وفات پائی ہو۔ اس دوران اورنگ آباد کا لسانی معاشرہ اپنے آپ ایک حسین امتزاج میں تبدیل ہوا۔ دکن اور شمال کا اجتماع ہوا اور اس اجتماع سے ولی نے یہ فائدہ اٹھایا کہ دونوں روایتوں کو گوندھ کر اس نے نئی بنا ڈال دی جس نے لسانی تنوعات کو ممزوج کر کے ایک بڑی روایت کی بنا رکھی اور اسی بنا کو اورنگ آبادی دبستان

کا خشت اول کہا جانا قرین انصاف ہے۔ ولی کے بعد اورنگ آباد میں شعرا کی اتنی تعداد تو رہی کہ ہم اسے باقاعدہ ایک دبستان کا نام دیں۔ اگرچہ ان میں ولی کے پائے کے شاعر نہ ہوئے لیکن جو شاعر ہوئے ان کی فنی کاوشیں ولی کے شعری طریق کار کی پرورش کرنے اور اسے رواج دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے اپنی اس رائے میں صائب معلوم ہوتے ہیں :

> ولی نے اہل دکن اور اہل شمال دونوں کے یہاں رائج ہندوی اور فارسی کی ملی جلی طرز شعر گوئی سے یکسر انحراف کرتے ہوئے غزل کو سبک ہندی کی راہ پر ڈال کر اورنگ آباد کو دکن کے لیے باعث افتخار اور شمال کے لیے قابل رشک بنادیا۔ ولی کی یہ اختراع اور ان کے نام کے ساتھ اورنگ آباد کا جڑ جانا اورنگ آباد کی دبستانی حیثیت کی سند کا درجہ رکھتا ہے۔(۴۵)

حواشی:

۱۔ مولوی ابو تراب محمد عبد الجبار ملکاپوری۔ محبوب الزمن حصہ دوم۔ مطبع رحمانی۔ سنہ ۱۳۲۹ھ۔ ص ۱۱۲۷

۲ ۔ شیخ چاند۔ اورنگ آباد اور اردو شاعری۔ مشمولہ؛ مجلہ عثمانیہ جلد اول، شمارہ چہارم۔ بہمن ۱۳۳۷ف۔ ص ۹۴

۳ ۔ مرتبہ؛ احسن مارہروی۔ کلیات ولی، مقدمہ۔ انجمن اردو پریس، اردو باغ اورنگ آباد۔ ۱۹۲۷۔ ص ۱۴

۴۔ اسلم مرزا۔ آئینۂ معنی نما۔ نوائے دکن پبلی کیشنز۔ اورنگ آباد دکن۔ اشاعت اول ۲۰۰۳۔ ص ۱۸

۵۔ ایضا۔ ص ۱۹

۶۔ ظہیر الدین مدنی۔ ولی گجراتی۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ ۱۹۸۱۔ ص ۸۵

7.Muhammad sadiq, Ahistory of urdu literature ,oxford university press,Delhi,Bombay ,Calcutta ,Madaras,1984,page63.

۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ اردو کا ابتدائی زمانہ۔ آج پبلی کیشنز۔ اشاعت سوم ۲۰۰۹۔ ص ۱۲۵

۹۔ ظہیر الدین مدنی۔ ولی گجراتی۔ سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ ۱۹۵۰۔ ص ۴۹

۱۰۔ ایضا۔ ص ۴۹،۴۸،۴۷

۱۱۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی۔ گلشن گفتار۔ مرتبہ ؛سید محمد ایم اے ے۔ مطبوعہ؛ خورشید پریس یوسف بازار نیا پل ۔۳۰ بہمن ۱۳۳۹ف۔ ص ۸

۱۲۔ قیام الدین قائم۔ مخزن نکات۔ مرتبہ؛ ڈاکٹر اقتدا حسن۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ اشاعت اول ۱۹۶۶۔ ص ۲۱

۱۳۔ قدرت اللہ شوق۔ طبقات الشعرا۔ مرتبہ؛ ڈاکٹر اقتدا حسن۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۵۔ ص ۵

۱۴۔ سید حسینی پیر علوی۔ تذکرۃ الوجیہ۔ گجرات اردو اکادمی۔ پہلی اشاعت ۱۹۹۰۔ ص ۱۹۷۔

۱۵۔ میر تقی میر۔ نکات الشعرا۔ مرتب، مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ اشاعت ثانی ۱۹۷۹۔ ص ۹۲۔

۱۶۔ علی الحسینی گردیزی۔ تذکرہ ریختہ گویاں۔ مرتبہ؛ اکبر حیدری کاشمیری۔ ص ۱۳۹۔

۱۷۔ سید محمد ایم اے۔ یادگار ولی۔ مطبع برقی مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔ ۱۹۳۷۔ ص ۹۸

۱۸۔ گراہیم بیلی۔ اردو لٹریچر۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن۔ ۱۸۳۲۔ ص ۳۶۔

۱۹۔ قائم چاندپوری۔ نکات الشعرا۔ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۵۔ ص ۱۶

۲۰۔ احسن مارہروی۔ کلیات ولی۔ مقدمہ۔ انجمن اردو پریس، اردو باغ اورنگ آباد۔ ۱۹۲۷۔ ص ۱۵

۲۱۔ ایضا۔ ص ۱۶

۲۲۔ ایضا۔ ۱۶

۲۳۔ محی الدین قادری زور۔ ولی کا وطن۔ مشمولہ؛ یادگار ولی۔ مطبع برقی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔ ۱۹۳۷۔ ص ۵۶

۲۴۔ ایضا۔ ص ۴۹

۲۵۔ قاضی اختر جوناگڑھی۔ ولی گجراتی۔ مشمولہ؛ رسالہ مصنف اکتوبر ۱۹۴۵۔ ص ۱۱۵۔ ۱۱۶

26.Ram Babu ,A History of Urdu Literature , Asian Educational Services,New Delhi, 1990, p 32

۲۷۔ مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۹، ص ۸۳

۲۸۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹، ص، ۱۴۹

۲۹۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے، دبستان اورنگ آباد: تحقیقی و تنقیدی معروضات،اردو بک ریویو، نئی دہلی ۲۰۰۶، ص۵۵،۵۴

۳۰۔ ایضا۔ ص۵۵۔۵۶

۳۱۔ ظہیر الدین مدنی ۔ گجری اور دکنی اردو ، مشمولہ دکنی اردو مرتبہ عبدالستار دلوی، ناشر شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی، بمبئی 1987ء، ص34

۳۲۔ ایضا۔ ص۴۰

۳۳۔ ایضا،۴۲

۳۴۔ ایضا، ص۴۵

۳۵۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی،ولی گجراتی، مشمولہ رسالہ مصنف،جلد نمبر ۳،شمارہ نمبر ۱۳ابابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۵ء، ص ۱۰۷

۳۶۔ ایضا، ۱۱۶،۱۱۷

۳۷۔ سید ظہیر لدین، مدنی،ولی گجراتی، مشمولہ ولی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مرتب محمد خاں اشرف، مکتبہ لائبریری لاہور ۱۹۶۵، ص۲۲،۲۳

۳۸۔ محی الدین قادری زور،اردو شہ پارے، مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن،۱۹۲۹، ص ۱۲

۳۹۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی،ولی گجراتی، مشمولہ رسالہ مصنف،جلد نمبر ۳،شمارہ نمبر ۱۳ابابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۵ء، ص،۱۲۲

۴۰۔ عبدالولی عزلت،دیوان عزلت مرتبہ،ادبی پبلشرز بمبئی ۱۹۶۲، ص۴۰

۴۱۔ عبدالولی عزلت،دیوان عزلت مرتبہ،ادبی پبلشرز بمبئی ۱۹۶۲، ص،۳۱تا۳۷

۴۲۔ سید حسینی پیر علوی، گجرات اردو اکیڈمی گاندھی نگر،۱۹۹۰، ص۱۸۰تا۲۰۴

۴۳۔ ایضا۔ ص ۱۹۳۔ ۱۹۴

۴۴۔ شیخ چاند، اورنگ آباد اور اردو شاعری، مجلہ عثمانیہ، جلد اول، شمارہ چہارم، کلیہ عثمانیہ حیدرآباد، ۱۳۳۷، ص ۸۷ تا ۱۱۸

۴۵۔ معین الدین جینابڑے، دبستان اورنگ آباد تحقیقی اور تنقیدی معروضات، اردو بک ریویو، نئی دہلی ۲۰۰۶، ص ۵۷ ص

باب دوم

اردو و فارسی کے تذکروں میں ذکر ولی

ولی کے فن شعر گوئی اور متن کلام کی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں تذکرے کیوں اہمیت رکھتے ہیں؟ تذکروں میں دستیاب معلومات ہمیں کس طرح ولی کے بارے میں تشفی بخش جواب دینے میں معاون ہو سکتی ہیں؟ ہم تذکروں کے توسط سے ولی کو سمجھنے اور جاننے کی روایت کو جانچ پرکھ کر کسی مختلف اور پہلے سے زیادہ قابل اطمینان نتیجے تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟ یہی وہ سوالات ہیں جو ذکر ولی کی تلاش و تحقیق کے لئے تذکروں سے رجوع کرنا ناگزیر ٹھہراتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اردو کے ادبی تذکروں میں ولی سے متعلق معلومات کا مطالعہ کریں اور مختلف فارسی اور اردو تذکروں کے مشمولات پر بحث کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ولی فہمی کے سلسلے میں تذکروں کی معنویت کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کا جائزہ لیں۔ اس سے ہماری تحقیق و تنقید کے ہدف کو بھی سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ہم اپنی ادبی تاریخ کی تشکیل کے لیے اور کسی کلاسیکی ادبی شخصیت سے واقفیت کے لیے تذکروں پر اس لئے منحصر ہیں کیوں کہ ہمارے پاس ان کے علاوہ معلومات کا کوئی دوسرا ماخذ موجود نہیں ہے۔ کسی قدیم شخصیت کے ادبی آثار اور باقیات میں ہمیں اکثر اس قدر مواد نہیں ملتا کہ ہم اس سے کسی اہم یا اطمینان بخش نتیجے تک پہنچ سکیں۔ تذکروں کے بارے میں عام طور سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ بیاض کی شکل میں وجود میں آئے۔ تذکرہ نویس اپنے مذاق سخن کی تسکین کے لیے جو انتخاب بناتے تھے ،اس میں کچھ مفید مطلب باتیں اصل کلام سے پہلے بطور ترجمہ لکھ لیتے تھے اور اسی سے ان تذکروں کی روایت شروع ہوئی۔ ہمارے اسلاف اہل علم کس قدر ستھرا ذوق رکھتے تھے کہ ان کا ذاتی انتخاب اور منتخب شعرا کے ترجمے آج ہماری اپنی روایت کو جاننے کی کلید بنے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اس عمل کی موجودہ اہمیت سے واقف ہوتے یا اس کا کچھ ادراک رکھتے تو ضرور وہ اپنے اس اہتمام میں تحقیق و تصنیف کی شان پیدا کرتے۔ ہمارے یہاں کئی ایسے تذکرے ہیں جو اپنی علمی شان اور نکات شعر کے لیے بہت معروف ہیں۔ اس لیے ادبی تذکروں کی اہمیت اور ولی کے بارے میں حقائق کی پرکھ کے سلسلے میں ان کی معنویت تو بالکل واضح بات ہے۔ کلاسیکی اردو شاعری کی تاریخ اور تنقید میں تذکروں کی اہمیت ایک اساسی متن کی ہے۔ یہ ہماری معلومات کا اولین ماخذ ہیں۔ تحقیق میں اولین ماخذ کی اساسی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ کسی بھی تحقیق میں ہم اگر اساسی ماخذ کے بغیر ثانوی ماخذ پر انحصار کرتے ہیں تو گویا ہم اس ماخذ کو تیار کرنے والے کی رائے اور نتائج کو پیش نظر رکھ کر ہی اپنے نتائج کو

حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر متن میں تعبیر کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ اگر اساسی ماخذ سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم کسی دوسرے متن کو بنیاد بنا کر اپنی تعبیر حاصل کریں تو بہت ممکن ہے کہ تعبیر در تعبیر کا عمل ہمیں ایسے نتائج تک لے جائے جو حقیقت اور شواہد کو روشن کرنے کے بجائے کسی غلط فہمی کا موجب بن جائیں۔

دوسرا سوال تذکروں سے حاصل شدہ معلومات کی صداقت سے متعلق ہے۔ ولی کی شاعری اور زندگی کو زیر بحث لانے والے تذکرے ایک طرح کی معلومات فراہم کریں، ایسا ممکن نہیں۔ علاقے، زمانے اور تذکرہ نگار کی شخصیت اور اس کے فن سے تعلق، یہ وہ پہلو ہیں جو معلومات کو مختلف سیاق عطا کرتے ہیں۔ ان معلومات میں بہت سی باتیں قیاسی اور ترجیحی بھی ہو سکتی ہیں ،اس لیے ان کے درمیان ردو قبول اور راجح و مرجوح کے سلسلے کا قائم ہونا ناگزیر ہے۔ ولی کی شخصیت، ولی کا نام اور ولی کے کارنامے ولی کے بارے میں زیادہ تر معلومات کے مرکز میں رہے ہیں۔ محققین اور ناقدین انھیں مختلف معلومات سے اپنی اپنی ترجیح قائم کرتے رہے ہیں۔ ولی کے بارے میں تذکروں سے لے کر ادبی تاریخ و تنقید کے موجودہ منظر نامے تک جو انتشار کی کیفیت ملتی ہے، اس کا تعلق راست طور پر تذکروں کی فراہم کردہ معلومات سے ہے۔ ایسی صورت میں تذکروں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ہم ولی کے بارے میں تذکروں میں دی گئی معلومات اور تنقیدی رایوں کا مطالعہ کریں گے۔ پہلے ہم فارسی تذکروں کے متعلقہ متن کو نقل کر کے ان کا ترجمہ کریں گے اور ان پر گفتگو کرتے ہوئے اردو تذکروں کی طرف رجوع کریں گے۔ اس دوران ضروری مقامات پر مطلوب صراحتوں کو درج کرنے کے بعد تمام تذکروں کی معلومات کا تقابل کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے ہم ان تذکروں کے نام تاریخ کی ترتیب سے درج کرتے ہیں تا کہ ایک فہرست سامنے آجائے۔

	نام تذکرہ	مصنف	زمانۂ ترتیب / تکمیل
۱۔	نکات الشعرا	میر تقی میر	۱۷۵۲،۱۷۵۱
۲۔	گلشن گفتار	خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی	۱۱۶۵،۱۷۵۲ھ
۳۔	گلشن راز / تذکرۂ ریختہ گویاں	فتح علی حسینی گردیزی	دسمبر ۱۷۵۲

۴۔	مخزن نکات	قیام الدین قائم چاند پوری	۱۷۴۴،۱۷۶۳
۵۔	چمنستان شعرا	لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی	۱۷۶۱۔ ۱۷۶۲
۶۔	تذکرۂ شعرائے اردو	میر حسن	۱۷۷۴تا۱۷۷۸
۷۔	طبقات الشعرا	قدرت اللہ شوق	۷۹۔ ۱۷۷۴
۸۔	تذکرۂ شورش	میر غلام حسین شورش عظیم آبادی	۱۷۷۹ء ۱۱۹۳ھ
۹۔	تذکرہ مسرت افزا	ابوالحسن امیر الدین احمد معروف بہ امر اللہ الہٰ بادی ۱۷۷۸۔۱۷۸۱	
۱۰۔	گلزار ابراہیم	ابراہیم خاں خلیل	۱۷۸۴
۱۱۔	گلشن سخن	مردان علی خاں مبتلا	۱۷۸۴ کے بعد
۱۲۔	گلشن ہند	مرزا علی لطف	۱۸۰۱
۱۳۔	مجموعۂ نغز	قدرت اللہ قاسم	۱۸۰۶
۱۴۔	تذکرۂ عشقی	شیخ وجیہہ الدین عشقی	۱۱۸۸ھ/۱۲۳۰ھ
			۱۷۷۴،۱۸۱۵
۱۵۔	تذکرۂ بے جگر	خیراتی لعل بے جگر	۱۸۲۱۔ ۱۸۲۷
۱۶۔	عمدۂ منتخبہ	اعظم الدولہ سَرور	۱۸۱۳تا۱۸۳۴
۱۷۔	گلشن بے خار	نواب مصطفی خاں شیفتہ	۱۸۳۴
۱۸۔	گلستان بے خزاں	قطب الدین باطن	۱۸۴۵

۱۹۔	طبقات شعرائے ہند	مولوی کریم الدین	۱۸۴۸
۲۰۔	مخزن الشعرا	قاضی نور الدین فائق	۱۸۵۱
۲۱۔	سخن شعرا	عبد الغفور نساخ	۱۸۷۴

ا۔ نکات الشعرا

میر نے جس عہد میں اس تذکرہ کو ترتیب دیا، اس وقت تک فارسی شعرا کے تذکروں کی ایک تعداد وجود میں آچکی تھی۔ تراجم، احوال، فن کے خصائص اور رموز کا اجمالی مگر جامع اندراج کی روش بھی قائم ہو چکی تھی۔ میر نے اس روش کی پیروی نہیں کی۔ انھوں نے اپنے تذکرہ میں تنظیم کی پابندی کے بجائے اپنی روش اور ترجیح کی بنا پر شاعروں کے احوال، اور شعری نمونے درج کیے اور اپنے تحفظات کو قائم رکھتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی۔ اس سلسلے میں ولی، خان آرزو، تاباں اور یقین کے سلسلے میں میر کے تراجم اس بات کی تائید کرتے ہیں۔ میر کا رویہ تمام شاعروں کے ساتھ کسی ایک اصول کا پابند نہ تھا۔ میر شعر بنانے میں جس طریقے کی پیروی کرتے تھے، اس طریقے کے علمی و تنقیدی مباحث کا ایک مربوط اور منضبط ادراک بھی رکھتے تھے۔ لیکن انھوں نے تذکرے میں ہر شاعر کی خوبی اور فنی محاسن و معائب کا غیر جانب دارانہ جائزہ لیا ہو، ایسا نہیں ہے۔ حنیف نقوی کہتے ہیں کہ " تقریباً چونسٹھ شاعروں کے حالات میں میر صاحب نے ان کی فکری کاوشوں کے حسن و قبح اور معیار و منہاج کے متعلق مطلقاً کسی رائے کا اظہار ہی نہیں کیا۔

"شاعر ریختہ از خاک اورنگ آباد است. می گویند کہ در شاہ جہان آباد دہلی نیز آمدہ بود. بخدمت میاں گلشن صاحب رفت واز اشعار خود پارۂ خواند. میاں صاحب فرمود، ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختہ خود بکار ببر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت. از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد واحوالش کما ینبغی معلوم من نیست۔"(۱)

ترجمہ:

> ولی اورنگ آباد کے ریختہ کے شاعر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شاہجہاں آباد دہلی تشریف لائے تھے۔ میاں گلشن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اشعار سنائے۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ سارے مضامین فارسی بے کار پڑے ہیں انھیں اپنے ریختہ میں کام میں لاؤ جو کہ تمھارے خیال کیے جائیں گے۔ ان کے کمال نیک نامی کو تعارف کی حاجت نہیں۔ ان کے ضروری احوال معلوم نہیں۔

میر کے اس ترجمے سے ولی کے بارے میں ہمیں جو بنیادی باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ کہ ولی اورنگ آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ دہلی آئے تھے اور میاں گلشن سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے شعر گوئی کے سلسلے میں ولی کو فارسی مضامین برتنے کا مشورہ دیا۔ میر نے یہاں یہ روایت نقل ضروری کی ہے لیکن می گویند کہہ کر اپنا دامن بھی بچالیا۔ شاہ گلشن کے جس مشورے کو نقل کیا گیا ہے، اس میں "فارسی مضامین تمھارے اپنے کہلائیں گے"، بہت اہم جملہ ہے جو یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ ولی کی شاعری فارسی مضامین کا چربہ ہے۔ "کمال نیک نامی کو تعارف کی حاجت نہیں" کہہ کر انھوں نے اپنی طرف سے ولی کو تحسین بھی پیش کردی لیکن ہمیں یہ معلوم نہ ہوا کہ ولی کے رنگ سخن کے بارے میں میر کی کیا رائے تھی، وہ ولی کو شعر و سخن کی کس منزل پر دیکھتے تھے۔

۲۔ گلشن گفتار

حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ "گلشن گفتار" اردو شعرا کے اولین تذکروں میں ہونے کے سبب اہمیت رکھتا ہے اور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس تذکرے سے دکن اور بالخصوص اورنگ آباد کے شاعروں کے متعلق اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دکن کی بہ نسبت شمالی ہند کے شاعروں کے تراجم مختصر ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے شعرا کے بارے میں حمید کی معلومات محدود تھیں۔ ولی کے متعلق حمید لکھتے ہیں:

> "ولی. ولی محمد. احمد آبادی. عجب فکر رسائے داشت و دیوان دلچسپ رنگینے طرح نمودہ. اکثر اوقات خود در طلب علم گزرانیدہ. در بلدہ دارالسرور برہان پور نیز مدتے سکونت داشت و بجانب میاں سید معالی کہ از مشایخ زادہ ہائے گجرات بودند میل تمام داشت دیوان ریختہ مشہور و معروف دارد. آخر عمر در گجرات وفات نمود"(۲)

ترجمہ:

ولی: ولی محمد نام اور احمد آبادی، آپ نے نہایت بلند فکر پائی تھی، اور ایک دلچسپ ورنگین دیوان مرتب کیا تھا. آپ نے اپنا زیادہ تر وقت تحصیل علم میں گزارا. دارالطرب شہر برہان پور میں بھی کافی عرصہ تک قیام پذیر رہے اور میاں سید معالی سے, جو کہ گجرات کے مشائخ زادوں میں سے تھے, آپ کا پورا ربط ضبط تھا. مشہور و معروف دیوان کے مالک ہیں. آخر کار گجرات میں وفات پائی۔"(۳)

میر کے بالمقابل یہاں ولی کو اورنگ آباد کا باشندہ لکھنے کے بجائے، حمید نے انھیں احمد آبادی لکھا ہے۔ حمید اورنگ آباد سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ولی کی وطنی نسبت اگر اورنگ آباد سے ہوتی تو یہ ضرور ان کے علم میں ہوتا لیکن انھوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی، اور نہ ہی حمید نے ولی کی دہلی آمد کا کوئی حال لکھا۔ البتہ ولی کے سفر برہان پور کی اطلاع ضرور دی۔ ولی کی وطنی، خاندانی نسبت اور جائے وفات کے بارے میں ہم میر کی بہ نسبت حمید کے تذکرے میں زیادہ معلومات دیکھتے ہیں۔ "اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین /جا کہو کوئی محمد شاہ سیں"، شرف الدین مضمون کا یہ شعر ولی کے سفر دہلی سے متعلق کیا جاتا ہے اور ان کے سفر دہلی اور قیام دہلی کے باب میں بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ اس تذکرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں، بلکہ شرف الدین مضمون کا ہے۔ ولی کے ذکر میں یہ شعر اس محرف صورت میں درج ملتا ہے۔ "دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین/جا کہو کوئی محمد شاہ سوں۔ حمید نے یہ شعر شرف الدین مضمون کے ترجمے میں درج کیا ہے۔ (گلشن گفتار۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی۔ مرتبہ: سید محمد ایم اے۔ مطبوعہ: خورشید پریس یوسف بازار نیا یل۔ ۳۰ بد ہمن ۱۳۳۹ف، ص ۱۹) اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شعر ولی کے سفر دہلی کی توثیق کے لیے کسی نے تصرف کے ساتھ نقل کیا ہوگا۔

۳۔ تذکرۂ ریختہ گویاں:

سید فتح علی حسینی الگردیزی کا یہ تذکرہ میر کے تذکرے کے بعد لکھا گیا۔ اس تذکرے میں میر کے بعض تعصبات کا بلا تعرض و تعریض ازالہ بھی کیا گیا ہے۔ محمد یار خاکسار کا گردیزی نے جس انداز میں ترجمہ لکھا ہے اور ریختہ کی جو تعریف درج کی ہے، اس کے جو اقسام بیان کیے ہیں، ان کے باہمی تقابل سے اس بات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ گردیزی فی الواقع اس تذکرے میں میر کا خاموش استدراک کر رہے ہیں:

مظہر کمالات خفی و جلی، محمد ولی، در دکن چہرۂ ہستی افروختہ. از بدو شعور دولت معنی اندوختہ، کمان پر زور سخن را بہ نیروئی فکرت کشیدہ و ناوک اندیشہ اش بھدف معنی رسیدہ. ہر چند اشعار آبدارش زیب صفحہ ہای لیل و

نھار است وگوشوارۂ سوامع سخن سرایان روزگار لیکن بنابر التزام بہ تحریر بیت چند بایجاز واختصار پرداخت ۔"(۴)

ترجمہ:

خفی وجلی کمالات کے مظہر محمد ولی دکن میں عالم وجود میں جلوہ نما ہوئے۔ ابتدائے شعور سے ہی جہان معنی پر قادر ہوئے (جہان معنی کو محفوظ کیا) پرزور کمان سخن قوت فکر پر کھینچی اور خدنگ خیال مطلوب معنی پر جا پڑا۔ ہر چند کہ (آپ کے) شگفتہ اشعار روز وشب کے صفحوں کی زینت اور سخن سرایان زمانہ کے سامعوں کا گوشوارہ ہیں۔ (یعنی ان کے سامعہ کی لو سے بطور قطرہ یا بالی کے لٹکتے ہیں) تحریر میں ایجاز واختصار کے التزام کی بنا پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

میر اور حمید اورنگ آبادی اپنے اپنے تذکرے میں ولی کی شاعری کے فن پر کوئی معنی خیز بات نہیں کہتے۔ گردیزی کے یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اصل وطن اور دیگر تفصیلات کے بارے میں کچھ نہیں کہتے جب کہ قرائن صاف یہ کہتے ہیں کہ میر کا تذکرہ ان کے پیش نظر رہا ہے، اس کے باوجود وہ نہ تو ولی کی دہلی آمد کا کوئی ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی شاہ گلشن والی روایت کا اعادہ کرتے ہیں ۔ وہ ولی کو دکن کا متوطن مان کر ان کے فن پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ ابتدائے شعور سے معنی پر قادر ہونے کا جملہ یہ بتاتا ہے کہ وہ ولی کے بتدریج شعری ارتقا کے قائل نہیں ہیں۔ کمان پرزور سخن، نیروئی فکرت، ناوک اندیشہ، ہدف معنی کے الفاظ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ گردیزی شاعری میں لفظ کے انتخاب، تخیل کی طاقت، خیال کی اہمیت اور مطلوب معنی کی ندرت کے قائل ہیں۔ گو ان کے یہاں شاعری کے عمل میں لفظ کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ وہ شاعری میں تخئیل کی کارفرمائی کو ناگزیر جانتے ہیں، اسے ایک منبع سمجھتے ہیں جہاں سے نت نئے خیال وارد ہوتے ہیں۔ مضمون کے بندھ جانے اور جس خیال کو نظم کرنے کی سعی کی جائے اس کے کامیابی سے نظم ہو جانے کو ایک بڑی کامیابی تصور کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ ہدف معنی کے حاصل ہونے کی بات کہتے ہیں۔ سفر دہلی اور شاہ سعد اللہ گلشن سے ولی کی ملاقات کی روایت سے گردیزی کا صرف نظر کرنا اور ولی کی فنی عظمت کو اس انداز میں بیان کرنا ذکر ولی کے سلسلے میں اس تذکرے کی اہم خصوصیات قرار دی جا سکتی ہیں۔

۴۔ تذکرۂ مخزن نکات:

قائم چاند پوری کے اس تذکرے کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شعرا کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا اور اس تقسیم میں مختلف ادوار کی ادبی و لسانی روایتوں میں پیدا ہونے والے فرق کو ملحوظ رکھا۔ اس طرح قائم کے یہاں اردو شاعروں کے ترجمے میں ایک طرح کی تاریخی ترتیب قائم کرنے کی شعوری کوشش کارفرما نظر آتی ہے۔ قائم کا طرز بیان سادگی اور متانت کا نمونہ ہے۔ انھوں نے لفظی کفایت اور معنوی وسعت کو ملحوظ رکھا ہے۔ انھوں نے شاعروں کے شخصی اوصاف بھی بیان کیے ہیں جو صرف اچھے اوصاف تک محدود نہیں ہیں۔ میر اور گردیزی کے تذکروں کے بالمقابل قائم نے دکنی شاعروں کے احوال زیادہ مفصل لکھے ہیں۔ اس تفصیل کی حقیقت کیا ہے، یہ تو ہم ولی کے ترجمے میں دیکھیں گے۔ ولی کے بارے میں قائم لکھتے ہیں:

شاہ ولی اللہ, ولی تخلص, شاعر یست مشہور, مولد ش گجرات است. گویند بہ نسبت فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ از اولیای مشاہیر است, افتخار ہا داشت. در سنہ چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ, ہمراہ میر ابو المعالی نام سید پسری کہ دلش فریفتہ او بود, بہ جہان آباد آمد, گاہ گاہ بزبان فارسی دو سہ بیت در وصف خط و خالش می گفت. چون در آنجا بسعادت ملازمت حضرت شیخ سعد اللہ گلشن قدس سرہ مستعد گردید, بگفتن شعر بزبان ریختہ امر فرمودند, واین مطلع تعلیما موزون کردہ حوالہ او نمودند:

خوبی اعجاز حسن یار گر انشا کروں

بے تکلف صفحہ کاغذ ید بیضا کروں

بالجملہ بہ یمن تفول زبان, ایشان سخن ازین بابا, چنان حسن قبول یافت کہ ہر بیت دیوانش روشن تر از مطلع آفتاب گردیدہ و ریختہ را قسمی بفصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادان آن وقت از راہ ہوش شعر ریختہ موزون می نمودند. چنانچہ قدوۃ السالکین زبدۃ الواصلین میرزا عبد القادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ نیز درین زبان غزلی گفتہ....."(۵)

ترجمہ:

شاہ ولی اللہ، ولی تخلص، شاعر مشہور ہیں، جائے پیدائش گجرات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ وجیہ الدین گجراتی سے فرزندی کی نسبت ہے جو کہ مشاہیر اولیاء میں سے ہیں، جو کہ لائق افتخار ہے۔ عالمگیر بادشاہ کے چوالیسویں سن جلوس میں ابوالمعالی کے ہمراہ کہ جن سید زادے سے ان کو تعلق خاطر ہوا دہلی تشریف لائے۔ گاہے ماہے بزبان فارسی خط و خال کی توصیف میں دو چار شعر کہتے۔ حضرت شاہ گلشن کی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آپ نے زبان ریختہ میں شعر گوئی کا حکم کیا اور بطور نمونہ بغرض تعلیم درج ذیل مطلع موزوں فرمایا:

خوبی اعجاز حسن یار گر انشا کروں
بے تکلف صفحہ کاغذ ید بیضا کروں

منجملہ حضرت کی زبان کی برکت سے اس حد تک حسن قبول پایا کہ دیوان کا ہر مطلع سے زیادہ روشن ہوا اور ریختہ میں وہ فصاحت وبلاغت دکھائی کہ اکثر اساتذۂ وقت نے سنجیدگی سے ریختہ موزوں کیا۔ چنانچہ قدوۃ السالکین، زبدۃ الواصلین میر زا عبد القادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ نے اس زبان میں غزل کہی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قائم ولی کا نام شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں اور گجرات کو ان کی جائے پیدائش بتاتے ہیں۔ وجیہ الدین گجراتی سے ان کی نسبت کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ابو المعالی کے ساتھ سفر دہلی کا سنہ بھی درج کرتے ہیں۔ یہاں دیکھنے والی بات یہ ہے کہ میر کی کہی ہوئی بات قائم کے یہاں ذرا اور ترقی کر جاتی ہے۔ میر نے "کہا جاتا ہے" کہہ کر اپنا دامن بچالیا یا پھر از روئے احتیاط اسے حتمی طور پر نقل کرنے سے محترز رہے۔ قائم نے ولی کی شاعری کو شاہ گلشن کا فیض ثابت کرنے کی کوشش کی اور ولی پر اہل دہلی کا احسان، اور اہل دہلی کا دکن کے مقابل فخر کرنے کا راستہ ہموار کیا۔ ولی کے کلام نے ہندوستانی فارسی شعرا پر جو اثر کیا اور اس سے ریختہ گوئی کے لیے جو تحریک پیدا ہوئی، قائم نے اس کا ذکر بھی کر دیا۔ قائم کا پیرایۂ بیان ایسا ہے کہ اس میں کسی نوع کی جانبداری کا شائبہ بھی نہ پایا جاسکے۔

۵۔ چمنستان شعرا

یہ تذکرہ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا تالیف کردہ ہے۔ شفیق کا علمی مرتبہ مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ آزاد بلگرامی کے فیض یافتگان میں سے تھے۔ شفیق تذکرہ نویسی کی طرف اس لیے راغب ہوئے تاکہ وہ دکن اور ہندستان کے شعرا کا جامع تذکرہ لکھ سکیں۔ اس کی تحریک انھیں میر اور گردیزی کے تذکروں سے بھی ملی۔ شفیق کا تذکرہ میر اور گردیزی کے تذکروں سے بہت زیادہ زمانی فاصلہ نہیں رکھتا۔ یہ محض دس سال کا فاصلہ ہے۔ شفیق کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر اور گردیزی کے تذکرے وہ دیکھ چکے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک دکن اور دہلی کے درمیان رابطہ باقاعدہ استوار تھا۔ ہر دو طرف کے لوگ اساتذۂ فن کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھتے تھے۔ شفیق نے تذکرے میں سابقہ تذکروں سے کسب واکتساب کا عمل فراخ دلی سے کیا ہے۔ دکنی شاعروں کے بارے میں قدرے تفصیل ملتی ہے۔ شفیق مختلف شاعروں کے

تراجم میں ان کی شعری خصوصیات پر جس طرح اظہار خیال کرتے ہیں، اس سے ان کے شعری وادبی نقطۂ نظر تک رسائی ہوتی ہے۔ شاہ مبارک آبرو، احسن اللہ احسن، ولی دکنی، میر سجاد اکبر آبادی اور سراج اورنگ آبادی کے تراجم میں ایسے کلیدی الفاظ ملتے ہیں جو کلاسیکی غزل کی شعریات کا حصہ کہے جاسکتے ہیں اور کلاسیکی شعرا کے تصور شعر و معنی تک پہنچاتے ہیں۔ موزوں خیالی، ایہام، معنیٔ تازہ و معنیٔ بیگانہ، متانت خیال جیسے الفاظ ملتے ہیں جو کلاسیکی غزل کی شعریات میں مستعمل کلیدی اصطلاحات کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ ولی کے عہد میں جس سلاست و سادگی کا رواج ہو چلا تھا اور لسانی ارتقا نے جس منزل کی طرف قدم بڑھایا تھا ،وہاں پہنچ کر دکنی سے بعد زمانی محسوس ہونے لگا تھا۔ اس بات کا احساس اہل دہلی کو کچھ زیادہ تھا۔ اس فرق کو علاقائی فرق خیال کرنے کی بجائے لسانی ارتقا سمجھنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس فرق کو شفیق نے نصرتی کے ترجمے میں نشان زد کیا ہے۔ ولی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> محمد ولی "ولی" تخلص. شاعر والا اقتدار و سخن سنج شیریں گفتار است. رتبہ سخن ریختہ در زمانش باوج کمال رسیدہ، وبازار این زبان آمیختہ در دور او گرم گردیدہ. اگرچہ در ازمنۂ ماضیہ موزونان این جا شعر را بزبان ریختہ گفتہ اند، اما صاحب دیوانے باین متانت و فصاحت از کتم عدم سو نکشید. و شعرا ے سلف چند, طوطی شکر مقال بوستان سخندانی اند, لیکن چنین بلبل ہزار داستان بگوش نہ رسید. آرے والی ولایت نازک خیالی, و شہنشاہ قلمرو خوش مقالی است. چنانچہ می گوید -:
>
> اس شعر کی یو طرح نکالا ہے جب 'ولی'
> یوں اختراع دیکھ رہے دل میں سب عجب
>
> و نیز می گوید-:
>
> دکھنی زباں میں شعر سب لوگاں کہیں ہیں اے 'ولی
> لیکن نہیں بولا ہے کوئی یک شعر خوش تر زیں نمط
>
> مولد او خاک پاک, اورنگ آباد ست, چون اکثر بگجرات در درگاہ حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہ کسب علم کردہ و در نیلی گنبد متصل گڈ مدفون گشتہ مردمان نسبت (او بگجرات) کردہ غلط محض. قصیدۂ سیزدہ اشعار کہ در اشتیاق گجرات گفتہ, بدیوان او در نظر رسید, مطلعش این ست-:
>
> گجرات کے فراق سے ہے خار خار دل

بیتاب ہے سینے منیں آتش(۶) پہار دل

مردمان نقل می کنند کہ در سورت آمدہ بود, وچندے رحل اقامت افگندہ, احرام بیت اللہ بر بست وزیارت حرمین شرفین نمود. مثنوی او در تعریف بندر مبارک سورت قریب یک صد بیت بملاحظہ افتاد در انجا می گوید-: -

بھری ہے سیرت و صورت سے سورت

ہر ایک صورت ہے واں انمول مورت

ختم ہے امرداں پر روصفائی

ولے ہے بیشتر حسن نسائی

سبھا اندر کی ہے ہر یک قدم میں

چھپا اندر سبھا کولے عدم میں

شخصت معتبر بافقیر نقل میکرد کہ روزے یکے از شعرائے دکن کہ صیت سخنش در اطراف عالم حالا بلند است, بر کنار آبے نشستہ بادہ اپیمائی می نمود. ودیگر ارکان مجلس ھم بقدر مرتبۂ خود داشت. در شب مہتاب مائل تماشا بودند, خصوصا فقیر در گوشۂ تنہا استادہ نظارہ میکرد کہ ناگاہ شاعر سرخیل در حالت سکر بادہ پیمائی آغاز نہاد وکلمات پوچ از زبانش سر زدن گرفت تا باین حد رسید کہ 'ولی' چہ طفل بود وچہ یاوہ گوئی نمودہ کہ مردمان بدو تحسین میکنند. من چنین معانی نازک و الفاظ دلچسپ در شعر خود درج کردہ ام, اما قدردان کو. اگر درین زمان 'ولی' می بود از طپانچہ رخسارش سیاہ میکردم, تا دعوی رنگین بیانی نکند. حاں بیارید دیوانش را تا از آب فروشویم. چنانچہ خادم او بموجب امر دیوان 'ولی' رابیاوردو او تمام ورق ورق رادر آب شانمود. قصہ کوتاہ چون صبح شد, وآن خمار نشہ از سر برون رفت, دیوان راطلبید کہ دیوانے تصنیف خود کہ باخط خوب وجدول طلائی تحریر کنانیدہ بود, بشب از غلطی بشوئیدن آمد و دیوان 'ولی' ھمچنان محفوظ ماند. لاچار از وقوع این امر عرق خجلت بروآمد و سخن رابلب آشناذ نمود وبہ تنہائی.. ....؟ بدرگاہ کریم کارساز کہ شکنندۂ غرور ھر متنفسے است, فرود در آمد. اما آذانکہ اھل مجلس او بودند, واقف ایں رمز اند. راست و دروغ بر گردن راوی۔ محرر سطور بموجب اقرار راوی بہ بیاض رساند. واللہ اعلم. کلیاتش دوہزار و سی صد ابیات بنظر رسید۔"(۷)

ترجمہ :

محمد ولی، ولی تخلص، شاعر بلند اقتدار اور سخن سنج شیریں گفتار. اپنے زمانے میں ریختہ کو درجہ کمال تک پہنچایا. اس ملی جلی زبان کی بڑی گرم بازاری رہی. گرچہ اگلے زمانہ میں اس علاقہ کے شاعروں نے ریختہ میں

اشعار کہے ہیں مگر ایسا صاحب دیوان متانت اور فصاحت کے ساتھ کوئی نہ ہوا۔ اگلے شعرا طوطی شکر مقال تو تھے مگر ایسا بلبل ہزار داستان سننے میں نہ آیا۔ نازک خیالی اور خوش مقالی کے ملک کے بادشاہ ہیں۔ خود کہتے ہیں:

دکھنی زباں میں شعر سب لوگاں کہیں ہیں اے ولی
لیکن نہیں بولا ہے کوئی ایک شعر خوش تر زیں نمط

ان کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ چونکہ زیادہ تر درگاہ حضرت شاہ وجہیہ الدین واقع گجرات میں رہ کر تعلیم حاصل کی اور گڈھ کے متصل نیلی گنبد میں مدفون ہوئے۔ اس لئے لوگوں نے غلطی سے ان کو گجراتی منسوب کر دیا۔ تیرہ اشعار کا ایک قصیدہ گجرات کے اشتیاق میں ان کے دیوان میں دیکھا۔ ابتدا یہ ہے ,

گجرات کے فراق سے ہے خار خار دل

لوگ کہتے ہیں کہ سورت آئے تھے اور کچھ دنوں قیام کیا تھا۔ فریضہ حج بھی ادا کیا تھا۔ سورت کی بندرگاہ کی تعریف میں ایک مثنوی قریب ایک سو اشعار کی دیکھی۔ اس میں لکھتے ہیں:

ایک معتبر شخص نے نقل کیا ہے کہ ایک روز دکن کے ایک شاعر جن کی شہرت تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے, دریا کے کنارے بیٹھے بادہ نوشی کر رہے تھے۔ دوسرے ارکان مجلس بھی اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق بیٹھے چاندنی رات میں محو تماشا تھے۔ یہ فقیر بھی ایک گوشہ میں تنہا کھڑا دیکھ رہا تھا کہ ناگاہ یہ شاعر صاحب حالت نشہ میں اول فول بکنے لگے اور یہاں تک کہہ گئے کہ ولی ایک لونڈا کیا مہمل بکتا ہے کہ لوگ اس کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔ میں نے ایسے ایسے معانی نازک اپنے اشعار میں دلچسپ الفاظ کے ساتھ قلمبند کیے ہیں لیکن اس کا قدردان کون ہے ؟اگر ولی اس زمانہ میں ہوتا تو طمانچہ مار مار کر اس کا گال سیاہ کر دیتا تاکہ رنگین بیانی کا دعوی نہ کرتا۔ہاں ذرا کوئی اس کا دیوان تو لے آؤ تاکہ اس کو پانی میں ڈال دیں۔ چنانچہ اس کے خادم نے حکم کے مطابق دیوان ولی لا کر دیا اور اس نے ایک ایک ورق کو دریا میں ڈال دیا۔ الغرض جب صبح ہوئی اور نشہ اترا تو اپنے خادم کو بلا کر حکم دیا کہ اپنا وہ دیوان جو خوشخط اور سنہرے جدول کا لکھا ہوا تھا لائے۔ پتہ چلا کہ کل شب کو غلطی سے وہی دیوان دریا برد ہوا اور دیوان ولی اسی طرح محفوظ رہا۔ اس کو بڑی ندامت ہوئی۔ پھر شاعری ترک کر دی اور تنہائی میں خدا کی درگاہ میں سر بسجود ہو کر اپنے غرور کی معافی چاہی۔ جو لوگ اس مجلس میں تھے وہ اس واقعہ سے واقف ہیں۔ دروغ بر گردن راوی۔ راقم نے راوی کی زبانی نقل کر دیا واللہ اعلم۔ ان کا کلیات جس میں دو ہزار تین سو اشعار ہوں گے نظر سے گزرا۔"(۸)

شفیق ولی کا نام محمد ولی بتاتے ہیں اور گجرات اور اورنگ آباد کی وطنی نسبتوں میں اورنگ آبادی نسبت کو درست قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بات انھوں نے قائم کے تذکرے میں ترجمۂ ولی میں درج باتوں کے رد میں کہی ہو۔ میر اور گردیزی کے تذکرے سے انہوں نے استفادہ کیا، بعید نہیں کہ قائم کا تذکرہ بھی ان تک پہنچا ہو۔ ولی کی نسبتی کشمکش سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ولی اپنی وفات کی تھوڑے دنوں بعد ہی دبستانی نزاع کا موضوع بن گئے تھے۔ میر کا تذکرہ پیش نظر رکھنے کے باوجود ولی کے سفر دہلی کی روایت کو حمید اورنگ آبادی کی طرح شفیق بھی بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔

۶۔ تذکرہ شعرائے اردو:

یہ تذکرہ میر حسن کا ہے۔ اس سے پہلے اردو کے کئی تذکرے لکھے جا چکے تھے۔ میر حسن نے شعرا کے کلام پر اجمالی تاثرات پیش کیے ہیں، ان کے یہاں تضحیک یا ذم کا پہلو نہیں ہے بلکہ نہایت معتدل انداز میں شعرا کے بارے میں رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ یہ آراء فنی مرتبے، رجحان و میلان کی آئینہ دار ہیں۔ میر حسن شعرا کے قابل تعریف پہلو پر ہی اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے بلکہ وہ ان اوصاف کو بھی اپنے مختصر جملوں میں بیان کر دیتے ہیں، جو ان کی رو سے شعری معائب کے زمرے میں آتے ہیں۔ میر حسن پر میر اور قائم کی تذکرہ نویسی کا اثر صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حقائق اور معلومات کا خانہ میر حسن کے یہاں کمزور ہے ۔ کئی ایسی معلومات جو زمانی قرب کی وجہ سے مفصل و متحقق لکھی جا سکتی تھیں، وہ بالکل غلط درج ہوئی ہیں۔ زبان میں سادگی اور سلاست کی جگہ مرصع کاری کو ترجیح دی ہے۔ ولی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> از سلک متقدمین غفر اللہ لہم, درویش خفی و جلی, شاہ ولی اللہ, المتخلص بہ ولی, مشہور و معروف مردے بود از خاک گجرات. بریک صنمے عاشق شدہ, در وقت محمد عالمگیر بہ ہندوستان جنت نشاں آمدہ' در خدمت شاہ گلشن, قدس اللہ سرہ. استفادہ حاصل نمودہ, از توجہ آں بزرگوار مقبول اعلیٰ وادنیٰ گردید. تعریفش از احاطۂ تحریر و تقریر بیرون ست. بنائے ریختہ را چنیں مستحکم نمود کہ الحال از بلندی طاق سپہر افزود. چوں دکنی ست اکثر بہ زبان خود حرف زدہ ست. ابتدائے ریختہ از وست, اول استادی ایں فن بہ نام اوست۔"(۹)

ترجمہ :

> متقد مین غفر لہم اللہ کے سلسلے درویش خفی و جلی شاہ ولی اللہ۔ تخلص ولی، سر زمین گجرات کے مشہور و معروف شخص ہوئے۔ ایک صنم پر عاشق ہوئے، محمد عالمگیر کے زمانے میں ہندستان جنت نشان آئے، شاہ گلشن کی خدمت (میں حاضر ہو کر) استفادہ حاصل کیا۔ آں بزرگوار کی توجہ سے اعلیٰ وادنیٰ میں مشہور ہوئے۔ آپ کی تعریف احاطۂ تحریر و تقریر سے باہر ہے۔ ریختہ کی بنیاد کو اتنا مستحکم کیا کہ اس کی بلندی طاق آسماں پر پہنچی۔ دکنی ہیں اور اکثر اپنی زبان بولتے ہیں۔ ان سے ریختے کی ابتدا ہے۔ اس فن کے اولین استاد کے طور پر ان کا نام آتا ہے۔

ولی کے باب میں میر حسن قائم چاند پوری سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ قائم کی طرح وہ ولی کی نسبت گجرات سے متعلق کرتے ہیں۔ نام شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔ سفر دہلی اور شاہ گلشن والی روایت کا بطور خاص ذکر کرتے ہیں۔ ریختہ گوئی کے ولی سے تحریک پانے والی بات بھی نقل کرتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ قائم کا ترجمۂ ولی قدرے تلخیص کے ساتھ میر حسن کے یہاں موجود ہے۔

۷۔ طبقات الشعراء

یہ قدرت اللہ شوق کا تذکرہ ہے۔ اس تذکرے میں شوق نے مختلف تذکروں کا ذکر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان تذکروں سے استفادہ کیا ہوگا۔ مصحفی، میر اور محمد یار خاکسار کا ذکر طبقات الشعراء میں موجود ہے۔ شعرا کے تراجم کا تقابل دوسرے تذکروں سے استفادے کو ظاہر کرتا ہے۔ تذکروں کے علاوہ شوق کی معلومات کا ماخذ ان کی اپنی مجلسی زندگی کے مشاہدات ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے سیاحت پسند احباب و رفقا، اور دوسرے شناساؤں کے ذریعہ خط و کتابت سے ملنے والی معلومات کو بھی استعمال کیا ہے۔ ہم عصر شعرا کے بارے میں شوق کی معلومات جامع معلوم ہوتی ہیں۔ ولی کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ولی کہ مروج فن ریختہ, جوانے بود متوطن اورنگ آباد کہ شہریست معروف از ولایت دکھن, مزاج آزادانہ, مشرب رندانہ, فکر صائب و ذھن مناسب, طبع سلیم وذھن مستقیم داشت ودش از محبت دنیا خالی بود, بر سید پسرے مسمی بہ سید ابوالمعالی کہ در حسن و خوبی بے نظیر و بے تمثیل بود, عشق و میل خاطر تمام داشت. ھر چند سید موصوف اعزاز تمام و حسن سلوک و تواضع و اکرام کہ طریقۂ وفا و شیوۂ اخلاص محبوبان راسخ الاخلاص است, می پرداخت۔ فاما شاعر مسطور نسبت عشقی را کہ فی الحقیقۃ نسبت معبودیت و عبودیت می تواں گفت, ملاحظہ نمودہ اکثر شکار بند او در دست گرفتہ در رکاب سعادت او در حضر و سفر دائماً می ماند, ھر چند کہ منع می فرمود فاما از

خدمت گزاریش اعراض نمی نمود, همچو مسموع است که در هندوستان جنت نشان که عبارت است از شاہجہان آباد دھلی نیز بہ طریق سیر آمدہ بود روزے بہ حسب اتفاق بہ خدمت شاہ گلشن کہ مقتدائے وقت خود بود مستفید شد. شاہ موصوف فرمود کہ شما زبان دکھنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوے معلاے شاہجہان آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت ورواج و مقبول خاطر صاحب طبعان عالی مزاج گردد و خود بہ زبان شریف تبرکاً غزلے تازہ کہ داخل دیوان اوست گفتہ داد, مطلعش اینست, مطلع :

خوبی اعجاز حسن یار اگر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

ترجمہ:

ولی فن ریختہ کو رواج دینے والے اورنگ آباد کے متوطن جوان تھے جن کی شہرت ملک دکن سے معروف ہے۔ ان کا مشرب رندانہ، فکر صائب، ذہن متناسب، طبع سلیم اور ذہن سلجھا ہوا تھا، وہ دنیا کی محبت سے خالی تھے۔ سید زادے مسمیٰ سید ابوالمعالی جو کہ حسن و خوبی میں بے نظیر و بے مثال تھے، عشق و میلان خاطر تمام و کمال رکھتے تھے۔ ہر چند کی سید صاحب نے جیسا کہ راسخ الاخلاص محبوبین کا طریقۂ وفا و شیوۂ اخلاص رہا ہے پوری طرح اعزاز، تواضع، اکرام اور حسن سلوک کا معاملہ فرمایا۔ کہتے ہیں کہ شاعر مذکور کے عشق کی نسبت فی الواقع عبودیت و معبودیت کی نسبت ہے۔

یہ دیکھا گیا کہ وہ ایں سعادت کے سفر و حضر میں ہمیشہ شکار بند کے ساتھ حاضر رہتے، حضرت کے منع فرمانے کے باوجود انھیں ایسا کرنے سے اعراض نہ ہوا۔ ایسے ہی یہ بات بھی سنی گئی ہے کہ ہندستان جنت نشان جو کہ شاہجہان آباد دہلی سے تعبیر کیا جاتا ہے، بواسطے سیر و سیاحت آئے۔ ایک دن حسب اتفاق مقتدائے وقت شاہ گلشن کی خدمت میں (حاضر ہو کر) مستفید ہوئے۔ شاہ موصوف نے فرمایا کہ دکنی زبان ترک کر کے اردوئے معلا شاہجہان آباد کے ریختے کے موافق (کلام) موزوں کر کہ عالی طبع اور صاحبان ذوق میں رواج و شہرت پانے کا موجب ہو۔ اپنی زبان شریف سے تبرک کے طور پر تازہ غزل ارشاد فرمائی کہ دیوان میں داخل ہے۔ اس کا مطلع ہے۔

خوبی اعجاز حسن یار اگر انشا کروں

بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

یہاں کچھ منتخب اشعار دیئے گئے ہیں جس میں ایک شعر پر مولف نے کلام کیا ہے،وہ یہ ہے۔

ہر شب تری زلف سے مطول کی بحث تھی

تیرے دہن کو دیکھ سخن مختصر کیا

ہر چند دریں فرد تناسبات شاعری بوجہ احسن جمع نمودہ فاما از دل شکنی زلف پریشانیٔ تمام روے می دھد. پس ازیں جاست کہ "الانسان مرکب من السھو والنسیان "شاید کہ از پریشانی خاطر چنیں خطا کہ بوے آں تا بہ ختن رسیدہ از خاطر پریشان او راہ یافتہ والا ایں قدر غلطی فاش از چنیں اشخاص چہ معنی دارد۔"

"باوجودیکہ اس شخص کے یہاں کئی طرح کے شاعرانہ تناسبات بطریق احسن مجتمع ہیں۔دل شکنی کی رو سے تو زلف کی پریشانیٔ تمام کی صورت ظاہر ہوتی ہے۔پس یہاں پر یہ کہ انسان بھول چوک کا پتلا ہے،شاید پریشان خاطری کے سبب یہ غلطی ہوئی،یہ بوئے ختن پریشان خیالی کے سبب راہ یاب ہوئی ورنہ ایسے اصحاب کے یہاں اس قدر فاش غلطی کے کیا معنی ہیں۔"(۱۰)

قدرت اللہ شوق کے تذکرے میں ولی کی وطنی نسبت، مزاج، میلان طبع وغیرہ کا ذکر ہے۔ولی کی شاعری پر تعبیری انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ولی کے سلسلے میں ان کا ترجمۂ ولی میر اور قائم دونوں سے ہی متاثر معلوم ہوتا ہے۔شوق نے کچھ باتیں میر سے اخذ کیں اور دوسری چیزیں انھوں نے قائم سے لیں، بلکہ اس میں اضافہ ہی کیا۔شوق کے یہاں دہلی اور دکن آمنے سامنے آگئے ہیں۔زبان کا معیار باقاعدہ شاہجہاں آباد کی زبان قرار پائی ہے اور میر کی کہی ہوئی بات قائم سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔

۸۔تذکرۂ شورش

یہ تذکرہ میر غلام حسین شورش عظیم آبادی کا تالیف کردہ ہے۔اس تذکرے کے دو نسخے شائع ہوئے۔ایک پروفیسر کلیم الدین احمد نے شائع کیا جو نسخۂ آکسفورڈ پر مبنی ہے اور دوسرا خانقاہ رشیدیہ جون پور کے کتب خانے سے حاصل ہوا۔یہ نسخہ محمود الٰہی نے مرتب کرکے شائع کیا۔حنیف نقوی نے اس آخر الذکر نسخے کو داخلی شواہد کی بنا پر قدیم تر مانا ہے۔نیز اول الذکر نسخے کو جا بجا تحریف و ترمیم کا شکار قرار دیا ہے۔(ص،۳۴۲و۳۴۳) اس تذکرے کی تالیف کا محرک عظیم آباد میں شعر و سخن کی محفلیں

بنیں کہ وہاں کے شاعروں کے احوال نہیں لکھے گئے تھے۔ گو یہ عظیم آباد کی دبستانی حیثیت کو روشنی میں لانے اور اسے قائم کرنے کی ایک کوشش تھی، دبستان عظیم آباد جو شاعروں کے وجود اور علاقے میں ان کی سرگرمی کی وجہ سے ایک الگ دبستان قرار پایا ورنہ اس کی لسانی اور اسلوبیاتی ترجیحات شاہجہان آباد کے تابع تھیں اور وہ زبان اردوئے معلیٰ کا پیرو تھا۔ اس بات کا اندازہ شورش کے تذکرے سے لگایا جاسکتا ہے۔ (تذکرۂ شورش، ص ۶۹و۷۰) ولی کے بارے میں شورش لکھتے ہیں:

> واقف رموز خفی وجلی ولی. اسم با مسمیٰ بود, صاحب دیوان می گویند کہ در شاہجہاں آباد آمدہ بود, بخدمت حضرت شاہ..... واز اشعار خود پارۂ خواندہ۔ چیزے در حق ولے فرمودند. چناں شہرت یافتہ کہ احتیاج تعریف ندارد. حق تعالیٰ رحمت کند۔ مقبول ولی اللہ بود. سخن او قبولیت کلی دارد. "(۱۱)

ترجمہ:

>)ولی) رموز خفی وجلی سے واقف اسم با مسمیٰ ہیں۔ صاحب دیوان ہیں کہا جاتا ہے کہ شاہجہان آباد حضرت شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔۔۔۔ اور اپنے اشعار سے کچھ پڑھ کر ولی کے حق میں کچھ فرمایا۔ یہ مشہور ہیں، ان کی تعریف کی حاجت نہیں۔ حق تعالیٰ رحمت کرے۔ مقبول ولی اللہ ہوئے۔ سخن نے پوری طرح قبولیت پائی۔

ولی کے بارے میں شورش کا یہ ترجمہ نکات الشعرا سے مستعار معلوم ہوتا ہے۔ قائم کی بیان کردہ تفصیل بھی یہاں موجود نہیں ہے۔ "می گویند" کا لفظ بالکل میر کی طرح یہاں بھی موجود ہے۔ ولی کو شورش اس قدر مشہور کہتے ہیں کہ انھیں ولی کے تعارف اور تعریف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ میر ان کے برخلاف ولی کے احوال کو نامعلوم بتاتے ہیں یعنی ولی کے احوال جس حد تک معلوم ہونے چاہیے تھے، ادبی معاشرے کے علم میں نہ تھے۔ یا پھر کوئی اور وجہ تھی کہ کچھ ان کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے ان کی تفصیلات کو درج کرنا ضروری خیال نہ کیا، اگر ایسا ہے تو پھر میر سے ولی کا زمانہ بہت زیادہ بعد کا نہیں ہے۔ اگر ۱۷۰۷ء ولی کا سنہ رحلت ہے تو میر اس کے سولہ سالہ بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور سن شعور کو پہنچتے پہنچتے بہر کیف وہ ولی کے بارے میں بہت ساری باتوں سے آگاہ تو ہو ہی گئے ہوں گے۔ پھر انھوں نے ستائیس اٹھائیس سال کی عمر میں جو تذکرہ ترتیب دیا، اس میں ولی کے احوال سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیوں کیا۔ ممکن ہے میر نے بوجوہ ولی کے معلوم احوال نہ لکھے ہوں یا پھر ان کے احوال واقعی معلوم نہ رہے ہوں۔ اس آخر الذکر نتیجے کو تسلیم کر لینے پر ہمیں شورش کے اس قول کی توجیہ یہ کرنا ہوگی کہ تعریف سے ان کی مراد ولی کے کلام کی عوامی مقبولیت ہے۔ لوگ ان کے شعری وفنی محاسن سے خوب خوب واقف تھے۔ اگر

ایسا ہے تو میر کے یہاں ولی کی شاعری پر تبصراتی جملے یا اس پر واضح رائے کیوں موجود نہیں ہے ؟ یہ سوال بہر صورت باقی رہتا ہے۔

۹۔ تذکرہ مسرت افزا:

تذکرہ "مسرت افزا" ابوالحسن امیر الدین احمد معروف بہ امراللہ الہ آبادی کا تالیف کردہ ہے۔ تذکرہ نگار نے احوال اور معلومات کے تحریر کرنے میں یادداشت کے ذخیرے پر انحصار کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں کے حوالے درج کیے ہیں۔ "مسرت افزا" میں نکات الشعرا، سرو آزاد، گلشن راز، تذکرہ شعرائے اردو سے خوشہ چینی بھی ملتی ہے۔ امراللہ الہ آبادی میر کے تذکرہ نکات الشعرا کی بہت زیادہ تحسین نہیں کرتے۔ ان کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس تذکرے میں جانب داری کے عناصر کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ شعرائے ریختہ کے کلام پر میر کی نکتہ چینی کو عجب کہتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میر ہر شاعر کے شایان شان اس کے اشعار نقل نہیں کرتے بلکہ اس کے بے رتبہ اور ناپسندیدہ اشعار درج کرتے ہیں۔ اس تذکرے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مختلف علاقوں اور صوبوں کے شاعروں کے احوال اور نمونے مندرج ہیں۔ جیسے دکن میں گجرات، اورنگ آباد وغیرہ اور ہندستان میں دہلی، لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، عظیم آباد، مرشد آباد، کلکتہ وغیرہ۔ ولی کے بارے میں امراللہ الہ آبادی لکھتے ہیں:

> محمد ولی، ولی تخلص مظہر کمالات خفی وجلی، مجمع فضائل کماہی، عارف اہل دل ولی کامل در دکھن پر تو ظہور گرفتہ واز بدو شعور درآں ممالک کوس یکتائی نواختہ گویند بشاہجہاں آبادو نیز آمدہ در خدمت شاہ گلشن کہ گلشن اخلاق واوصاف بود ارادت بہم رسانیدہ روزے پارۂ از اشعار خود روبروے آں بزرگوار خواند و محظوظ ساخت ۔ایشاں فرمودند کہ مضامین فارسی بسیار بیکار افتادہ اند تو درزبان ریختہ بکار برا کہ، آں از محاسبہ خواہد گرفت ۔راست دروغ بر گردن راوی ۔الغرض اصل ریختہ از دکھن است ودر آں دیار ولی موجد ایں ایجاد تازہ شد ۔بعد از آں سخنوران ہندوستان گفتہ گفتہ بایں روش آراستہ تاہم کلامش تا حال بر صفحۂ روزگار ثبت است واستادیش بر صفحۂ دلہاے سخنوران ثابت اشعارش از اشتہار بحدے رسیدہ کہ گوش احدے راازاں بہرہ نیست (۱۲)"

> محمد ولی ۔ولی تخلص۔ خفی وجلی کمالات کے مظہر ۔ مجمع فضائل ۔عارف ۔اہل دل، دکھن میں پیدا ہوئے اور آغاز شور سے ان ملکوں میں یکتائی کا نقارہ بجاتے رہے ۔ کہتے ہیں کہ شاہجہاں آباد آئے تھے شاہ گلشن کی

> خدمت میں، جو کہ اخلاق و اوصاف کے گلشن تھے، ارادت پیدا کی۔ ایک دن اپنے کچھ شعر ان بزرگوار کے سامنے پڑھے اور ان کو محظوظ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ فارسی کے بہت سے مضامین بے کار پڑے ہوئے ہیں، تم زبان ریختہ میں ان کو کام میں لاؤ۔ کون تم سے حساب کرے گا۔ سچ جھوٹ راوی کی گردن پر، الغرض ریختہ کی اصل دکھن سے ہے اور وہاں اس تازہ ایجاد کے موجد ولی تھے۔ اس کے بعد ہندوستان کے سخنوروں نے اپنے کلام کو اس روش سے آراستہ کیا۔ ان کا کلام آج تک زمانے کے ورق پر لکھا ہوا ہے اور ان کی استادی سخنوروں کے دلوں پر نقش ہے۔ ان کے اشعار اس حد تک مشہور ہو چکے ہیں کہ کوئی کان ان سے ناآشنا نہیں۔ (تذکرہ مسرت افزا۔ مترجم، مجیب قریشی، مطبع: لاہور پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۸ء، ص:۲۵۰و ۲۵۱)

امراللہ الہ آبادی نے "مسرت افزا" میں کئی اہم باتیں کہیں۔ انھوں نے میر کی روایت کردہ شاہ گلشن والے واقعہ کے بارے میں کہا کہ راست دروغ بر گردن راوی۔ یعنی سب سے پہلے امراللہ الہ آبادی نے اس واقعہ کی اصلیت اور صداقت پر سوال اٹھایا۔ اپنے زمانے کے عام قاعدے کے مطابق وہ براہ راست معترض نہیں ہوسکتے تھے، کیوں کہ امراللہ الہ آبادی کے نزدیک عیب کو نمایاں کرنا بھی عیب میں شمار ہوتا تھا۔ رواداری کے وہ بڑے قائل تھے۔ میر نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا، اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات ان کے لیے بھی سنی سنائی ہے۔ میر کی نیت پر کیسے شک کیا جاسکتا ہے۔ اور ان کے تذکرے میں درج شاعروں کے احوال کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں میر نے اگر کسی رقابت کے جذبے کو قبول نہیں کیا تو وہ بالکل غیر جانب دار بھی نہ تھے۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ میر صاحب ولی کے فنی مرتبے سے آگاہ تھے اگرچہ ان کے فن پر مفصل روشنی ڈالنے میں انھیں تردد تھا۔ اب امراللہ الہ آبادی کی میر پر تنقید اور شعرا کے تراجم میں میر کے طریقۂ کار پر مدلل نکتہ چینی یہ بتاتی ہے کہ میر کی روش ان کی زندگی ہی میں اہل شعر و فن کو نامرغوب تھی۔ گردیزی، شفیق اور پھر امراللہ کے تذکرے اس بات کو اور زیادہ متحقق کرتے ہیں۔ امراللہ الہ آبادی کا خاموشی سے ایک فقرہ اس سلسلے میں ٹانک دینا (جب کہ وہ ایک محتاط تذکرہ نویس ہیں)، یہ بتاتا ہے کہ وہ اس روایت سے بہت زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ حمید اورنگ آبادی، گردیزی اور شفیق کی خاموشیاں اس روایت کو اور زیادہ مشکوک بناتی ہیں۔ امراللہ الہ آبادی ریختے کی اصل دکن سے بتاتے ہیں۔ ریختے کا جو نیا طور ایجاد ہوا، اس کا سلسلہ ولی سے قائم کرتے ہیں۔ اور ولی کو ریختے کے نئے طور کے موجد لکھتے ہیں۔ ہندستان کے سخن ور ولی کے بعد ہی اس راستے پر چلے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شمالی ہند میں ولی کی شاعری کے بعد ان کی پیروی میں اردو شاعری قائم ہوئی۔

۱۰۔ گلزار ابراہیم:

یہ تذکرہ علی ابراہیم خاں خلیل کا تالیف کردہ ہے۔ تذکرہ نگار نے اپنے پیش روؤں کے تذکروں سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے اور اس استفادے کا ذکر نہیں کیا۔ تذکرے میں احوال کے اندراج سے زیادہ اشعار کی تلاش و جستجو پر توجہ صرف کی گئی ہے۔ بہت سے مقامات پر صرف شاعر کا نام و تخلص درج کر کے اس کے احوال سے لاعلمی کا اعتراف کر لیا گیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ایسے جملے بھی مؤلف نے لکھے ہیں، جو زیر بحث شاعر کی شخصیت یا فن کے کسی پہلو کو سمجھنے میں مدد گار ہیں۔ تذکرہ کا تنقیدی پہلو اگرچہ بہت بلند نہیں تو ایسا بھی نہیں ہے کہ لائق ذکر ہی نہ ہو۔ عظیم آباد اور مرشد آباد کے شعر و سخن کے باب میں اس تذکرے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ولی کے بارے میں خلیل رقم طراز ہیں:

> ’’ولی۔ دکھنی شاہ ولی اللہ۔ اصلش گجرات۔ در شعرائے دکن مشہور و ممتاز ست۔ گویند در زمان عالمگیر بادشاہ بہ ہندوستان آمدہ مستفید از شاہ گلشن گردید۔ از مشاہیر ریختہ گویاں، و اول کسے ست کہ دیوانش در دکھن مشتہر و مدون گشتہ ایں ابیات منتخب دیوان اوست۔ ۶۰ شعر۔‘‘(۱۳)

ترجمہ:

ولی دکنی ہیں، شاہ ولی اللہ (نام) اصل ان کی گجرات کی ہے۔ شعرائے دکن میں مشہور و ممتاز ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عالم گیر بادشاہ کے زمانے میں ہندستان آئے اور شاہ گلشن سے استفادہ کیا۔ یہ مشہور ریختہ گویوں میں سے ہیں۔ سب سے پہلے ان کا دیوان دکھن میں مدون و معروف ہوا۔

یہاں ہم ان کے وطن کی جگہ ان کی اصل یعنی پشتینی جگہ پر گجرات کا ذکر پاتے ہیں یعنی حتمی طور پر یہ نہیں بتایا ہے کہ ولی بھی بذات خود گجرات سے ہیں یا نہیں۔ شاہ گلشن والی روایت کے ساتھ می گویند کا لفظ لگا ہے ساتھ استفادے کی نوعیت کا تعین نہیں ہے اور نہ ہی فارسی کے مضامین کو نظم کرنے کا ذکر ہے۔

۱۱۔ گلشن سخن

یہ تذکرہ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی کی تالیف ہے۔ اس کی مطبوعہ صورت مسعود حسن رضوی ادیب کی مرتب کردہ ہے۔ یہ دو نسخوں کی مدد سے مرتب ہوا۔ ایک نسخہ مسعود حسن رضوی ادیب کے ذاتی کتب خانے میں ہے اور دوسرا نسخہ رام پور رضا

لائبریری میں۔ مسعود حسن رضوی کا نسخہ ناقص الطرفین ہے۔ دوسرا نسخہ کاتب کی تحریفات کی وجہ سے مکمل ہوتے ہوئے ناقص رہ گیا۔ اس تذکرے کے بارے میں حنیف نقوی کی رائے ہے کہ گلشن سخن میں مبتلا نے گلزار ابراہیم سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ "تذکرۂ شورش" بھی مبتلا کا اہم ماخذ ہے۔ ولی کے بارے میں مبتلا لکھتے ہیں:

> ولی دکھنی اسمش شاہ ولی اللہ در شعرائے دکھن مشہور و ممتاز. اول کسے است کہ دیوان او در دکھن اشتہار یافت و رواج ریختہ داد. در فصاحت و روانی کلامش مشتہر است. دیوان بلاغت بنیانش سہ ہزار بیت در نظر است. از منتخبات ابیات شستہ وصاف اوست." (۱۴)

ترجمہ:

ولی دکنی نام شمس ولی اللہ شعرائے دکن میں مشہور و ممتاز ہیں۔ پہلے ان کا دیوان دکن میں مشہور ہوا اور ریختہ کو رواج دیا۔ ان کے کلام کی فصاحت وروانی مشہور ہے۔ بلاغت پر بنیاد رکھنے والے دیوان میں تین ہزار اشعار دکھتے ہیں۔

۱۲۔ گلشن ہند

یہ تذکرہ بظاہر تو گلزار ابراہیم کے ترجمے کے نام سے مشہور ہے لیکن مرزا علی لطف نے ترجمے میں کئی اضافے کیے ہیں، اس سے گلزار ابراہیم سے اس کی ماہیت بہت کچھ تبدیل ہو گئی ہے۔ ولی کے سلسلے میں گلزار ابراہیم میں "زبان ہندی" کا فقرہ نہیں ہے اور یہاں زبان ہندی میں سب سے پہلے دیوان جمع کرنے کی بات ملتی ہے۔ سرزمین دکھن میں ریختہ کو رواج دیا۔ یعنی شمالی ہند میں ریختہ کو رواج دینے میں ولی کا کوئی کردار نہیں ہے؟ تذکرہ گلزار ابراہیم میں شاہ گلشن سے کسب فیض اور استفادہ کا ذکر ملتا ہے، اور یہاں فیض خدمت سے انواع واقسام کا فائدہ اٹھانے کی بات کہی گئی ہے۔ اس فیضیابی کی نوعیت یہاں بھی بہت واضح نہیں ہے۔ می گویند کا ترجمہ نہیں ہے یعنی اس بات کو مرزا علی لطف ہو بہو قبول کرتے ہیں۔ اسی اختلاف کی وجہ سے یہاں "گلشن ہند" کو بطور تذکرہ شمار کیا گیا ہے۔ مرزا علی لطف ولی کے بارے میں کہتے ہیں:

> ولی تخلص، شاہ ولی اللہ نام، دکھنی. وطن بزرگوں کا اس کے گجرات ہے. شاعر بلند مقام تھا. اول زبان ہندی میں دیوان اس عزیز نے جمع کیا ہے اور نظم ریختہ کو سرزمین دکھن میں رواج اس نے دیا ہے. شعراء دکن میں مشہور و ممتاز ہے اور اپنے معاصروں میں سربلند اور سرفراز. عالمگیر بادشاہ کی سلطنت میں ہندوستان کی

طرف آیا اور میاں گلشن کے فیض خدمت سے فائدہ انواع و اقسام کا اٹھایا. خوب خوب داد تلاش معنی کی دی.
آخر اس بیت بے معنی وجود سے راہ کاشانۂ عدم کی لی." (۱۵)

۱۳۔ مجموعۂ نغز:

یہ تذکرہ قدرت اللہ قاسم کی کاوش ہے، جو بڑے صاحب علم و فضل تھے۔ یہ تذکرہ ۱۹۳۳ میں محمود شیرانی کا مرتب کردہ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے چھپا۔ اس تذکرے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر ردیف کے آغاز میں اس کے تحت آنے والے شاعروں کی تعداد بتادی گئی ہے۔ ہم تخلص شعرا کو ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے تاکہ کوئی شبہ نہ رہے۔ اساطین شاعروں کے نام کے ساتھ ہم وزن بامعنی فقرے کا اہتمام کیا ہے۔ قدرت اللہ قاسم سے پہلے جو تذکرے لکھے گئے ان میں سے بیشتر ان کے پیش نظر رہے ہوں گے، اس بات کا اندازہ ان اعتراضات سے ہوتا ہے جو انھوں نے تذکروں اور معلومات کی صحت پر کیے ہیں۔ ولی کا ترجمہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے :

ولی تخلص سخن سنج شان جلی المشہور بہ محمد ولی است وے عزیزے بود از سکنہ دیار دکن و مریدان شاہ سعد اللہ گلشن علیہما الرحمت وا[لغفرا]ن وامر ہما اللہ تعالے فی روضات الجنان گوئند نسبت تلمذ ہم بجنات ایشان داشت و در [آخرہا] باستصواب شاں ہمت بہ سخن طرازی می گماشت والعلم عند اللہ [تعالے شا] نہو عظم برہانہ بہر حال بآئینی کہ از قدوہ متغزلاں سخن پرداز شیخ شیراز قدس سرہ رویہ غزل از کتم عدم بمنصہ ظہور جلوہ گر شد تدوین دیوان ریختہ مردف و [مملو] انواع سخن و مشحون اقسام امور [این فن ازوے] بصفحہ روزگار ثبت افتاد اگرچہ اشعار متفرقہ ریختہ پیش ازوے ہم علی الاختلاف الروایتین از طبع دربار بلبل خوش نواے گلزار قدس عندلیب دستاں سراے ہمیشہ بہار انس خسرو سخن سنجان طوطی ہندوستان مظہر عشق حضرت اویس محمد کاسہ لیس قدس سرہما و روح روحہما سلطان نکتہ پردازی گیہاں خدیو سخن سازی [قد]وہ متغزلان پیشوا ے صاحبدلان صو[فی]صافی منش درویش پاکیزہ روز شیخ صاحب درد زبدۂ حضرات سہروردیہ بادشاہ قلمرو بے نیازی سعدی شیرازی اسکنہ اللہ بحبوحۃ الجنان یا سعدی دکنی علیہ الرحمت والغفران و دیگر سخن سنجان ہم ریختہ اما تدوین جملگی انحاء شعر ازوے بظہور پیوستہ مختصر کلام [حقش بر جملہ] سخن پردازان ہندی زبان ثابت است و سخن بر سخنش ابلیس منشی و شیطنت میر خان کمترین کہ خداش بیامرزد بسیار بموقع و بجا گفتہ کہ ع

ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں

> قطع نظر از زبان دکنی شعرش بمرتبۂ اعلی شاعری و سخنش بدرجہ علیا[ے سخنور]ی است قصہ کوتاہ یک صد و نو دو چار شعر از اشعار آبدار اس استاد والانژا[دمی] نگارم منہ عفی اللہ عنہ۔"(۱۶)

قدرت اللہ قاسم کے تذکرے سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ان میں سے بیشتر پہلے سے چلی آتی ہیں۔ نام،وطن، تخلص، شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات وغیرہ کا ذکر قاسم کرتے ہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ والعلم عند اللہ کہہ کے وہ اس واقعے کے سلسلے میں امر اللہ کے دروغ والے فقرے سے ذرا نرم تاثر اس واقعے کی صداقت پر ظاہر کرتے ہیں۔ گویند اور والعلم عند اللہ کا اجتماع بتاتا ہے کہ وہ بھی اس روایت پر بہت زیادہ مطمئن نہ رہے ہوں گے۔ قاسم ولی کو شیخ سعدی شیرازی کے سلسلے میں شمار کرتے ہیں اور زبان دکنی سے قطع نظر کرتے ہوئے ولی کی شاعری کو اعلی مرتبے اور ان کے سخن کو اعلیٰ درجے پر فائز پاتے ہیں۔

۱۴۔ تذکرۂ عشقی:

یہ تذکرہ شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی کا تالیف کردہ ہے۔ تذکرہ نگار نے تضاد، الجھاو اور خلط مبحث جیسے اسقام سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔ عشقی ولی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> شاہ ولی اللہ۔ گجرات کے ریختہ گو۔ کہاجاتا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں شاہ جہاں آباد آئے تھے۔اور شاہ گلشن سے کسب سعادت کی اور ان کے فیض صحبت سے تصوف آشنا ہوئے۔ الغرض شاعر مذکور ریختہ کی طرز قدیم میں اچھی مہارت اور معقول قدرت رکھتے تھے اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ ریختہ گو شعرا ان کو استاد اول کہتے ہیں اور اس فن کا موجد سمجھتے ہیں۔الغرض یادگار زمانہ تھے۔(۱۷)

گجرات کا ریختہ گو کہنا گو ولی کی اورنگ آبادی نسبت کا انکار ہے۔ شاہ جہان آباد آمد اور شاہ گلشن کی خدمت میں حاضری اور فیض صحبت سے تصوف سے آشنائی کا ذکر عشقی کرتے ہیں ،البتہ ریختہ گوئی میں شاہ صاحب کے جس مشہور مشورے کا اعادہ ہم تذکروں میں پڑھتے ہیں، وہ مشورہ یہاں موجود نہیں ہے بلکہ استفادے کی نوعیت کے بارے میں ایک طرح سے صراحت موجود ہے کہ استفادہ روحانی تھا۔اس کا تعلق سلوک اور تصوف سے تھا۔ ولی نے غزل گوئی کی جو نئی طرح ڈالی،اس کا انھیں موجد کہنا کچھ غلط بھی نہیں ہے۔

۱۵۔ تذکرۂ بے جگر :

یہ تذکرہ خیراتی لعل بے جگر کا ہے۔ جگر کے حالات زیادہ معلوم نہیں۔ انھوں نے اپنے بارے میں کچھ زیادہ معلومات درج نہیں کی ہیں۔ ان کی شہرت کی وجہ ان کا یہ تذکرہ ہے۔یہ تذکرہ مطبوعہ نہیں ہے ۔ حنیف نقوی نے ''شعرائے اردو کے تذکرے'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔اس تذکرہ کے احوال کے ساتھ ساتھ بے جگر کے تذکرہ میں مذکور کچھ شعرا کا حال بھی نقل کیا ہے جس میں ولی کا ذکر بھی شامل ہے۔ حنیف نقوی کے نقل کردہ ولی کے ترجمہ کو یہاں درج کیا جارہا ہے :

> از کار گاہ طبع جوادش قامت زیبائے شاہدان فارسی بخلاع ہندی زیب پزیرفتہ ودر گاہ فکر نقادش لعل گراں بہائے کان فارسی بر اطباق ہندی جا گرفتہ۔ در حقیقت کسے کہ (پیشتر از ہمہ) اسپ در میدان ہندی دوانید، آں بود وفی الواقع شخصے کہ آب رفتہ باز در جوے ایں زبان ہندی رسانید، ہماں بودہ۔۔۔۔۔۔۔رفتہ رفتہ شعرائے متاخرین بہ تبدل محاورات و تکلف استعارات وصفائی زبان و شستگیٔ بیان ایں کلام را بجائے رسانید ند کہ بہ نسبت فارسی صد درجہ مطبوع اہل روزگار است وہزار مرتبہ مرغوب مردم ایں دیار۔۔۔۔۔۔۔اگرچہ آن شاہ ولایت معنی پروری در مضمون یابی وبلاغت گستری داد عالی تلاشی ہامی داد، مگر بسبب اختلاف محاورۂ اسلاف فی الحال مطبوع سخن سنجان ایں زماں و مرغوب شاعران ایں زبان نمی شود۔(۱۸)

یہاں دیکھئے کہ بے جگر ولی کی فنی پختگی اور بالیدگی کا تو ذکر کرتے ہیں ساتھ ہی وہ فارسی شاعری کے ہندی پر اطباق کا بھی ذکر کرتے ہیں یعنی ولی کی خصوصیت ریختہ میں فارسی کی سی شان پیدا کرنا اور اس کے اوصاف کو بہ کمال ریختہ میں منتقل کرنا ہے۔ ولی کے زمانے اور اس کے فورا بعد ولی کی شاعری کیوں مقبول رہی اس بات کی طرف بھی بے جگر اشارہ کرتے ہیں۔ ولی کو محاورۂ اسلاف کے اختلاف کی وجہ سے ہم عصر سخن سنجوں اور اس زبان کے مقبول شاعروں میں نامقبول بتاتے ہیں۔

۱۶۔ عمدۂ منتخبہ:

اس تذکرے کی تالیف نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور نے کی۔ اس تذکرے کی تکمیل کا سنہ تذکرے کی داخلی شہادتوں کی بنیاد پر حنیف نقوی مرحوم نے ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء متعین کیا ہے۔ (حنیف نقوی، ص: ۶۱۵) حنیف نقوی نے تذکرہ شعرائے اردو، تذکرہ ہندی اور عیار الشعرا سے سرور کے استفادہ کی نشان دہی کی ہے، جن میں سے اول الذکر دو تذکروں

سے استفادے کا اعتراف تذکرہ نگار نے کئی مقامات پر کیا ہے۔ سرور نے حسب مراتب اساطین شاعروں کو شامل کرنے کا اہتمام نہیں رکھا بلکہ معروف اور غیر معروف ہر طرح کے شاعر شامل کیے۔ ولی کا ترجمہ اس طرح لکھا ہے:

> ولی تخلص، کہ معروف و مشہور است، باشندہ دکن۔۔۔۔ بعض عزیزاں موجد شعر ریختہ است۔ زبان و بیانش موافق محاورہ و گفتگوے آن عہد است واشعارش بر زبان خلق جاری۔ اکثر مضمون کلامش بسیار دل چسپ لیکن بندش روز مرہ سخنش بالفعل رائج نیست۔"(۱۹)

ترجمہ:

> ولی تخلص، معروف و مشہور ہیں۔ دکن کے باشندے۔۔۔۔۔۔۔ ریختہ کی شاعری کے موجد ہیں۔ ان کی زبان اور ان کا بیان اس عہد کے محاورے کے مطابق ہے اور ان کے اشعار خلق کی زبان پر جاری ہیں۔ ان کے کلام کے اکثر مضامین بہت دلچسپ ہیں۔ لیکن ان کے کلام کی روز مرہ کی بندش بالفعل اب رائج نہیں ہے۔

سرور کے اس ترجمے میں ہمیں ولی سے متعلق کوئی نئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ ہاں بعض تفصیلات بہت سے دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح انھوں نے درج نہیں کی ہیں۔ اب ان کے اس عدم ترجیح کی وجہ ان کی ایجاز واختصار پسندی ہے یا پھر کوئی اور وجہ ہے، اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے اور انیسویں صدی میں داخل ہونے کے بعد کیا زبان و بیان میں اتنی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ روز مرہ میں ولی کی زبان متروک ہو گئی ہو۔ اگر ایسا تھا تو ولی کے ہم عصروں اور ان کے فوراً بعد شاعری کرنے والوں کی زبان کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا گیا؟ یہ تحقیق طلب سوال ہے۔

۱۷۔ گلشن بے خار:

یہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تالیف کردہ تذکرہ ہے۔ غالب سے سخن سنج ان کی سخن فہمی کے حد درجے قدر دان تھے۔ اس تذکرے کی بنیادی ترجیح پسندیدہ اشعار کا انتخاب اور نظم و سلیقے سے اس کی ترتیب و تنظیم ہے۔ تذکرہ نگاری کے دوسرے پہلو پیش نظر نہیں رکھے گئے۔ حنیف نقوی نے اردو کے سربرآوردہ نقادوں کے برعکس اس تذکرے کی تنقیدی اہمیت کو دائرۂ سوال میں کھڑا کیا ہے۔ شیفتہ ولی کے بارے میں لکھتے ہیں:

ولی تخلص،در زمان عالم گیر پادشاہ بودہ۔ اختلاف است دریں کہ اول کسے کہ بہ ریختہ سخن کردہ اوست یا پیش تر ہم فکر دریں زبان شائع بودہ؟ وبہ تحقیق تقدیم ثانی بر اول است و توفیق آن ست کہ تازمانش دیگرے بہ رتبہ ،او نہ رسیدہ و موجد گفتش را علت ہمیں باشد۔ اگر چہ بہ زبانے کہ او دارد (و) در زبانے کہ دریں زماں رائج، فرق خورشید و ماہ و شب و روز است۔ گویا می تواں گفت کہ ایں ہر دو یک زباں نیست۔ امابہ ہمہ حال حق اوستادی وے بر جمیع اہل نظم ریختہ ثابت شد و عدول بعید از عدل۔ دیوانش ملاحظہ شد۔ قطع نظر از محاورات بعض جا مضمون مناسب می یابد۔"(۲۰)

ترجمہ:

ولی تخلص،عالم گیر بادشاہ کے زمانہ میں ہوئے،اختلاف اس میں ہے کہ ریختہ میں پہلے کس نے سخن کیا۔یا اس سے پہلے اس زبان کے ہم فکر شاعر شائع ہو چکے تھے۔اور تحقیق یہ ہے کہ دوسری بات پہلی پر مقدم ہے ۔اور اس میں اتفاق کی یہ راہ نکل سکتی ہے کہ ان کے زمانے کے لوگ ان کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکے تھے۔اور اپنی بات کے موجد وہ خود ہی تھے۔اور ان کی زبان میں اور ان کے عہد میں رائج زبان میں سورج چاند اور دن و رات کا فرق تھا۔گویا کہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ دونوں زبانیں ایک ہی زبان نہیں تھی۔ان کی حق استادی تمام اہل نظم پر ثابت ہے اور اس سے انحراف عدل و انصاف سے انحراف ہے۔

شیفتہ،ریختہ پہلے کس نے کہا؟اس بارے میں اختلاف کا ذکر کرتے ہیں۔اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ولی سے پہلے اس زبان میں ریختہ کہا جاتا رہا ہے۔ولی کا رتبہ ریختہ میں سب سے بلند ہے،ان کے زمانے تک اس طرز ریختہ پر کسی کی رسائی نہ ہوئی تھی۔وہ ولی کی زبان اور اپنے عہد کی زبان میں سورج چاند اور دن ورات کا فرق دیکھتے ہیں۔اور اس حد تک دیکھتے ہیں کہ دونوں کو ایک زبان کہنے میں بھی انھیں تردد ہے۔ولی کی استادی میں انھیں کوئی کلام نہیں ہے۔وہ تمام اہل فن ریختہ کے نزدیک ثابت ہے اور اس سے انکار انصاف سے منھ پھیرنا ہے۔شیفتہ ولی کے دیوان میں محاوروں کا فرق دیکھتے ہیں اور اس سے قطع نظر،مضامین شعر مناسب پاتے ہیں۔

۱۸۔ گلستان بے خزاں:

گلستان بے خزاں المعروف بہ نغمۂ؟ عندلیب، میر قطب الدین باطن کا تالیف کردہ اردو تذکرہ ہے۔اس تذکرے میں بیان کردہ تعارفی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ایک طرح سے نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے تذکرے پر ظاہر ہونے والے رد عمل

کی ایک کڑی ہے۔ نواب شیفتہ کے بارے میں باطن کا تاثر مثبت نہیں ہے۔ شیفتہ کا تذکرہ نواب صاحب کی نوابی کا شکار ہوا،اور انھوں نے شاعروں کو مناسب توجہ نہیں دی "چنانچہ گلشن بے خار تالیف مصطفیٰ خاں متخلص شیفتہ جو اول سے آخر تک دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہیں نوابی پر فریفتہ سب کو حقارت سے یاد کیا اپنی اوقات کو برباد کیا۔ بجز سات شخصوں کے ہر ایک کے نسبت عبارت ہجو آمیز ہے۔ "(میر قطب الدین باطن، گلستان بے خزاں، مطبع نول کشور، لکھنؤ،۱۲۹۱ھ، ص،۵،۴))اس تعارفی تحریر میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ باطن نے یہ تذکرہ شیفتہ کی خامیوں کو دور کرنے کے لیے لکھا اور انھیں جو ناانصافیاں شیفتہ کے تذکرے میں نظر آئیں ان کا انہوں نے یہاں ازالہ کیا۔ ولی کے بارے میں باطن کہتے ہیں:

> ولی تخلص حاجی ولی نام والد الشعرا عہد شاہ عالمگیر جنت مقام میں کلام نظم باطن اردو آغاز کیا۔ آنحضرت سے اردو نظم کی بنیاد ہے۔ ان کا شاعر طبع کل شعرائے اردو کا استاد ہے۔ (سر دفتر ناظمان اردو۔ سر خیل سخنوران اردو۔ اور طبع بت تراش سخن معتقد ان کے شیخ و برہمن کل شعرا کے پیرا مبرہن سب انہیں کی لکیر فقیر ہیں ۔ سب شاعروں کے باپ ہیں۔ یہ اپنے اوستاد آپ ہیں۔ شعر سخن میں اسی ولی کی ولایت ہے۔ ہر گم رہ کو انہیں کی ہدایت ہے۔ طریق سخن کے سالک ہیں۔ اس راہ کے بھی مالک ہیں۔ سخن ایسا چلن ایسا ولی کا کلام ہے الہام لا کلام ہے۔ سخن کہا نہیں ہے شاعر طبع کیسا ذہین ہے۔ اس وقت کی زبان اس عہد کی بول چال میں ملا دی ہے۔ یہ ولایت ہے یہ شاعری ہے یہ استادی ہے۔ (۲۱)

ہم دیکھتے ہیں کہ شیفتہ کے برخلاف قطب الدین باطن نہ تو ولی کے محاورے اور زبان پر کلام کرتے ہیں اور نہ ہی وہ انھیں مقام اور زمانے سے مخصوص کرتے ہیں۔ قطب الدین باطن ولی کو اپنے وقت تک اردو شاعری بالخصوص غزل کی وہ روایت جو ولی سے نئے طور میں ظاہر ہو کر رائج ہوئی ،اس روایت میں وہ ولی کو شہنشاہ سخن کے رتبے پر فائز کرتے ہیں۔ قطب الدین باطن نے جو کچھ کہا اگر اس کا تجزیہ زمانی سیاق اور اسلوبیاتی خصوصیات کو مد نظر رکھ کر کیا جائے تو ان کی کہی کوئی بات خلاف واقعہ نہیں معلوم ہوتی۔

۱۹۔ طبقات شعرائے ہند:

یہ تذکرہ مولوی عبدالکریم کا تالیف کردہ ہے۔ اس تذکرے پر محمود الٰہی نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں مولوی صاحب اور ان کی تذکرہ نگاری کے بارے میں قدرے تفصیل درج ہے۔ مولوی صاحب دہلی کالج کے فارغ التحصیل اور مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی مملوک علی کے تربیت یافتہ تھے۔ طبقات شعرائے ہند کو انھوں نے گارساں دتاسی کی تاریخ پر استوار کیا۔ دتاسی

نے تاریخ سنین کے تعین میں جو غلطیاں کی ہیں وہ اسی طرح مولوی صاحب کا حصہ بھی بن گئیں۔ ولی کے بارے میں مولوی کریم الدین رقم طراز ہیں:

> یہ شخص درمیان دکھن کے تھا۔اس کو ولی اللہ کہتے ہیں۔ تخلص اس کا ولی ہے۔ مگر اس کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ سنی تھا نہ شیعہ بلکہ دونوں مذہب کے بیچ بیچ میں اس کا طریقہ تھا۔ایک دیوان بھی اس کا موجود ہے۔بالفعل کلکتہ میں چھاپا گیا ہے۔ لیکن اس شاعر کو قریب تین سو برس سے زیادہ گزرے ہیں ۔بہت پرانا متقدمین میں سے ہے۔ گرچہ وہ ارادہ گفتگو اردو کا رکھتا تھا اور زبان ریختہ میں اشعار کہنے کی بہت جستجو اور سعی و کوشش کرتا تھا۔ لیکن اردو اس کی بالکل اچھی نہیں۔ بعض الفاظ کر یہہ مثل ستے اور سوں کی .بہت استعمال کر تھا اور الفاظ دکھنی بھی اشعار میں .بہت لکھتا تھا۔ مگر پھر بھی غنیمت ہے کہ اول زمانہ میں ایسا فکر کرنا بھی غنیمت ہے۔عروض قافیہ میں اس کو اچھا دخل نہ تھا۔اس کا دیوان میں نے بھی تمام دیکھا ہے ۔اس میں .بہت قصیدے اور غزلیں اور رباعیات اور قطعے ہیں مگر آزاد معلوم ہوتا ہے کسی کی تعریف نہ کرتا تھا۔ایک مثنوی بھی اپنے شہر سورت کی بیان میں عبارت سلیس میں لکھی ہے۔اس کے متقدم،اور اول اور بانیٔ اردو ہونے میں کوئی شک نہیں۔ بعض بعض اشعار اس کے .بہت دلچسپ اور مضمون باریک ہیں۔ گرچہ اردو اوسکے اشعار ٹھیک اور .بہت مطابق محاورات مستعملہ زبان اردو ہمارے زمانے کے نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ وہ تمام ہندوستانی شاعروں کا رہبر اور ہادی شعر گوئی میں ہے۔ کیونکہ اب سے اول اس نے شعر کہے ہیں۔(۲۲)

۲۰۔ مخزن الشعرا:

یہ تذکرہ قاضی نورالدین فائق کا تالیف کیا ہوا ہے۔یہ گجرات کے رہنے والے تھے۔غالب کے ہم عصر تھے،دونوں کے درمیان مراسلت،خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا۔ قاضی صاحب علم و فضل کے مالک تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مشق سخن رکھتے تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق .بہت اچھا رکھتے تھے۔ فائق کا یہ تذکرہ غالب کی نظر سے بھی گزرا اور غالب نے فائق کی نثر کی تعریف کی۔ ولی کے سلسلے میں اس تذکرے کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس میں ولی کی وطنی نسبت سے متعلق اختلاف بھی زیر بحث آیا ہے۔

> ولی تخلص محمد ولی نام مولدش احمد آباد و مدفنش ہم ہماں بلدۂ خجستہ بنیاد و مدفنش مابین مزار موسی سہاگ وشاہی باغ۔اول کسے کہ آئینۂ سخن ہندی رابہ صیقل گرئی نظم جلا بخشید وریختہ رابگرمئی بلاغت نشانید ہمیں

است دریں باب سر گروہ و مقدمتہ الجیش جمیع شاعران ہند و گجرات است ۔ بر ضمائر انجم نظائر ناظران ہوشمند مخفی و محتجب نماند کہ محققان ایں فن رادر حال او اختلاف است کہ آیا ولی از گجرات است ویا از دکھن اما براقم آثم از زبانیٔ ثقات بلدۂ احمد آباد و بہ ثبوت چناں پیوستہ کہ شاعر مزبور از بلدۂ مسطور بودہ و سالہا بدکھن ہم گزرانید واز رسالہ نور المعرفت کہ تصنیف اوست مستفاد می شود کہ از شاگردان شاہ گلشن و مرید جناب معارف آگاہ مخدوم العالم مولانا محمد نورالدین صدیقی السہروردی است و خطا کرد میر تقی میر کہ در تذکرہ خود او را از اورنگ آباد نوشت شاید بریں شعر او را از دکھن خیال کرد فرد:

ولی ایراں و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکھن ہے

اما گردہ کہ ولایت گجرات بہ نسبت دہلی و اکبر آباد سمت جنوب کہ ہندیان دکھن گویند واقع است ۔ دراوائل عہد فردوس آرامگاہ محمد شاہ در احمد آباد جاں بجان آفریں سپرد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"(۲۳)

۲۱۔ سخن شعرا

یہ عبدالغفور نساخ کا تذکرہ ہے جو انیسویں صدی کے آٹھویں دہائی کے اواخر میں مکمل ہوا۔ اس میں چوبیس سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے تراجم موجود ہیں۔ ولی کے بارے میں نساخ لکھتے ہیں:

ولی تخلص شاہ ولی اللہ اولاد میں شاہ وجیہ الدین گجراتی علیہ الرحمہ کے تھے۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد میں دہلی میں آئے تھے بعضے تذکرہ والوں نے ان کا نام ولی محمد لکھا ہے اور ان کو موجد ریختہ جانتے ہیں لیکن مقتضائے تحقیق یہ ہے کہ ان کے زمانے کی آگے بھی دکھن میں شعرائے ریختہ گو موجود تھے غرض یہ اپنے وقت کے استاد تھے۔ دیوان ان کا نظر سے گزرا۔(۲۴)

***

میر کا تذکرہ نکات الشعرا ایسا تذکرہ ہے جس نے تذکرہ نگاری کے اسکول کی نہ سہی ایک گروہ کی شکل اختیار کی اور ان کے طرز پر دوسرے تذکرہ نگاروں نے تذکرے لکھے۔ سید عبداللہ نے اپنی کتاب میں میر کے طرز پر تذکرے لکھنے والوں کا ذکر کیا ہے۔ بعید اس سے کہ کس نے ولی کا ذکر کیا اور اپنے دائرہ بحث میں انھیں شامل کیا اور کس نے نہیں، یہ بات عام مصدقہ کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے کہ میر کی رقم کردہ تفصیلات اور معلومات نے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا اور ان کی رائے سازی کی۔ میر کی استادی اور ادبی شان و حیثیت اس امکان کی نفی نہیں کرتی۔

نکات الشعرا میں میر نے ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور قسم کی معلومات نہ ہونے کا اعتراف کیا ہے ۔ولی کے ترجمہ کے باب میں میر کی توجہ کا مرکز شاہ سعد اللہ گلشن کی روایت ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم میر کے اس بیان کا تفصیلی جائزہ لیں۔ میر کے بعد کے تذکرہ نویسوں پر نظر ڈالتے ہیں، اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دیگر تذکرہ نگاروں نے کیا کچھ مختلف بیان کیا ہے یا میر کے بیان کا اعادہ کیا ہے۔

تذکرہ گلشن گفتار ۱۱۶۵ھ میں حمید اورنگ آبادی نے لکھا۔ اس تذکرہ میں شاہ سعد اللہ گلشن والی روایت کا ذکر نہیں ملتا۔ اس تذکرہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے کچھ عرصہ برہان پور میں بھی قیام کیا تھا۔ برہان پور شاہ سعد اللہ گلشن کا وطن بھی رہا ہے۔ حمید ولی کو اورنگ آبادی نہیں لکھتے بلکہ احمد آبادی بتاتے ہیں اور جائے وفات گجرات لکھتے ہیں۔ ولی کے نام سے منسوب مشہور شعر

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

گلشن گفتار کے مصنف نے شرف الدین مضمون کے ترجمہ میں نقل کیا ہے۔ جہاں یہ شعر کچھ یوں درج ہے:

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

تذکرہ ریختہ گویاں گردیزی کا تذکرہ میر کے تذکرے نکات الشعرا کے بعد لکھا گیا ہے۔ گردیزی نے اپنے تذکرہ کی تاریخ اختتام ۱۵/محرم الحرام ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۳ نومبر، ۱۷۵۲ درج کی ہے۔ حنیف نقوی کی تحقیق ہے کہ اس کے داخلی شواہد بتاتے ہیں اس تذکرہ کی ترتیب کے وقت نکات الشعرا وجود میں آچکا تھا۔ اور گردیزی کے پیش نظر بھی تھا۔

مولوی عبدالحق کا بیان ہے:

> ' ' اس نے اپنے سارے تذکرے میں کہیں کسی تذکرے کا حوالہ نہیں دیا بلکہ اشارہ تک نہیں کیا ۔البتہ قرائن سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر کا تذکرہ اس کی نظر سے ضرور گزرا ہے اور دیباچہ میں اس نے تذکرہ نگاروں کے خلاف جو زہر اگلا ہے اس کا ہدف نکات الشعرا ہے۔" (۲۵)

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گردیزی کا یہ تذکرہ میر کے تذکرہ کے جواب میں لکھا گیا۔ ولی کے ترجمہ میں گردیزی نے شاہ سعد اللہ گلشن والی روایت کو نقل نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس کی تردید کی ہے۔ البتہ میر کے برعکس گردیزی ولی کے شعری کمال کی کھل کر تعریف کرتے ہیں۔ جب کہ میر نے ولی کے بیان سے قبل دکنی شعرا کے سلسلے میں جو بیان کیا ہے کہ دکھن میں ایک بھی مربوط گو شاعر نہیں گزرا، گردیزی اس بابت بھی کچھ عرض نہیں کرتے۔ گردیزی کا شاہ سعد اللہ گلشن والی روایت کو نقل نہ کرنا اور اس پہ خاموشی بھی اختیار کئے رکھنا، شمالی ہند کی دکن کے شعرا کے سلسلے میں مجموعی ذہنیت پر سوالیہ نشان ضرور قائم کرتا ہے۔

میر کے تذکرہ کے بعد، معروف و مشہور تذکرہ قائم چاند پوری کا مخزن نکات ہے۔ قائم چاند پوری کے تذکرے سے ہی سب سے پہلے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولی کی دہلی آمد کا واقعہ "در سنہ چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ" میں پیش آیا۔ اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۵۸ء میں تخت افراز ہوا۔ عالمگیر بادشاہ کا چوالیسواں سنہ جلوس ۱۷۰۰ ہجری میں ہوتا ہے۔ اس طرح ولی کی دہلی آمد بروایت قائم چاند پوری ۱۷۰۰ میں ہوئی۔ دہلی آمد کی روایت کے معا بعد قائم رقم طراز ہیں

> کہ گاہ گاہ بزبان فارسی دو سہ بیت در وصف خط و خالش می گفت چوں در آنجا بسعادت ملازمت حضرت شیخ سعد اللہ گلشن قدس سرہ مستعد گردید، بگفتن شعر بزبان ریختہ امر فرمودند وایں مطلع تعلیما موزوں کردہ حوالہ او نمودند
>
> خوبی اعجاز حسن یار گر انشا کروں بے تکلف صفحہ کاغذ بیضا کروں

بیان کا ماحصل یہ ہے کہ ولی جب تک دہلی نہیں آئے تھے، فارسی زبان میں گاہے ماہے خط و خال کے بیان میں شعر کہہ لیتے تھے ۔ جب دہلی میں شاہ صاحب سے ولی کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے ولی کو وہ مشہور زمانہ مشورہ دیا تو ولی نے ریختہ میں شاعری کی ابتدا کی۔ اور تعلیم کی غرض سے شاہ سعد اللہ گلشن نے انہیں ایک مطلع بطور نمونہ بھی عنایت کیا۔

یہ مطلع مع پوری غزل ولی کے دیوان میں پایا جاتا ہے۔ قائم کے بیان سنہ چوالیس جلوس عالمگیر میں آمد دہلی کو ہم تسلیم کر لیں تب بھی قائم کے اس بیان پر کچھ سوالات قائم ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ولی کی ۱۷۰۰ میں آمد دہلی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس وقت تک ریختہ میں شاعری نہیں کر رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ شاہ سعد اللہ گلشن سے فیض پانے کی روایت جو قائم نے اتنے وثوق مع شعری حوالہ کے بیان کی ہے اس کی بنیاد کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ شاہ گلشن نے آخر یہ مشورہ کس بنیاد پر دیا، کیا ریختہ زبان میں غزل کا کوئی نمونہ ان کے سامنے اس نوع کا موجود تھا جس طرح کا تجربہ ولی نے کیا، اگر شاہ سعد اللہ گلشن کو ریختہ میں اس پائے کی شاعری کے امکانات کا بھرپور اندازہ تھا تو یہ تجربہ انہوں نے خود کیوں نہیں کیا۔ ایک اتنے بڑے کارنامہ کو کسی اور کی جھولی میں کیوں ڈال دیا، یا شاہ صاحب نے ولی کی آمد کا انتظار کیوں کیا، کسی اور کو یہ مشورہ کیوں نہیں دیا۔ چہار دانگ عالم میں مشہور ہونے کا اتنا نادر موقع کسی دکنی کی جھولی میں کیوں کر ڈال دیا۔ کسی دہلوی شاعر کو بھی مشورہ دیا جا سکتا تھا۔

چمنستان شعرا یہ شفیق اورنگ آبادی کا تذکرہ ہے۔ اس تذکرہ کی ترتیب و تسوید کا عمل ۱۷۶۰۔۱۷۶۱/ ۱۷۶۲۔ ۱۷۶۳ کے عرصہ میں تکمیل کو پہنچا۔ قائم کے تذکرہ اور شفیق کے تذکرہ کی سال تکمیل قریبا یکساں ہیں۔ اس تذکرہ کی تکمیل میں شفیق نے میر اور گردیزی کے علاوہ شاہ عبد الحکیم لاہوری کے تذکرے "مردم دیدہ" خان آرزو کے تذکرے "مجمع النفائس" اور علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرے "سرو آزاد" سے بھی استفادہ کیا ہے۔ (بحوالہ، شعرائے اردو کے تذکرے حنیف نقوی)

شفیق نے ولی کے وطن کے متعلق اس روایت سے بحث کی ہے کہ ولی گجراتی تھے کہ اورنگ آبادی۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ ولی اورنگ آبادی تھے اور کچھ لوگ انہیں گجراتی کہتے ہیں۔ شفیق انہیں اورنگ آبادی لکھتے ہیں۔ شفیق کا کہنا ہے کہ ولی نے حضرت شاہ وجیہ الدین قدس سرہ کی درگاہ جو کہ گجرات میں ہے، سے کسب علم کیا اور نیلی گنبد متصل گڈ میں مدفون ہیں۔ اس لئے کچھ لوگ انہیں گجرات سے منسوب کرتے ہیں، جو کہ بالکل غلط ہے۔ حنیف نقوی نے شفیق اورنگ آبادی کا میر کے نکات الشعرا سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ یعنی شفیق کے پیش نظر نکات الشعرا رہا ہے۔ اور شاہ گلشن والی روایت بھی ان کی نظر سے گزری ہوگی۔ لیکن شفیق نے نہ تو اس واقعہ کو درج تذکرہ کیا ہے اور نہ ہی اس کی تردید کی ہے۔ اس کے برخلاف "می گویند" طرز کا

ایک اور قصہ ولی سے متعلق ،شامل تذکرہ ضرور کیا ہے ۔ جو اور کسی تذکرہ میں نظر نہیں آتا ۔ شخصت معتبر بافقیر نقل میکرد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سے شروع یہ واقعہ شفیق کے ترجمہ کردہ ولی کے باب میں ملاحظہ کر سکتے ہیں ۔

تذکرہ شعرائے اردو میں بھی میر حسن شاہ گلشن والی روایت اور آمد دہلی کا اعادہ کرتے ہیں اور اس روایت پر نہ کوئی اضافہ کرتے ہیں اور نہ کسی نئی بات کا بیان ملتا ہے ۔

قدرت اللہ شوق کے تذکرے طبقات الشعرا میں ولی کے ترجمہ میں ولی کے مزاج، فکر اور طبیعت کے متعلق دوسرے تذکرہ نگاروں کی بہ نسبت کچھ زیادہ تفصیل ملتی ہے، جس سے گمان گزرتا ہے کہ شاید قدرت اللہ شوق کے پاس معلومات کے دیگر ذرائع رہے ہیں ۔ لیکن جب وہ ولی کی آمد دہلی اور شاہ سعد اللہ گلشن والی روایت تک پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ میر اور قائم کی روایت جو ذرا مبہم تھی، اسی کی صراحت کی گئی ہے ۔ یعنی شاہ گلشن نے مشورہ دیا کہ دکنی کے بجائے ریختہ اردوے معلا کی زبان میں شعر کہو ۔ قائم نے بغرض تعلیم عنایت کرنے کا جس مطلع کا ذکر کیا ہے اسی کا اعادہ قدرت اللہ شوق کے یہاں نظر آتا ہے ۔

امیر مینائی اور پنڈت کیفی قدرت اللہ شوق کو قائم چاند پوری کا شاگرد بتاتے ہیں ۔ حنیف نقوی اس امکان کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ اس تذکرے پر نظر ثانی سے قبل رام پور میں دونوں تذکرہ نگاروں کی ملاقات ہوئی ہو اور قدیم تعلقات کی استواری کی گئی ہو ۔ (بحوالہ، تذکرہ شعرائے اردو/حنیف نقوی)

قدرت اللہ شوق نے اپنے تذکرے کی ترتیب میں اپنے سے قبل ترتیب شدہ کسی تذکرے سے استفادہ کی بات نہیں کہی ہے ۔ لیکن اندرونی شواہد بتاتے ہیں کہ قائم کا تذکرہ مخزن نکات اور میر کا تذکرہ نکات الشعرا ضرور ان کے پیش نظر رہا ہے ۔ مرزا مظہر، آبرو، حشمت، عزلت، ولی کے ترجمہ میں مواد اور الفاظ کی یکسانیت مخزن نکات سے دیکھی جا سکتی ہیں اور ریختہ کی قسموں کے بارے میں نکات الشعرا کے اختتامیہ پر میر کے بیانات ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں ۔ قدرت اللہ شوق نے بھی اپنے تذکرے کے اختتام پر اس موضوع پر کلام کیا ہے ۔ (بحوالہ حنیف نقوی)

ولی کے ایک شعر پر قدرت اللہ شوق کو اعتراض ہے ۔ وہ شعر یہ ہے:

شب تیری زلف سیتی مطول کی بحث تھی
تیرے دہن کو دیکھ سخن مختصر کیا

یہی شعر نثار احمد فاروقی کے مرتب کردہ تذکرہ میں یوں درج ہے:

ہر شب تری زلف سے مطول کی بحث تھی
تیرے دہن کو دیکھ سخن مختصر کیا

تذکرۂ مسرت افزا میں ابوالحسن امیر الدین احمد معروف بہ امر اللہ الہ آبادی نے شاہ گلشن کی روایت درج کرنے کے بعد لکھا ہے "سچ اور جھوٹ راوی کی گردن پر"۔ اس طرح وہ اس روایت کی تردید کرتے ہیں۔ آگے جس طرح وہ لکھتے ہیں کہ ریختہ کی اصل دکھن سے ہے اور وہاں اس تازہ ایجاد کے موجد ولی تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امر اللہ الہ آبادی کو قدرت اللہ شوق اور قائم کے بیان کردہ اس بیان سے اختلاف ہے کہ ولی نے زبان دہلی میں شاعری کی اور شاہ گلشن کے مشورہ سے کی۔ اس بیان کے سلسلے میں حنیف نقوی شعرائے اردو کے تذکرے میں رقم طراز ہیں:

> "ریختہ گوئی میں ولی کی اولیت کے متعلق مولف کا یہ بیان بھی محل نظر ہے کہ "اصل ریختہ از دکن است و دراں دیار ولی موجد ایں طرز تازہ شدہ۔ بعد ازاں سخنوران ہندوستان گفتہ گفتہ بایں روش آراستہ" تحقیق جدید سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دکن میں ولی سے پہلے مقامی زبان میں طبع آزمائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور شمالی ہند میں بھی ان کے ورود سے قبل اس میدان میں کئی لوگ اپنی طباعی کے جوہر دکھا چکے تھے۔"(۲۶)

اول یہ کہ ریختہ کا لفظ اس وقت فارسی غزل کے بالمقابل اردو شاعری بالخصوص غزل کے لیے مستعمل تھا۔ اور باقاعدہ غزل گوئی دکھن میں ولی نے ہی کی ہے۔ دوسرے یہ کہ دہلی میں ولی کے ورود کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے وہ تحقیق ہمیں ولی کی آمد دہلی کے بعد باقاعدہ شاعری کی طرف لے جاتی ہے، جبکہ یہ امر ابھی تحقیق طلب ہے کہ ولی جب دہلی آئے تو وہ باقاعدہ شاعری کر رہے تھے یا نہیں۔ شاہ گلشن کی روایت آمد دہلی کے بعد باقاعدہ شاعری کو تقوت پہنچاتی ہے۔ حنیف نقوی اسی تحقیق پر تکیہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امر اللہ الہ آبادی کے اس قول پر معترض ہیں کہ "اصل ریختہ از دکن است"۔ حالانکہ امر اللہ الہ آبادی اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ "ولی موجد ایں طرز تازہ شدہ"۔ ظاہر ہے دکھن میں شاعری ولی سے قبل بھی ہو رہی تھی پھر طرز تازہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہاں بات واضح ہو جاتی ہے کہ امر اللہ الہ آبادی کی مراد طرز تازہ سے اس ریختہ گوئی سے ہے جو بعد میں غزل کہلائی جانے لگی۔

گلزار ابراہیم اور گلشن ہند۔ گلشن ہند میں جو کہ گلزار ابراہیم کا ترجمہ اور اضافہ شدہ تذکرہ ہے (اسی وجہ سے دونوں کا ذکر ایک ساتھ کیا جارہا ہے)دونوں تذکروں میں دہلی آمد اور شاہ سعد اللہ گلشن والی روایت ملتی ہے۔ گلستان بے خزاں میں عہد عالمگیر میں دہلی آمد کا ذکر ہے جبکہ شاہ گلشن والی روایت مذکور نہیں۔ ولی کی استادی کا بیان بھی خوب ہے۔ گلشن سخن میں بھی یہ روایت ملتی ہے۔ تذکرۂ عشقی میں بھی یہ روایت مذکور ہے اور "کہاجاتا ہے" سے یہ روایت کیا جاتا ہے۔ عمدۂ منتخبہ میں یہ بیان نہیں پایا جاتا۔ تذکرہ بے جگر میں بھی یہ روایت مذکور نہیں ہے۔ گلشن بے خار میں شیفتہ نے محض یہ لکھا ہے کہ عالمگیر بادشاہ کے زمانے میں وارد دہلی ہوئے ہیں۔ شاہ گلشن کی روایت مذکور نہیں۔ شیفتہ ریختہ کا پہلا شاعر ولی کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے زمانے میں کوئی اس کا ہم رتبہ و ہم پلہ نہ ہوا، تمام ریختہ گو شعرا پر ان کی استادی مسلم ہے۔

اس کے بجائے سخن شعرا کے مصنف آمد دہلی کا واقعہ عالم گیر کے عہد میں رقم کرتے ہیں جبکہ شاہ گلشن کی روایت کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ لوگ انہیں موجد ریختہ جانتے ہیں۔ لیکن مقتضائے تحقیق یہ ہے کہ ان کے زمانے کے آگے بھی شعرائے ریختہ گو موجود تھے۔

تذکروں میں ولی کی دہلی آمد کا دو مرتبہ ذکر مندرج ہے۔ ایک روایت قائم چاند پوری کی ہے کہ ولی در سنہ چہل وچہاراز جلوس عالمگیر بادشاہ (۱۷۰۰) میں دہلی آئے اور شاہ گلشن سے مستفید ہوئے۔ دوسری روایت مصحفی کی ہے کہ "ایک دن (حاتم نے)اس فقیر (مصحفی)سے بیان کیا کہ فردوس آرام گاہ کے سنہ دوم میں ولی کا دیوان شاہجہان آباد آیا،اور ان کے اشعار چھوٹے بڑے کی زبان پر جاری ہو گئے ۔(تذکرۂ ہندی /شیخ غلام ہمدانی مصحفی /مرتبہ:مولوی عبد الحق اورنگ آباد ،انجمن ترقی اردو ،۱۹۳۳/ص،۸۰)

ان دونوں روایتوں کے سوا اور تیسری کوئی روایت اب تک کی تحقیق کے مطابق سامنے نہیں آئی ہے۔ قائم کی بیان کردہ روایت کی تکرار آپ اوپر مذکور تذکروں میں ملاحظہ کر چکے ہیں کہ بیشتر تذکرہ نگار اسی روایت کا اعادہ کرتے ہیں۔

ولی کی آمد دہلی کا انکار آسان نہیں، تکرار سے تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے (حالانکہ شفیق اورنگ آبادی ولی کی دہلی آمد کے بابت بالکل خاموش ہیں، دکنی ہونے کے سبب اور ولی کے ہم وطن ہونے کے سبب ان کی خاموشی کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا)۔ آمد دہلی کا یہ واقعہ جب تک محض آمد کا ہی مدعا بیان کرتا ہے تک تب اس روایت سے کوئی پیچ اور الجھاوے نہیں

پڑتے۔ لیکن جب اس روایت میں شاہ گلشن سے تعلیم اور ولی کی آمد دہلی کے بعد شاعری کو متعلق کیا جاتا ہے تو یہ روایت کسی اور عندیے کی طرف لی جاتی ہے۔

ولی کے ۶۳ دواوین تاریخ کتابت کے ساتھ ملتے ہیں،اور ۵۲ دستیاب دواوین پر سنہ کتابت نہیں ملتی۔ان کے علاوہ لائبریریوں میں دستیاب مخطوطوں کی تعداد ۳۵ ہے،اور لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں بھی بہت سے نسخے پائے جاتے ہیں۔(بحوالہ،اردو کا ابتدائی زمانہ،ولی نام کا ایک شخص/شمس الرحمن فاروقی)۔ ظاہر ہے اتنی کثیر تعداد ولی کی مقبولیت بحیثیت شاعر ہونے کو بتاتی ہے ولی کا سب سے قدیم دیوان ۱۷۰۸ء کا کتابت شدہ ملتا ہے۔اگر وہ ۱۷۲۰،۲۵ تک حیات رہتے ہیں تو اس عرصہ کی ان کی شاعری بھی ملنی چاہیئے۔اس قدر شہرت یافتہ شاعر کا کلام محفوظ ضرور کیا گیا ہو گا۔یہ ممکن نہیں کہ انہوں نے شاعری کی ہو اور اس عرصہ کا کلام محفوظ نہ کیا گیا ہو۔کسی اور شاعر کے متعلق بات کی جارہی ہوتی تو یہ قبول بھی کیا جاسکتا تھا کہ اس عرصہ کی شاعری محفوظ نہ کی جاسکی۔۱۷۲۵۔۱۷۲۰ء اور ۱۷۰۸ء کے درمیانی عرصہ کا کلام پھر کیوں نہیں ملتا۔دوسری بات یہ کہ ۱۷۰۰ میں ولی دہلی آئے اور محض آٹھ سال کی مدت میں اپنا سارا کلام کہہ کر دیوان جمع کر لیا؟(فاروقی صاحب نے دواوین کی تعداد نور الحسن ہاشمی کی فراہم کردہ معلومات سے لی ہے اور مخطوطات کی فہرست محمد اکرام چغتائی کی تحقیق کردہ ہے،جو "اردو" کراچی کی اشاعت بابت جولائی –اکتوبر ۱۹۶۶ میں شائع میں ہوا۔)

ولی ۱۷۰۰ سے قبل شاعری کر رہے تھے،اس کی دلیل میں شمس الرحمن فاروقی نے ولی کا وہ شعر پیش کیا ہے جو انہوں نے ناصر علی سرہندی کا نام لے کر کہا ہے۔

پڑے سن کر اچھل جیوں مصرع برق　　اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

ولی/کلیات/ص،۱۹۵

ناصر علی سرہندی کی وفات ۱۶۹۶ء میں ہوئی۔اس سے ظاہر ہے ولی ان کی زندگی میں ہی شاعری کر رہے تھے۔(۲۷)

ناصر علی سرہندی سترہویں صدی کا فارسی کا مشہور شاعر تھا۔سرخوش جیسا شاعر جس کے شاعرانہ کمال کا معترف و مداح تھا۔اس پائے کے شاعر سے مقابلہ اور اسے للکارنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ولی کو اپنے شاعرانہ کمال کا بخوبی اندازہ تھا۔اس شعر سے واضح

ہے کہ ولی ۱۶۹۶ سے قبل شاعری کر رہے تھے اور خود کو منوا بھی چکے تھے۔ ورنہ ناصر علی سرہندی جیسے شاعر سے مقابلہ نہ کرتے

۔

مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق بتاتی ہے کہ شمالی ہند کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر فائز دہلوی ہے۔ فائز نے اپنا دیوان ۱۱۲۷ھ بمطابق ۱۷۱۵ میں مدون کر لیا تھا۔ فائز نے اپنے دیوان (مرتب کردہ مسعود حسن رضوی ادیب) میں ایک خطبہ لکھا ہے جس میں دیوان کی تدوین کی تاریخ بھی لکھی ہوئی ہے۔ فائز کی عبارت یہ ہے کہ:

> ''مخفی نماند کہ ایں رسالہ در ابتدائے سن شباب چناں چہ مذکور شد مرقوم شدہ بود۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن تا پانزدہ سال میسر نیامد کہ اشتغال دیگر درمیان بود۔ بعد از انقضائے ایں مدت در سنہ یک ہزار و یک صد و چہل و دو، فرصتے اتفاق افتاد۔ نظر ثانی بر آں مجموعہ کردم۔ قریب یک سال دریں کار کشید۔ آں چہ بہ عقل ناقص رسید حتی المقدور حک و اصلاح و کم و زیاد کردہ۔ (۲۸)

نظر ثانی کی تاریخ ۱۱۴۲ھ نکلتی ہے۔ پندرہ سال قبل کی تاریخ ۱۱۲۷ھ مطابق ۱۷۱۵ ہے۔ فائز کو مسعود حسن رضوی ادیب نے ولی کا ہم عصر لکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ فائز کے یہاں اب تک دستیاب دیوان میں کل ۳۲ غزلیں ریختہ میں پائی جاتی ہیں، جن میں سے انیس غزلیں ولی کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ اگر محمد شاہی عہد کے دوسرے جلوس ۱۷۲۰ میں ولی کا دیوان دہلی آیا تو فائز کی اولیت قائم ہوتی ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے لکھا بھی ہے کہ

> ''اس سے بادی النظر میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ولی نے فائز کی غزلوں پر غزلیں کہیں مگر امکان اس کا بھی ہے کہ ولی کے دیوان سے پہلے ان کی غزلیں دہلی پہنچنے لگی ہوں اور فائز نے ان کے جواب میں غزلیں کہی ہوں۔ بہر حال سر دست یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ہم طرح غزلوں میں تقدم کا شرف کس کو حاصل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے بعض غزلیں فائز نے پہلے کہی ہوں اور بعض ولی نے''(۲۹)

فائز کا سنہ پیدائش کہیں مذکور نہیں۔ خطبہ سے حاصل کردہ تاریخ ترتیب ۱۷۱۵ سے جیسا کہ انہوں نے سن شباب لکھا ہے، یہ اندازہ لگائیں کہ انہوں نے ۱۰ سال کی عمر میں شاعری کی ابتدا کی ہوگی تو ۱۷۱۵ ہمیں ۲۵ سال کی عمر تک لاتی ہے۔ اول یہ کہ ۱۰ سال کی عمر میں اس قسم کا تجربہ بعید از قیاس ہے دوئم یہ کہ کسی بھی تذکرہ نگار نے فائز کو ریختہ کا استاد، یا بابائے ریختہ یا ان کے سر اولیت کا تاج نہیں رکھا۔ اس کے برعکس سارے تذکرہ نگاروں نے ریختہ گوئی میں ولی کی اولیت کو تسلیم کیا ہے۔ غرض فائز نے گر ولی کی زمینوں میں اس مقدار میں پیروی کی ہے تو اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ولی کے دیوان کا کوئی

نمونہ ضرور رہا ہو گا۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ کسی کی زمین میں غزل کہنا دراصل اس کے شاعرانہ کمال اور استادی کو تسلیم کرنا ہوتا ہے ۔ فائز اگر ولی کی زمین میں غزل کہہ رہے ہیں تو ایک طرح سے وہ ولی کو تسلیم بھی کر رہے ہیں ۔ فائز کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ نہ صرف ولی کی زمینوں کی پیروی کر رہے ہیں بلکہ ولی کی لفظیات بھی ان کی شاعری میں اپنا جلوہ دکھاتی ہیں ۔ فائز وہی زبان برتتے ہوئے نظر آتے ہیں جو ولی کی شاعری میں تمام و کمال ظاہر ہوئی ہے ۔ غرض فائز نے اگر دس سال کی عمر میں شعر گوئی شروع کی تو یہ عین وہی زمانہ ہے جب ولی ۱۷۰۰ میں دہلی آتے ہیں ۔ اور یہ بعید از قیاس نہیں کہ فائز نے ریختہ میں شاعری ولی کی آمد دہلی کے بعد شروع کی ہو ۔

شاہ گلشن والی روایت کا منطقی رد یہ ہے کہ شاہ گلشن کو اگر اس تجربہ کا شعور تھا تو اس کی اہمیت کا بھی اندازہ رہا ہو گا ۔ اس بنا پر یا تو وہ خود اس تجربے کو عمل میں لاتے یا کسی دہلوی کو مشورہ دیتے ۔ ولی کی دہلی آمد کا انتظار نہ کرتے ۔ قائم نے جو شعر نقل کیا ہے تعلیم کی غرض سے ولی کو عنایت کرنے کے ذیل میں، وہ بہت صاف اور رواں غزل ہے ۔ جبکہ ولی کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ ان کے یہاں ارتقا کی ایک صورت ہے ۔ کچھ غزلیں دکنی لہجہ کی ہیں اور کچھ دکنی اور فارسی ترکیبوں کا مجموعہ ہیں ۔ اور کچھ بالکل رواں آج کی زبان میں معلوم ہوتی ہیں ۔ اتنا رواں مصرع کہہ لینے کے بعد شاہ گلشن سے کیا دشوار تھا کہ وہ ریختہ میں غزل نہ کہتے، حالانکہ وہ فارسی زبان میں غزلیں کہتے تھے ۔ یوں بھی نہ تھا کہ انہیں شاعری سے شغف نہ رہا ہو، یا شعری کارگزاری کو عمل میں نہ لائے ہوں ۔ اور ولی نے بھی اتنی صاف اور رواں غزل پہلی کوشش میں تو نہ کہی ہو گی ۔

ملحوظ رہے کہ اہل شمال دکن کو ملک دکن اور دہلی کو بالعموم ملک ہندوستان سے موسوم کرتے تھے ۔ گویا یہ دونوں علاقے دو جزیروں کی حیثیت رکھتے تھے ۔ اور اپنی علاحدہ علاحدہ شناخت رکھتے تھے ۔ دکنیوں نے اہل دہلی سے امتیاز قائم کرنے کے لئے کلچر اور زبان دونوں سطحوں پر اختلاف کا رنگ پیدا کیا اور فارسی کے بجائے ہندی، ہندوی اور دکنی کو اپنایا ۔ اسے زبان دہلوی بھی کہا جاتا تھا کیوں کہ یہ زبان دہلی اور اس کے نواح میں رائج تھی ۔ اہل دہلی نے اس زبان کو عرصہ تک درخور اعتنا نہ جانا ۔ دکنیوں نے اسے اپنا لیا اور ایک شعری روایت کی بنیاد ڈال دی ۔ ولی کے سامنے شعری سرمایے کی توانا روایت موجود تھی اور حسن شوقی کا شعری نمونہ بھی سامنے تھا ۔ ولی کے عہد میں چونکہ اورنگ زیب نے دکن فتح کر لیا تھا، دلی اور اورنگ آباد گھر آنگن بن گئے تھے ۔ لسانی تعامل کی رو تیز سے تیز تر ہو گئی تھی ۔ ایسے میں ولی کا اس نوع کا تجربہ اور شاعری کرنا فطری تھا ۔ اور یہ کسی دکنی سے ہی

ممکن تھا۔(دکنی بغرض امتیاز شمال)ولی اس دکنی شعری روایت کے تجربوں کا حاصل بن کر ابھرے،جس کی سالوں سے دکن نے پرداخت کی تھی۔

اہل شمال کی دہلوی اور صاحب زبان ہونے کی عصبیت ولی کے کارنامہ کو تسلیم کرنے سے مانع رہی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نے حبیب الرحمن میر ٹھی کا ایک خط "اردو کا ابتدائی زمانہ" میں نقل کیا ہے۔وہاں شمال والوں کا ولی کے تئیں تعصب کو دیکھا جاسکتا ہے۔

، ، ولی کے خلاف تعصب کی ایک دلچسپ مثال حبیب الرحمن الصدیقی میر ٹھی کے مکتوبات میں ملتی ہے۔۔۔۔ایک خط میں وہ لکھتے ہیں "ولی کو بہت boost کیا گیا ہے اسےdebunk کرنا ہے۔"(۱۵ اگست ۱۹۶۷،بنام ذکا صدیقی)۔ایک اور خط میں ہے "ولی نے دلی میں آکر اردو سیکھی نہ کہ یہاں والوں کو سکھائی۔"(اردو کا ابتدائی زمانہ،ولی نام کا ایک شخص،حاشیہ نمبر ۲،ص۱۲۶۔ شمس الرحمن فاروقی)

دلی اس وقت آئیڈیل تھی۔وہاں کی تہذیب و ثقافت،ادبی فضا،شعری ماحول،علم و ہنر کے سبب دلی دیگر مقام کے لوگوں کے لئے قبلہ کا حکم رکھتی تھی۔اہل دکن نے شمال سے خود کو مختلف کرنے کی کوشش کی اور ان میں اہل دہلی سے ایک نوع کا مقابلہ کا عنصر نظر آتا ہے۔وجہی،نصرتی،غواصی،ابن نشاطی،ہاشمی ،حسن شوقی یہ شعرا دکنی میں شاعری تو کرتے ہیں لیکن شعری کمالات میں یہ خود کو کسی فارسی شاعر سے کم نہ سمجھتے تھے۔وجہی کی تعلیاں تو مشہور زمانہ ہیں۔ حسن شوقی کو ایک زمانہ تک شاعری کا استاد مانا جاتا رہا ہے،لیکن اہل شمال نے کبھی انہیں اہمیت نہ دی۔انہیں درخور اعتنا نہ جانا۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ دکنی شعرا کے بارے میں اہل شمال کو زیادہ علم نہ ہو سکا،اس لئے یہ رائے رکھنا مناسب نہیں۔لیکن دکنی شاعری کا یہ سلسلہ جب ولی تک پہنچتا ہے،اور ولی نے جب فارسی شاعری کی سب سے مقبول و ہر دلعزیز صنف "غزل"کو ریختہ کے قالب میں ڈھالا،اس وقت اہل شمال کو اندازہ ہوا کہ اس زبان میں کتنے امکانات ہیں۔اہل شمال کا تعصب اس وقت کھلا جب میر نے نکات الشعرا میں ولی کے ترجمہ سے قبل دکنی شعرا کے بارے میں ایک اقتباس لکھا۔اس کا ترجمہ یہاں لکھا جاتا ہے:

> "یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ چند کو چھوڑ کر ملک دکن کے اکثر شعرا بے رتبہ ہیں۔چنانچہ ولی محمد جو کہ صاحب دیوان مشہور و معروف ہے اور سید عبدالولی عزلت اور سراج اور آزاد جو کہ ولی کے ہمعصر تھے اور عارف علی

خاں عاجز کہ مربوط گوئی کا سلسلہ ان شعرا سے وابستہ ہے۔ ان کے علاوہ باقی شعرا تو ٹھیک سے بات کرنا بھی نہیں
جانتے تھے، تو ان کو بھلا شعر گوئی سے کیا نسبت۔"(۳۰)

اس بیان سے ظاہر ہے کہ دکنی شعرا کے سلسلے میں میر کی کیا راے تھی۔ باقی جن شعرا کا ذکر کیا ہے، انہیں محض مربوط گو کہا ہے۔ مربوط گوئی ایک شعری اصطلاح ہے۔ مربوط گوئی سے مراد یہ ہے کہ شعر کے دونوں مصرعے باہم ربط رکھتے ہوں۔۔یہ شعر کی بدیہی شرائط میں سے ہے۔ لیکن شعری کمال یہی نہیں ہے۔ میر نے اس کے علاوہ کسی اور خوبی کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ میر نے ولی کے ترجمہ میں ان کے شعری کمال کا اعتراف نہ کر کے شاہ گلشن سے کسب فیض کا ایک مشکوک مفروضہ تیار کیا اور قائم نے اسے اور تقویت پہنچائی۔ قائم کے بیان نے اسے مزید مستحکم کر دیا کہ ولی نے ۱۷۰۰ میں دہلی آمد کے بعد شاعری کی ،اس سے پہلے گاہے ماہے خط و خال کے بیان میں فارسی زبان میں شاعری کر لیا کرتے تھے۔ قائم کے تعصب کے ثبوت میں ان کا مشہور شعر پیش کیا جا سکتا ہے:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

خیال رہے کہ اس وقت غزل کا لفظ فارسی غزل کے لئے مستعمل تھا،اور ریختہ دراصل اس غزل کو کہتے تھے جو ہندی یعنی اردو زبان میں کہی جاتی تھی۔ واضح ہے کہ قائم زبان دکنی اور لچر سی بات کہہ کر دکنی شاعری کو رد کر رہے ہیں،اور غزل طور کرنا میں معنویت یہ ہے کہ فارسی غزل کا طور ریختہ میں اپنایا۔ یعنی اس سے قبل کی شاعری میں فارسی کی شعری خصوصیات ریختہ میں پیدا نہ ہوئی تھیں۔

ولی کی زبان میں اگرچہ دکنی عناصر شامل ہیں لیکن ولی کی شاعری پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسے لچر سی زبان کہہ کر مسترد نہیں جا سکتا۔ اور قائم اور میر جو کہ خود شاعر ہیں اور شعری رموز سے واقف اور اس فن کے امام ہیں، وہ ولی کی شاعری کو محض مربوط گوئی اور لچر سی زبان کہہ کر آگے بڑھ جائیں تو اسے تعصب کے سوا کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

حواشی:

۱۔ میر تقی میر۔ نکات الشعرا۔ مرتبہ: مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)، طبع ثانی ۱۹۳۵، ص ۸۹۔۹۰

۲۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی۔ گلشن گفتار۔ مرتبہ: سید محمد ایم اے۔ مطبوعہ: خورشید پریس یوسف بازار نیا پل۔ ۳۰ بہمن ۱۳۳۹ف۔ ص ۸

۳۔ کے فاطمی ایم-اے۔ مترجم، گلشن گفتار۔ سرفراز پریس نادان محل روڈ لکھنؤ۔ طبع اول 1963ء۔ ص 36

۴۔ علی الحسینی گردیزی۔ تذکرہ ریختہ گویاں۔ مرتبہ: ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، اترپردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۵ ص، ۱۶۳

۵۔ قیام الدین قائم۔ تذکرہ مخزن نکات۔ مرتبہ: پروفیسر ڈاکٹر اقتدا حسن۔ مجلس ترقی ادب لاہور/ طبع اول: نومبر ۱۹۶۶ ص ۲۳،۲۲،۲۱,

۶۔ لفظ "بہار" کے بجائے "پہار" ہے، کمپوزنگ کی غلطی ہے۔

۷۔ لچھمی نرائن شفیق۔ چمنستان شعراء۔ مرتب: مولوی عبدالحق۔ مطبع۔ انجمن ترقی اردو/ طبع اول ۱۹۲۸۔ ص ۱۰۶،۱۰۵،۱۰۴

۸۔ لچھمی نرائن شفیق۔ چمنستان شعرا۔ مترجم و مرتب۔ سید عطاالرحمن عطا کاکوی۔ دی آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ۔ ۶۔ ص ۸۲،۸۳،۸۴

۹۔ میر حسن۔ تذکرہ شعرائے اردو۔ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ ۱۹۸۵۔ ص ۱۲۹

۱۰۔ قدرت اللہ شوق۔ طبقات الشعرا۔ مرتبہ: نثار احمد فاروقی۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ سن اشاعت: ۱۹۶۵۔ ص ۷،۶،۵

۱۱۔ غلام حسین شورش۔ تذکرہ شورش۔ مرتبہ: ڈاکٹر محمود الٰہی۔ اترپردیش اردو اکادمی۔ ۱۹۸۴۔ ص ۵۳۲

۱۲۔ ابو الحسن امیر الدین احمد ،امراللہ الہ آبادی ۔ تذکرہ مسرت افزا ۔ مرتب:سید شاہ محمد اسمٰعیل ۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۔ سال اشاعت ۔ ۱۹۹۸ء ۔ ص ۱۵۴

۱۳۔ میرزا علی لطف ۔ گلزار ابراہیم مع گلشن ہند ۔ مرتبہ: شبلی اور مولوی عبدالحق ۔ دار الاشاعت پنجاب رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور ۔ ۱۹۰۶ء ۔ ص ۲۴۶

۱۴۔ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی ۔ گلشن سخن ۔ مرتب: سید مسعود حسن رضوی ادیب ۔ انجمن ترقی اردو، ہند ۔ علی گڑھ 1965 ۔ ص ۲۴۷

۱۵۔ میرزا علی لطف ۔ گلزار ابراہیم مع گلشن ہند ۔ مرتبہ: شبلی اور مولوی عبدالحق ۔ دار الاشاعت پنجاب رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور ۔ ۱۹۰۶ء ۔ ص ۲۴۶

۱۶۔ میر قدرت اللہ قاسم ۔ تذکرہ مجموعۂ نغز ۔ مرتبہ: محمود شیرانی ۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔ ۱۹۳۳ء ۔ ص ۲۹۶،۲۹۷

۱۷۔ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی ۔ تذکرہ عشقی ۔ مرتب: عطا کاکوی ۔ رئیس ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ ۔ ۱۹۶۹ء ۔ ص ۱۴۲

۱۸۔ حنیف نقوی ۔ شعرائے اردو کے تذکرے ۔ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۔ اکادمی اشاعت اول ۔ ۱۹۹۸ء ۔ ص ۵۷۲،۵۷۱

۱۹۔ میر محمد خاں بہادر سرور ۔ عمدۂ منتخبہ ۔ مرتب: خواجہ احمد فاروقی ۔ مطبع: ادبی پرنٹنگ پریس، بمبئی ۔ اشاعت اول ۔ ۱۹۶۱ء ، ص ۸۰۱

۲۰۔ نواب محمد مصطفی خاں شیفتہ ۔ گلشن بے خار ۔ مرتبہ: کلب علی خاں فائق ۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۔ طبع اول ، اکتوبر ۱۹۷۳ء ۔ ص ۶۳۸

۲۱۔ میر قطب الدین باطن ۔ گلستان بے خزاں ۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۔ پہلا فوٹو آفسیٹ ایڈیشن ۱۹۸۲ء ۔ ص ۲۸۲،۲۸۲

۲۲ ۔ کریم الدین ۔ طبقات شعرائے ہند ۔ اتر پردیش اردو اکادمی ۔ ۱۹۸۳ء ۔ ص ۳۸

۲۳۔ قاضی نور الدین فائق ۔ مخزن الشعرا ۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۔ دوسرا اکادمی ایڈیشن ۲۰۱۰ء ۔ ص ۱۱۸،۱۱۹

۲۴۔ عبدالغفور نساخ۔ سخن شعرا۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ ۱۹۸۲۔ ص۵۵۶

۲۵۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی ۔ گلشن گفتار ،مقدمہ۔ مرتب ؛مولوی عبد الحق ۔ مطبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ،سنہ اشاعت: ۱۹۳۳ء۔ ص،۱۲،۱۱

۲۶۔ حنیف نقوی۔ شعرائے اردو کے تذکرے۔ اتر پردیش اردو اکادمی،۱۹۹۸۔ ص،۳۹۰

۲۷۔ شمس الرحمن فاروقی۔ اردو کا ابتدائی زمانہ۔ آج پبلی کیشنز۔ بار سوم،۲۰۰۹۔ ص ۱۳۳

۲۸۔ مسعود حسن رضوی ادیب۔ مرتب۔ دیوان فائز۔ ص،۲۶

۲۹۔ مسعود حسن رضوی ادیب۔ مرتب۔ دیوان فائز۔ انجمن ترقی اردو دہلی،۱۹۴۶۔ ص،۱۹۰

۳۰۔ میر تقی میر۔ نکات الشعرا۔ مرتبہ:ڈاکٹر محمود الہی۔ اتر پردیش اردو اکادمی۔ لکھنو۔ پہلا اکادمی ایڈیشن،۱۹۸۴۔ ص۹۰

باب سوم

ادبی تاریخوں (اردو، انگریزی) میں ذکر ولی

اردو کی ادبی تاریخوں میں ولی

ادبی تاریخوں میں ذکر ولی کی تلاش کیوں کی جائے کیا یہ ہمیں کوئی ایسی بات بتا پائیں گی جو تذکروں میں نہ پائی جاتی ہوں؛ ظاہر ہے کہ ادبی تاریخ کی بنیاد اگر تذکرے ہیں تو معلومات کا اعادہ یقینی ہے۔ اس لیے تذکروں میں ذکر ولی کی تحقیق و تدقیق کے بعد ادبی تاریخوں میں نفس موضوع کی جستجو کا تحقیقی جواز قائم کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادبی تاریخ ایسا کون سا کام انجام دیتی ہے جو تذکروں سے نہیں ہوسکتا۔ یہ معلوم بات ہے کہ ادبی تاریخ بالخصوص کلاسیکی اردو ادب کی تاریخ تذکروں سے بے نیاز نہیں رہ سکتی، وہ کلاسیکی ادب کی جستجو اور اس کے احوال کی فراہمی کے لیے تذکروں کی طرف رجوع کرتی ہے۔ ادبی تاریخ تذکروں کی فراہم کردہ معلومات میں نظم وانتظام پیدا کرتی ہے۔ تذکروں کی فراہم کردہ معلومات کے درمیان مقابلہ اور موازنے سے ایسی بات کو روشن کرنے کی کوشش کرتی ہے جو زیادہ قابل قبول ہو اور حقیقت واقعہ سے زیادہ قریب ہو۔ ادبی تاریخ کا منصب یہ بھی ہے کہ وہ معلومات کے درمیان ترجیح کی ایسی بنیاد وضع کرے جو اس ترجیح کی معقولیت کو قابل قبول بنائے۔ اس طرح معلومات کے انبار سے ایسا معلومہ دریافت ہو جو غموض حالت سے نجات دلائے۔ کسی شخصیت یا واقعے میں شامل بے بنیاد باتیں اصل واقعے یا شخصیت سے الگ ہوجائیں۔

تذکروں کے باب میں ہم نے دیکھا کہ ولی کے باب میں معلومات میں اتفاق رائے کی صورت نہیں ہے اور نہ ہی ایسا ہے کہ ایک تذکرہ دوسرے تذکرے کا پوری طرح تکملہ بنتا ہو، یا کسی مجمل بات کی ایسی جامع تفصیل رکھتا ہو جو پیچیدگی کو دور کرنے میں ہماری مدد کرے۔ اسی لیے ہمیں تذکروں کی فراہم کردہ معلومات میں ترجیح قائم کرنے میں قدرے دشواری سے گزرنا پڑتا ہے۔ تذکروں کی فراہم کردہ معلومات ایک جامع نکتے تک لے جانے کے بجائے ایک انتشار کی صورت حال سے روبرو کرتے ہیں۔ یہ صورت مولد، اسم، وطن اور دبستان ہر ایک کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔

ولی کے بارے میں ادبی تاریخیں کس معلومے تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں؟ ولی کے باب میں معلومات کی تنظیم و ترتیب کو کس طرح انجام دیتے ہیں؟ ہم ادبی تاریخ سے تذکرے کی بنسبت جس تحقیق، پرکھ اور پہچان کی توقع رکھتے ہیں وہ توقعات ولی کے باب میں کس حد تک پوری ہوتی ہے؟ یہ پہلو دیکھا اور دکھانا ہمارا مدعا ہے اور یہی ہمارے اس باب کا جواز بھی ہے۔

آب حیات:

مولانا محمد حسین آزاد کا تذکرہ یوں تو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ لیکن اس تذکرہ میں پہلی مرتبہ کلاسیک تذکرہ نگاری کے پیٹرن سے مختلف، شعرا کے تذکرے کا ایک نیا ڈھنگ ملتا ہے۔ آزاد نے اس میں شعرا کی زمانی ترتیب کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں مختلف ادوار میں تقسیم کیا۔ اور اردو شاعری کو اس کے تاریخی سیاق میں دکھانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ آب حیات کو ادبی تاریخ نگاری کا نقش اول کہا جاتا ہے۔

باب "ادبی تاریخوں میں ولی" میں آب حیات کو اسی نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے شامل کیا جا رہا ہے۔ تاکہ تذکروں میں بیان کردہ حقائق کے اثرات کو ادبی تاریخوں میں دیکھ سکیں۔ اور ولی کے ضمن میں بیان کردہ حقائق و اطلاعات کا ایک تسلسل قائم کر سکیں۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات ۱۸۸۰ میں لکھی۔ ۱۸۵۷ کے بعد اردو معاشرہ میں اپنی ادبی روایت کو دیکھنے کے نظریے میں تبدیلی شروع ہوئی۔ ۱۸۷۴ میں انجمن پنجاب کے تحت نظم نگاری، نیچرل شاعری اور افادی شاعری کا غلغلہ بڑے زور و شور سے بلند ہوا۔ جس میں حالی اور آزاد پیش پیش تھے۔ آزاد نے نئی لالٹینوں کی روشنی سے فیض حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ اور اپنی ادبی روایت کو اس کے سامنے حقیر جانا۔ اسی عہد میں آب حیات کی تصنیف عمل میں آئی۔ اپنی ادبی روایت کو حقیر اور ہندوستانی زبان میں خلق کیے گئے سارے ادبی سرمایے سے دامن کش ہونے کا یہ رویہ نو آباد کار کی ذہنی برتری و تفوق کو تسلیم کرنا اور اسے قائم کرنا تھا۔ گو کہ نو آباد کار کی تہذیب اور اس کی علمی برتری کا احساس اس وقت کے ادبی معاشرے میں سرایت کرنے لگا تھا، لیکن انہیں احساس نہ تھا کہ انھیں ان کے ادبی روایت سے کاٹنے اور اس سے متنفر کرنے کی نو آباد کاری اذہان کی یہ ایک دانستہ کوشش تھی۔ آزاد اور حالی اسی کوشش میں غیر شعوری طور پر شامل نظر آتے ہیں۔

آب حیات میں اس نو آباد کار تہذیب کی برتری اور اپنی فروتنی اور ذہنی کمتری کا احساس نظر آتا ہے۔ ہم ولی کا ذکر کر رہے ہیں تو

ولی کے بیان میں آزاد جس طرح رقم طراز ہیں اسے رقم کرتے ہیں۔ آزاد لکھتے ہیں:

"اگرچہ اس اعتبار سے یہ نہایت خوشی کا موقع ہے کہ عمدہ جوہر انسانیت پسندیدہ لباس پہن کر ہماری زبان میں آیا۔ مگر اس کوتاہی کا افسوس ہے کہ کوئی ملکی فائدہ اس سے نہ ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی علمی یا آئینی رستے سے نہیں آیا۔ فقیرانہ شوق یا تفریح کی ہوا سے اڑ کر آ گیا تھا۔ کاش شاہنامہ کے ڈھنگ سے آتا کہ محمد شاہی عیاشی اور عیش پرستی کا خون بہاتا۔۔۔۔۔۔"(۱)

محمد حسین آزاد نے ادب کے مقصدی چلن کو پیش نظر رکھتے ہوئے ولی کے کلام پر نظر ڈالی۔ انھوں نے ولی کے کمال فن کو بھی افادی نقطہ نظر سے دیکھا۔ اور اس میں ایسے عنصر کی تلاش کی جو علم و قانون کی رو سے انقلاب برپا کرتا۔ جو کسی رزم یا ایسی رزم کا پیش خیمہ ثابت ہوتا جس سے سارے حکومتی مقاصد حاصل کئے جاسکتے۔ ادب کو انقلاب کا وسیلہ بنا کر دیکھنا انیسویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہوا، اور بیسویں صدی کے نصف اول تک اسی فکر کی کارفرمائی رہی۔ اس نکتۂ معترضہ کے بعد ہم ولی کی آمد دہلی کے متعلق محمد حسین آزاد کی آراء کا جائزہ لیتے ہیں۔

میر کے اس بیان پر کہ "کہا جاتا ہے ولی دہلی آئے اور شاہ گلشن سے مشورہ لیا "آزاد متردد ضرور ہیں۔ لیکن ان کا بیان عجب گومگو کا شکار ہے۔ آزاد کے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ ولی ابوالمعالی کے ساتھ دہلی ضرور آئے، اور شاہ گلشن سے ملاقات بھی کی اور ان کے مرید بھی ہوئے اور ان کے اشارے سے اپنے دیوان کی ترتیب فارسی طور پر کی۔ لیکن ولی کو شاہ گلشن نے شعر پر اصلاح دی، اس پر وہ "شاید "کا استعمال کرتے ہیں۔ (میر شاہ گلشن سے فیض حاصل کرنے کا ذکر کرتے ہیں، قائم بطور تعلیم مطلع کہہ کر دینے کی بات کرتے ہیں اور آزاد اصلاح دینے کی بات کر رہے، وہ بھی "شاید" کے ساتھ) یہ شاید بھی بالکل میر کے اسی "می گویند" کی طرح ہے جس پر ولی اور شاہ گلشن کے واقعہ کی روایت کی ساری بنیاد کھڑی ہے۔

آزاد کا بیان دیکھیں جس سے واضح ہو گا کہ یہاں بھی دراصل میر اور قائم کے بیانات کا ہی اعادہ کیا گیا ہے۔

"یہ اپنے وطن سے ابوالمعالی کے ساتھ دلی میں آئے۔ یہاں شاہ سعد اللہ گلشن کے مرید ہوئے۔ شاید ان سے شعر میں اصلاح لی ہو مگر دیوان کی ترتیب فارسی کے طور پر یقیناً ان کے اشارے سے کی۔"(۲)

آگے لکھتے ہیں: ''اتنا ثابت ہے کہ ان کا ابتدائے عہد شاید عالمگیری کا آخری زمانہ ہو گا اور وہ مع اپنے دیوان کے سنہ محمد شاہی میں دلی پہنچے۔''(۳)

ولی کے بیان میں آزاد نے آب حیات میں عجب تضادات رکھ دیے ہیں۔ ایک طرف وہ ان کے شعری کمال کا اعتراف کرتے ہیں۔ دلی میں ان کی مقبولیت کا حال لکھتے ہیں۔ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ولی کو فن عروض میں درک نہیں تھا۔ وہ زبان فارسی سے ناواقف تھے۔ علمی استعداد ان کی اچھی نہ تھی۔

لکھتے ہیں:

> ''کیوں کہ اس عہد کی خاندانی تعلیم اور بزرگوں کی صحبتوں میں ایک تاثیر تھی کہ تھوڑی نوشت و خواند کی لیاقت بھی استعداد کا پردہ نہ کھلنے دیتی تھی۔ چنانچہ ان کے اشعار سے معلوم ہو گا کہ وہ قواعد عروض کی طرح زبان فارسی سے ناواقف تھے۔''(۴)

حالانکہ یہ بات عیاں اور بیاں ہے کہ ولی کا کارنامہ بزرگوں کی صحبتوں کی تاثیر سے کہیں آگے کا کارنامہ ہے۔ اور فن عروض سے واقف صاحبان ولی کے عروضی نظام پر گرفت مشکل سے کر سکیں گے۔ اسی بیان کے ساتھ آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> ''ان کی انشا پردازی اور شاعری کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا ہے کہ آج تک زمانے نے کئی پلٹے کھائے ہیں مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔''(۵)

آزاد نے لکھا ہے کہ ولی نے ایک رسالہ نور المعرفت بھی تصنیف کیا جو تصوف پر ہے۔ جس میں ولی نے خود کو محمد نور الدین صدیقی سہروردی کے مریدوں کا خاک پا اور شاہ گلشن کا شاگرد بتایا ہے۔

''رسالہ نور المعرفت تصوف میں لکھا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نور الدین صدیقی سہروردی کے مریدوں کا خاک پا ہوں اور شاہ سعد اللہ گلشن کا شاگرد، مگر یہ نہیں لکھا کہ کس امر میں۔''(۶)

> ولی کو نور الدین صدیقی سہروردی کا مرید اور لا مخزن الشعرا کے مصنف قاضی نور الدین فائق نے لکھا ہے۔ ''واز رسالہ نور المعرفت کہ تصنیف اوست مستفاد می شود کہ از شاگردان شاہ گلشن و مرید جناب معارف آگاہ مخدوم العالم مولانا محمد نور الدین صدیقی سہروردی است'' (۷)

اغلب ہے کہ آزاد نے یہ بیان مخزن الشعرا سے لیا ہو۔ آزاد نے ولی سے متعلق کر کے ایک شعر نقل کیا ہے۔

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین

جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

گلشن گفتار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں بلکہ مضمون کا ہے۔ گلشن گفتار میں مضمون کے ترجمہ میں حمید خاں اورنگ آبادی نے خفیف سی تبدیلی کے ساتھ یہ شعر یوں درج کیا ہے:

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین

جا کہو کوئی محمد شاہ سیں(۸)

مضمون کا پورا نام میاں شرف الدین تھا اور مضمون تخلص تھا۔ مضمون کے وطن کے متعلق تذکرہ نگاروں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ گلشن گفتار کے مصنف نے مضمون کو احمد آبادی مذکور کیا گیا ہے۔ میر انھیں "متوطن جا جمئو کہ قصبہ است متصل اکبر آباد" لکھتے ہیں اور سراج الدین علی خاں کے شاگرد بتاتے ہیں۔ میر یہ بھی لکھتے ہیں کہ عہد جوانی میں شاہجہان آباد آئے اور مسجد زینت المساجد میں سکونت پذیر ہوئے اور یہیں فوت ہوئے۔(۹) مضمون کی شاگردی کے متعلق گردیزی کا بیان ہے کہ وہ خان آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے(۱۰) مضمون کے وطن کے متعلق قائم کا کہنا ہے کہ وہ نواح گوالیار سے تھے اور مسجد زینت المساجد کو بھی زینت بخشی تھی۔(۱۱) ان تمام بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گو کہ ان کے وطن کے بارے میں اختلاف ہو لیکن ان کا تعلق دہلی سے ضرور رہا، اسی لئے ان کے زینت المساجد اور شاگرد خان آرزو اور مظہر جان جاناں کو تذکرہ نگاروں نے بیان کیا ہے۔

اس کتاب میں مندرج مباحث :

ولی کا نام شمس ولی اللہ تھا۔

ولی کا عہد عالمگیری میں ابو المعالی کے ساتھ دہلی آنا اور شاہ گلشن کے مشورے پر فارسی طرز پر دیوان مرتب کرنا۔

ولی کا عہد محمد شاہ میں مع دیوان یقینی دہلی آنا۔

رسالہ "نور المعرفت" تصوف پر لکھی گئی ولی کی تصنیف ہے۔

ولی نور الدین صدیقی سہروردی کے معتقد اور شاہ گلشن کے شاگرد تھے۔

مضمون کے شعر کو ولی دکنی سے منسوب کر کے لکھنا۔

اردوے قدیم (تاریخ زبان اردو) ۱۹۲۵:

حکیم شمس اللہ قادری کی یہ تاریخ ۱۹۲۵ میں لکھی گئی ہے۔ یہ ایک مختصر تاریخ ہے۔ اس میں پہلی بار اورنگ آباد کو ایک مرکز کے طور پر مذکور کیا گیا۔ مرکز کا یہ تصور گو کہ بہت واضح طور پر مصنف موصوف سامنے نہیں لائے ہیں لیکن ہلکا سا اشارہ ضرور کیا ہے۔ شمس اللہ قادری صاحب نے ولی کا ذکر شعرائے اورنگ آباد کے ذیل میں کیا ہے اور ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے۔ اولا ولی کے نام کے سلسلے میں رائج اختلافات کو درج کیا ہے۔ تذکروں میں موجود ان کے نام کے بارے میں پائے جانے والے اختلافات کا حوالہ دیتے ہوئے لچھمی نارائن شفیق اور فتح علی گردیزی کے قول کو راجح خیال کیا ہے کہ ولی کا نام محمد ولی ہے۔

ولی کی وطنیت پر مذکور رایوں کا احاطہ کیا ہے کہ نواب علی ابراہیم خاں، یوسف علی نواب مصطفی خاں شیفتہ، فتح علی گردیزی اور قیام الدین قائم نے ولی کو دکن کا باشندہ کہا ہے اور میر حسن دہلوی، قدرت اللہ قاسم، عبد الغفور خاں نساخ اور آزاد گجرات کا باشندہ لکھتے ہیں۔ لچھمی نارائن شفیق اور میر تقی میر کے اقوال بھی درج کرتے ہیں کہ ان کا کہنا ہے کہ ولی اورنگ آبادی تھے۔ اور شفیق نے گجراتی ہونے سے سخت اختلاف کیا ہے۔ شیخ وجیہ الدین گجراتی اور ولی کے تعلق کے متعلق مختلف آراء کا اندراج بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم، عبد الغفور خاں نساخ اور مولانا محمد آزاد کا کہنا ہے کہ ولی شیخ وجیہ الدین گجراتی کی اولاد سے ہیں۔ لچھمی نارائن شفیق کا کہنا ہے کہ ولی شیخ وجیہ الدین گجراتی کے درگاہ میں تعلیم کی غرض سے آئے۔ اس کے بعد وہ سورت گئے۔ وہاں سے حج کے لئے گئے اور وہاں سے واپس احمد آباد آئے۔ اور یہیں فوت ہوئے۔ نیلی گنبد میں دریا خاں کی گنبد کے پاس دفن کئے گئے۔ ابنائے وجیہ الدین گجراتی کے تمام اقوال کے بارے میں شمس اللہ قادری کا کہنا ہے کہ اس کی کوئی تاریخی سند نہیں بیان کی گئی ہے۔

ولی کے سفر دہلی کے متعلق قادری صاحب نے ان دو اقوال پر کہ ولی دہلی محمد شاہ کے عہد میں آئے یا عہد اورنگ زیب میں، کلام کیا ہے۔ آزاد اور گل رعنا کے مصنف عبد الحیٔ نے ان کی آمد عہد محمد شاہ میں مذکور کی ہے، جسے قادری صاحب یہ کہہ کر رد کرتے ہیں کہ ان کے پاس اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ اور دوسرے قول عہد اورنگ زیب میں ولی کی دہلی آمد کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور دلیل یہ پکڑی ہے کہ " قدیم تذکروں سے سے ولی کا عالمگیر کے عہد میں آنا ثابت ہوتا ہے۔ اور میر حسن دہلوی

۔نواب علی ابراہیم خاں،یوسف علی مرشد آبادی،مرزا علی لطف اور عبد الغفور خاں نساخ نے اس کو نہایت وثوق کے ساتھ لکھا ہے (۱۲)۔

آگے قائم کی بیان کردہ روایت کو مذکور کرتے ہیں کہ عالمگیر کے چوالیسویں سال جلوس میں جو ۱۱۱۲ھ کے مساوی ہے ولی اپنے دوست سید ابو المعالی کے ساتھ دلی میں آئے۔(۱۳)

ولی کی وفات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۴۳ھ سے قبل وفات پائی ہوگی۔شمس اللہ قادری صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے دیوان ولی کا ایک قلمی نسخہ ۵/جمادی الاول ۱۱۴۳ھ احمد آباد میں مکتوب دیکھا ہے جس کے خاتمہ پر "تمام شد دیوان ولی رحمتہ اللہ علیہ "تحریر ہے۔ولی کا سنہ وفات فرہنگ آصفیہ میں ۱۱۰۱ھ اور تذکرہ شعرائے دکن میں ۱۱۵۵ھ مرقوم ہے۔لیکن قادری صاحب کا کہنا ہے کہ ۱۱۵۵ھ غلط ہے۔نور المعرفت رسالہ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ اس کا ذکر گل رعنا کے مصنف نے کیا ہے (حالانکہ اس کے بارے میں اس سے پہلے مخزن الشعرا اور آب حیات میں ذکر کیا گیا ہے) جو تصوف پر ایک رسالہ ہے اور اب ناپید ہے۔تذکرہ روضتہ الشہداء کے بارے میں گل رعنا اور تذکرہ شعرائے اردو کے مصنفین نے تحریر کیا تھا کہ یہ ولی اورنگ آبادی کی تصنیف ہے۔قادری صاحب کی تحقیق ہے کہ یہ ولی اورنگ آبادی کی نہیں بلکہ ولی دکھنی کی تخلیق ہے۔ولی دکھنی یہ ولی ویلوری ہیں جن کا نام سید محمد فیاض ہے۔قادری صاحب لکھتے ہیں کہ "ملا محمد باقر آگاہ نے مراۃ الجنان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ویلور ان کا وطن تھا۔عالمگیر کے زمانا میں گزرے ہیں۔"(۱۴)

مذکور مباحث

ولی کا نام محمد ولی بادلیل لچھمی نارائن شفیق اور فتح علی گردیزی

ولی کو اورنگ آبادی لکھا ہے۔میر تقی میر اور لچھمی نارائن شفیق کے بیان کو ترجیح دی ہے۔

ولی کی شاہ وجیہ الدین گجراتی سے تعلق نسبی کے تمام اقوال کو قادری صاحب رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی کوئی تاریخی سند نہیں دی گئی ہے۔

آب حیات اور تذکرہ گل رعنا میں مذکور ولی کی دوسری آمد دہلی کو قادری صاحب رد کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس کی کوئی سند ان دو صاحبان نے نہیں بیان کی ہے۔(قادری صاحب پہلے محقق ہیں جنہوں نے دوسری آمد دہلی کو پہلے مرتبہ رد کیا ہے۔)

روضۃ الشہداء کو ولی سے منسوب کیا جاتا تھا۔ قادری صاحب کی تحقیق ہے کہ وہ ولی ویلوری کی تصنیف ہے نہ کہ ولی اورنگ آبادی کی۔

رسالہ "نور المعرفت" ولی کی تصنیف ہے۔ جو کہ تصوف پر ہے۔ (رسالہ نور المعرفت کے متعلق قادری صاحب کا بیان آب حیات اور گل رعنا سے مستعار ہے۔ یہ متحقق ہو چکا ہے کہ یہ رسالہ تصوف پر نہیں، بلکہ مدرسہ "ہدایت بخش" اور نور الدین صدیقی سہروردی کی مدح میں تحریر کیا گیا ہے۔)

اردو کی ادبی تاریخیں /۱۹۵۸:

عبد القادر سروری کی کتاب "اردو کی ادبی تاریخیں" نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار مینار حیدرآباد سے پہلی بار ۱۹۵۸ میں شائع ہوئی۔ اردو زبان و ادب کا عہد بعہد ارتقاء زمانی اعتبار سے مختصرا پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ادبی سرگرمیوں کو سلاطین و حکمرانوں کے عہد سے جوڑ کر دیکھا گیا ہے۔ اورنگ آباد اورنگ زیب کا مستقر بنا۔ اور اس کے عہد میں دکنی ریاستوں کا خاتمہ ہو گیا تھا اس لئے تہذیبی و ادبی روایتوں کے دونوں دھارے ایک ساتھ آکر ملنے لگے۔ ولی کو عبد القادر سروری عہد اورنگ زیب کا شاعر لکھتے ہیں۔ اور ان کی دہلی آمد عہد محمد شاہ میں بتاتے ہیں :

> "ولی اسی زمانے میں دہلی آئے۔ اور ان کے کلام کی بڑی قدر ہوئی تھی۔ ولی کی ملاقات شاہ سعد اللہ گلشن سے بھی ہوئی۔ شاہ صاحب کے روحانی کمالات کے ولی بڑے معتقد ہو گئے۔ ولی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ شمال ہند میں تو وہ مشعل ہدایت ہی بن کر آئے۔۔۔۔۔ اردو میں شعر کہنے کی تحریک وہاں آگ کی طرح پھیل گئی۔"(۱۵)

یہ تاریخ مختصر ہے اور اس میں تفصیلی مباحث سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس میں سے جو نکات نکلتے ہیں وہ یہ ہیں

عہد اورنگ زیب میں اورنگ آباد کا ایک ادبی مرکز میں صورت پذیر ہونا۔

مندرج نکات:

ولی کا عہد اورنگ زیب میں ہونا۔

ولی کا محمد شاہ کے عہد میں دہلی آنا۔ اور ان کی شاعری کا شہرہ اور اہل شمال کا اس کی پیروی کرنا۔

شاہ گلشن سے ملاقات اور ولی کا ان کا معتقد ہونا۔ (ملاقات کی تفصیل میں مصنف نہیں گئے ہیں)

دکن میں اردو/۱۹۲۳۔۱۹۸۵:

دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی کی مشہور کتاب ہے۔اس میں دکنی ادب کے آغاز اور سلطنت آصفیہ کے خاتمہ تک تمام ادبی کار گزاریوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔یہ پہلی بار ۱۹۲۳ میں شائع ہوئی۔اس کی اشاعت اول کے بعد کئی اشاعتیں عمل میں آئیں اور یہ کتاب حک و اضافہ سے گزرتی رہی۔اس کی چھٹی اشاعت تک کتاب کی شکل کافی حد تک بدل گئی ہے اور معلومات میں اضافہ کے ساتھ پچھلے شامل مواد میں ترمیم بھی کی گئی ہے۔مقدمہ میں اس کی چھٹی اشاعت کے بابت بات کرتے ہوئے اس میں ترمیم و اضافہ کا ذکر کیا ہے۔لیکن ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، نئی دہلی نے لکھا ہے کہ اس میں کچھ نئے حقائق کے سامنے آجانے کی بنا پر نظر ثانی کے لئے اس کی اشاعت رکوادی گئی ہے۔اس کی پہلی اشاعت آج جس صورت میں یہ کتاب دستیاب ہے ۱۹۸۵ء میں ترقی اردو بیورو نئی دہلی سے عمل میں آئی۔ہم اس کی چھٹی اشاعت کے نسخہ کو اپنی تحقیق میں شامل کریں گے۔کیوں کہ حک و اضافہ سے اس کتاب کی شکل تبدیل ہو گئی ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے ولی کا ذکر تیسرے دور "مغلیہ اردو ۱۱۰۱ھ تا ۱۱۳۶ھ میں رکھا ہے۔عہد اورنگ زیب میں دکن کا ادبی پس منظر بیان کرتے ہوئے ولی کے ذکر کے ساتھ اس عہد کے ۱۱۰۰ھ کے بعد کے شعرا اور ان کی تصانیف کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ولی کے گجراتی الاصل ہونے کی آراء کو نصیر الدین ہاشمی صاحب رد کرتے ہیں۔ان کی دلیل ہے کہ:

> "ولی کے ہم عصر اور دوست شاہ ابو المعالی کے فرزند کا قلمی دیوان انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔اس میں انہوں نے ولی کو دکنی شاعر تسلیم کیا ہے۔اور گجرات کو دکھن میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔"(۱۶)

ولی کا صحیح نام ولی محمد بتاتے ہیں۔اس کی بھی دلیل ابو المعالی کے فرزند کے قلمی دیوان میں مذکور نام ہے۔گجرات میں اقامت پذیر ی اور تحصیل علم کے علاوہ شاہ وجیہ الدین سے فیض حاصل کرنے کو بھی مرقوم کرتے ہیں۔سفر دہلی کی تقریبا اسی روایت کو نصیر الدین صاحب نے بھی روایت کیا ہے کہ پہلی مرتبہ عالمگیر کے عہد میں اور پھر محمد شاہ کے عہد میں مع دیوان آئے۔محی الدین قادری زور کی تحریر "دہلی میں اردو شاعری" کا حوالہ دیتے ہوئے یہ اضافہ کیا ہے کہ پہلی آمد دہلی پر اپنی شاعری کے سبب شہرت پائی اور اہل دہلی نے ان کی پیروی کی۔سنہ وفات مولوی عبد الحق کی تحقیق ۱۱۱۹ھ کو راجح خیال کیا ہے۔

ولی کے عروضی اور فارسی و عربی استعداد پر محمد حسین آزاد نے کلام کیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے ان کا حوالہ دیئے بغیر اس بات کی تردید کی ہے کہ:

> ''خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی عربی اور فارسی معلومات بہت محدود تھیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ولی کی حیثیت مجدد کی سی ہے۔ اس نے عربی و فارسی کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں، ان کو گویا اردو میں اسی حیثیت میں منتقل کر لیا گیا ہے۔ ولی ایک فطری شاعر تھا۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اپنی شاعری کو عربی و فارسی لفظیات کی کتاب یا لغت بنادے۔''(۱۷)

بلوم ہارٹ نے روضتہ الشہدادہ مجلس کو ولی کی تخلیق بتایا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کا کہنا ہے کہ یہ ولی کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ولی ویلوری کی ہے۔ جن کا پورا نام میر ولی فیاض تھا۔(۱۸)

ولی کے ضمن میں اس تاریخ سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں:

ولی گجراتی نہیں ہیں دکنی ہیں۔ حوالہ سید ابوالمعالی کے فرزند کا قلمی دیوان۔

ولی کا صحیح نام ولی محمد ہے۔ حوالہ سید ابوالمعالی کے فرزند کا قلمی دیوان۔

گجرات میں قیام، تحصیل علم اور وجیہ الدین سے کسب فیض۔

دو مرتبہ سفر دہلی ۱۔ عہد عالمگیر ۲۔ عہد محمد شاہ۔ پہلی آمد پر دہلی میں ولی کی شاعری کا شہرہ۔ دوسری آمد مع دیوان

سنہ وفات ۱۱۱۹ھ بحوالہ مولوی عبدالحق کی تحقیق (رسالہ اردو میں شامل مضمون۔ ص ۴۹۴)

ولی علم عروض اور عربی فارسی سے کماحقہ واقف نہ تھے اس بیان کی تردید۔

روضتہ الشہدادہ مجلس ولی کی تصنیف ہے اس کی تردید۔

تاریخ ادب اردو/ جمیل جالبی :

اب تک کی لکھی گئی تاریخوں میں جمیل جالبی کی تاریخ سب سے زیادہ اکمالیت کا احساس کراتی ہے۔ اس میں ادبی روایت کے تسلسل کے ساتھ ساتھ اس کے لسانی ارتقاء کے تدریج کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اردو زبان کے آغاز سے لے کر عہد بہ عہد اس

میں رونما ہوئیں تبدیلیوں و تغیرات اور اس کے لسانی سیاق کو اس تاریخ میں مد نظر رکھا گیا ہے۔اور نفس مضمون کے حتی الامکان تمام ابعاد کو احاطہ میں لانے کی سعی کی گئی ہے۔اس سے قبل کی تاریخوں میں ادبی وقوعات و کارگزاریوں کو بیان کرنے تک ہی ادبی مورخین نے خود کو محدود رکھا ہے۔جمیل جالبی کی کوشش رہتی ہے کہ اولاوہ نفس موضوع کا پورا احاطہ کریں اور اس کے متعلق جتنے آراء وبیان منظر پر آچکے ہیں اسے بھی بحث میں شامل کریں۔اور اختلافی مسائل میں شواہد و دلائل کی روشنی میں کسی راجح قول وراے کا اتباع کریں یا اس پر کسی نئی دلیل کا اضافہ کریں۔

ولی کا ذکر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کے جلد نمبر ایک میں کیا گیا ہے۔ولی کے تمام اختلافی امور اور مباحث پر جمیل جالبی حتی الامکان محتوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔جمیل جالبی کی اس تاریخ میں ولی پر سب سے پہلے ان کے نام،وطن،احباب ،وفات،سفر دہلی کے اختلاف فیہ مسائل پر بحث کے ساتھ ہی ان کی شعری خصوصیات پر بھی خاصے کام کی گفتگو کی گئی ہے۔یوں جمیل جالبی کے ان مباحث کو ہم دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ایک وہ جو اختلافی ہیں اور ایک شاعرانہ کمال و خصوصیات پر۔

ولی کے سفر دہلی اور شاہ گلشن سے ملاقات و مشورہ کے باب میں جمیل جالبی میر تقی میر اور قائم کے بیانات کی پوری طرح پیروی کرتے ہیں۔یعنی ولی پہلی بار ۱۷۰۰ میں دہلی آئے۔دوسری آمد محمد شاہی کے دوسرے جلوس میں ہوئی۔ولی کی ملاقات دہلی میں شاہ گلشن سے ہوئی اور انہوں نے فارسی کے بے کار پڑے مضامین کو اپنے کلام میں برتنے کا مشورہ دیا :

> ”جب ولی کا دیوان جلوس محمد شاہی کے دوسرے سال ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۸ء میں دلی پہنچا اور وہاں کے شعرا نے اس میں وہ رنگ و نور دیکھا،جس کے دیکھنے کو ان کی آنکھیں ترستی تھیں تو انہوں نے بھی فارسی کو چھوڑ کر اسی رنگ سخن کی پیروی شروع کر دی۔اسی کے ساتھ نئی شاعری کا آغاز ہو گیا اور اردو ادب قدیم دور سے جدید دور میں داخل ہو گیا۔“(۱۹)

آزاد نے ولی کے علمی استعداد پر جو سوال قائم کیا تھا اس پر بھی جمیل جالبی نے گفتگو کی ہے کہ

> ”یہ بات غیر ضروری ہے کہ اس نے درس نظامیہ پورا کیا تھا یا نہیں ”بدر چاچ“اور”شمس بازغہ“پڑھی تھی یا نہیں۔لیکن اس کے کلام سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس اتنا علم ضرور تھا جتنے علم کی اسے ضرورت تھی۔“(۲۰)

جمیل جالبی ولی کا نام "ولی محمد "درست سمجھتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ گلشن گفتار،مخزن الشعرا چمنستان شعرا،تذکرہ ریختہ گویاں ،مجموعہ نغز،تذکرہ مسرت افزا اور سید ابو المعالی کے فرزند کے نقل کردہ دیوان میں بھی ولی کا نام ولی محمد لکھا ہے۔دیوان ولی کے قلمی نسخے محمد شاہی کے آٹھویں سال ۱۱۳۸ھ ۱۷۲۵ء میں لکھا گیا اور پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے اس میں ولی کا نام سید ولی محمد لکھا ملتا ہے۔اس کے علاوہ ثناء اللہ کے ۱۷۲۵ء میں لکھے ہوئے نسخے میں بھی یہی نام مرقوم ہے۔جمیل جالبی کہتے ہیں کہ سید محمد تقی ولی سید ابو المعالی کے لکھے ہوئے نام کو بھی اگر ہم تسلیم نہ کریں کہ ولی ان کے والد کے عزیز ترین دوست تھے اور وہ ان کے سفر و حضر میں ساتھ ہوتے تھے تو ہم کس محقق پر اعتبار کریں۔جمیل جالبی سید نجیب اشرف ندوی کی تحقیق کہ ولی شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے تھے،رد کرتے ہیں۔تمسک نامہ کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے،جس میں ولی کا نام ولی اللہ لکھا ملتا ہے۔اس کے متعلق جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ ہم کیسے مان لیں کہ یہ وہی شاعر ولی ہیں۔

وطن ان کا دکن بتاتے ہیں۔ولی کے باپ دادا گجرات سے دکن ہجرت کر گئے تھے۔جیسے غالب اکبر آباد کے اور نذیر احمد بجنور کے ہونے کے باوجود دہلی میں آکر دہلوی ہو گئے اسی طرح گجرات سے نسبت کے باوجود ولی دکن آکر دکنی ہو گئے۔جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ اتنے مشہور شاعر ہونے کے باوجود احمد آباد کی کسی تاریخ کتب میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔

جمیل جالبی نے ولی کا سال وفات ۱۷۲۰ء اور ۱۷۲۵ء کا درمیانی عرصہ ثابت کیا ہے۔مولوی عبد الحق نے دیوان ولی کے جامع مسجد بمبئی کے قلمی نسخہ میں ایک قطعہ دریافت کیا جس سے ولی کی سال وفات کی سند لائی گئی ہے اور انہیں ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۷ء میں متوفی قرار دیا گیا ہے۔وہ قطعہ یہ ہے:

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل والئ ملک سخن صاحب عرفاں ولی

سال وفاتش خرد از سر الہام گفت بادشاہ ولی ساقی کوثر علی (۲۱)

اس سے تاریخ وفات 1118+1=1119ھ نکلتی ہے۔

جمیل جالبی نے اس تاریخ وفات کو تسلیم نہیں کیا ہے۔اور اس پہ سوالات قائم کر کے اسے رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے دلائل بیشتر قائم اور مصحفی کے بیان سے مستنبط ہیں۔البتہ ایک دلیل جو فراقی کی مثنوی مراۃ الحشر سے مستنبط کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ ولی نے فراقی کے ایک مصرع کی تضمین کی ہے۔

جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ فراقی کی سن ولادت ۱۶۸۵ء ہے۔ اور ان کی مثنوی مراۃ الحشر ۱۷۲۰ء میں لکھی گئی ہے جیسا کہ مثنوی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔ یعنی ۱۷۲۰ء میں فراقی ۳۶ سال کے تھے۔ اور ولی کی وفات کا سنہ ۱۷۰۷ء ہے۔ اس حساب سے فراقی کی عمر ۲۲ر ہی ہوگی۔ ولی نے ظاہر ہے ۱۷۰۷ء سے قبل ہی ان کے مصرع کی تضمین کی ہوگی جب فراقی اٹھارہ انیس سال کے رہے ہوں، ظاہر ہے ولی جیسی شہرت یافتہ شخصیت سے بعید ہے کہ وہ اٹھارہ انیس سال کے بچے کے شعر پر مصرع گرہ لگائے۔ اس کے علاوہ فراقی اسی مثنوی میں مرحوم شعرا کا ذکر کرتا ہے جس میں ولی کا ذکر شامل نہیں ہے، اگر وہ مر چکے ہوتے تو فراقی ان کا ذکر مرحوم شعرا میں ضرور کرتے۔

جمیل جالبی نے ولی کی شاعری میں وہ تمام عناصر تلاش کرنے کی سعی کی ہے جو بعد میں جا کر اردو شاعری میں واضح شکل و صورت میں رجحانات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ متنوع مضامین، مختلف خیالات، خارجیت کے ساتھ داخلیت کا احساس، حسن و عشق کا مجازی و حقیقی تصور، ایہام وغیرہ۔ جمیل جالبی کے الفاظ میں:

> ''آگے چل کر جتنے رجحانات نمایاں ہوئے وہ خواہ عشقیہ شاعری کا رجحان ہو یا ایہام پسندی کا، لکھنوی شاعری کی خارجیت اور مسی چوٹی والی شاعری ہو، مسائل تصوف کے بیان والی شاعری ہو یا ایسی شاعری ہو جس میں داخلیت اور رنگا رنگ تجربات کا بیان ہو یا اصلاح زبان و بیان کی تحریک ہو، سب کا مبدا اولی ہے۔ ولی کا اجتہاد اتنا بڑا ہے کہ اردو غزل نے جو رخ بھی بدلا اس میں ولی ہی کو رہبر پایا۔''(۲۳)

۔ جمیل جالبی نے ولی کے کلام میں غزل کے آہنگ و لے کو بھی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور غزل کے اس لے و راگ کو ولی کے مرہون منت جانا ہے جس لہجہ سے آج ہم متعارف ہیں:

> ''ولی کی لے اس کے ترنم اور لہجے سے اردو شاعری کا مخصوص ترنم اور لہجہ قائم ہوتا ہے۔ اردو شاعری کی قدرتی راگ (Rhythm) کو دریافت کرنے میں بھی اولیت کا سہرا ولی ہی کے سر بندھتا ہے۔'' (۲۴)

دکن میں زبان کی دو صورتوں کی وہ تحقیق جو عبدالستار صدیقی نے اپنے مضمون ''ولی کی زبان'' میں پیش کی ہے۔ اس کا عادہ بھی یہاں نظر آتا ہے کہ دولت آباد سے باہر دکنی علاقوں کی زبان اور دوسری دولت آباد اور اس کے نواح کی زبان جس کا مرکز اورنگ آباد تھا۔ مغلوں کی فتوحات دکن نے شمال و جنوب کو ایک کیا جس سبب شمال کی زبان ایک بار پھر دولت آباد اور اورنگ آباد میں تیزی سے پھیلی :

"یہی وہ زبان ہے جو ولی کو ایک حد تک بنی بنائی ملی اور جسے اپنا کر تخلیقی صلاحیتوں سے اپنی شاعری کو نکھارا جس میں فارسی طرز احساس نے، کلچر، زبان، اسالیب، لہجے، موضوع، ذخیرہ الفاظ اور محاوروں نے ایک ایسا مخصوص رنگ زبان و سخن پیدا کیا جو ولی کے ساتھ مخصوص ہے۔"(۲۵)

جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ ولی کی شاعری و زبان سے اردو کے دو دھاروں کا بھی پتہ ملتا ہے۔ جمیل جالبی نے ولی کی زبان کو بعد میں وجود میں آنے والے اردو کے دو اسکولوں کا منبع بھی لکھا ہے۔ جس کے تحت "فارسی پن" اور "اردو پن" کو بنیاد بنا کر زبان کے دو رخوں کو متعین کیا گیا ہے۔(۲۶)

جمیل جالبی نے ولی کے معاصرین اور بعد کی نسل میں آنے والے شعرا کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور ولی کے شاگردوں میں اشرف ،رضا اور ثنا وغیرہ کا نام درج کیا ہے۔ ولی کے معاصرین اور ولی کے زمانے سے متصل شعرا میں سید محمد فراقی(۱۰۹۷ھ - ۱۱۴۴ھ /۱۶۸۵ء-۱۷۳۱ء)فقیر اللہ آزاد، مرزا داؤد بیگ داؤد اور نگ آبادی ولئی ثانی (م۔ ۱۱۵۷ھ ۱۷۴۴ء)سراج (۱۱۲۸ھ ۱۱۷۷ھ /۱۷۱۵ء-۱۷۶۳ء)اور شاہ قاسم علی قاسم جن کا انتقال بارہویں صدی کے اواخر میں ہوا،وغیرہ کو مذکور کیا ہے۔۔ فائز ،حاتم،ناجی، مضمون، آبرو، یک رنگ وغیرہ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ وہ شعرا ہیں جن سے ولی کی ملاقات رہی ہوگی یا جنھوں نے ولی کا کلام سنا ہوگا۔

جمیل جالبی کی تاریخ سے ہمیں جو نکات ملتے ہیں وہ یہ ہیں:

سفر دہلی اور شاہ گلشن والی روایت میں میر اور قائم کے بیانات کی پیروی

ولی کے علمی استعداد کے متعلق خیالات کا اظہار کہ ان کے پاس اتنا علم تھا جس قدر انہیں ضرورت تھی خواہ انہوں نے بدر چاچ و شمس بازغہ نہ پڑھی ہو۔

ولی کا نام "ولی محمد" تھا۔ سید ابو المعالی کے فرزند کے نقل کردہ دیوان میں مذکور نام کو سند میں پیش کرنا۔

ولی کا وطن دکن تھا۔ جبکہ ان کے اجداد گجرات سے ہجرت کے کے دکن میں آباد ہو گئے تھے۔ دلیل ہے کہ احمد آباد کی کسی تاریخ میں ولی کی اتنی شہرت کے باوجود ان کے حال کا مذکور نہ ہونا۔

ولی کی سال وفات کے متعلق مولوی عبد الحق کی تحقیق کردہ تاریخ ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۷ء کی تردید

ولی کی شاعری میں اردو کی شعری روایت کے عناصر (تنوع مضامین،خارجیت داخلیت، عشق حقیقی و مجازی، تصوف،ایہام)کی تلاش۔

ولی کی شاعری میں مستعمل راگ و بحر نے اردو شاعری کا مخصوص لہجہ اور ترنم فراہم کیا،اس نکتہ کی وضاحت

ولی کی زبان کے ذریعہ اردو کے دو اسکول کی بنیاد پڑتی ہے ایک جس میں "اردو پن" ہے اور دوسری جس کو "فارسی طرز" کہاجاتا ہے بقول فراق۔

ولی کے معاصرین فراقی، آزاد، قاسم،داؤد،اور سراج اور ولی کے شاگرد اشرف،رضا اور ثنا وغیرہ ہیں۔

سخنوران گجرات/۱۹۸۱:

سخنوران گجرات میں ولی کا تذکرہ دراصل اس بات کا اشارہ ہے کہ ولی گجرات سے تھے نہ کہ اورنگ آباد دکن سے۔ ظہیر الدین مدنی نے ولی کے باب میں کئی نئی معلومات کا اضافہ کیا ہے۔رسالہ نور المعرفت ان کی دریافت ہے۔اور یہ کہ رسالہ نور المعرفت مدرسہ ہدایت بخش"اور نور الدین صدیقی سہروردی کی تعریف میں بازبان فارسی تحریر کیا گیا ہے۔اسی رسالہ نور المعرفت سے ولی اور شاہ گلشن کی شاگردی اور استادی کے تعلق کا علم بھی ہوتا ہے۔لکھتے ہیں کہ:"شاہ گلشن کو نور المعرفت میں اپنا استاد گردانتا ہے۔اس لئے گمان غالب ہے کہ فارسی میں شاہ گلشن کے سامنے اس نے زانوے ادب تہ کئے ہوں گے۔کیوں کہ شاہ صاحب فارسی کے شاعر تھے۔"(۲۷)

ولی کا نام محمد ولی اللہ لکھتے ہیں۔ولی کے نام کے باب میں "ولی گجراتی "کتاب میں ظہیر الدین مدنی نے بحث کی ہے۔شاہ وجیہ الدین کے خاندان کے ایک بزرگ سید منظور حسین علوی المعروف بہ حسینی کی فراہم کردہ دستاویز کا حوالہ دیا ہے۔جس پر ولی اور ان کے خاندان کے افراد کے دستخط پائے جاتے ہیں۔ولی کی مہر جس نام سے ثبت ہے وہ یہ ہے:

خاک نعلین غوثی محمد ولی اللہ بن شریف محمد علوی"

اس کے علاوہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا دریافت کردہ تمسک نامے کا بھی حوالہ دیا ہے جس پر ولی اور اس کے بیٹوں کے بھی دستخط موجود ہیں۔ جس میں ولی کا نام ولی اللہ بن محمد شریف علوی مرقوم ہے۔ ملفوظات کبیری جو کہ ولی کے ہم جد سید عبد الملک کی تصنیف کردہ ہے ۱۰۴۵ھ تا ۱۰۶۰ھ اس میں بھی شریف محمد کی اولادوں کا ذکر موجود ہے۔ تحریر یوں ہے:

"از محمد شریف چار پسر -میاں عبد الرحمن و میاں حبیب اللہ و میاں خلیل اللہ و میاں ولی اللہ و دو دختر۔"(۲۸)

ظہیر الدین مدنی لکھتے ہیں کہ ولی شاہ وجیہ الدین سے یوں نسبت رکھتے تھے کہ وہ شاہ صاحب کے بھائی شاہ نصر اللہ کی اولادوں میں سے تھے۔ ولی کی سنہ پیدائش قیاسا ۱۶۴۹ء لکھتے ہیں،اور وطن گجرات۔ شمس ولی اللہ اورنگ آبادی سے خلط ملط کرنے کے سبب لوگوں نے انہیں اورنگ آبادی لکھا ہے۔ ان کا کلام انڈیا آفس میں پایا جاتا ہے۔ ولی گجراتی کے علمی استعداد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ علوم عقلی و نقلی میں کامل تھا۔ اور عروض و صنائع بدائع میں کامل الفن تھا۔ صنعت ایہام ولی سے قبل کی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ ولی ہی نے فارسی شعریات اور سنسکرت میں رائج الفاظ کے ذو معنین وصف کو کسب کر کے اردو میں مستعمل کیا اور ادو شاعری کو ایہام جیسی صنعت سے مزین کیا۔ ظہیر الدین مدنی کا گمان ہے کہ ولی نے شاہ وجیہہ الدین علوی اور نور الدین صدیقی سہروردی کی درسگاہوں سے کسب علم کیا ہو گا۔ شمس الدین، کامل، اکمل کو ان کے رشتہ داروں میں شمار کیا ہے ،اشرف، رضی ان کے شاگرد فراقی، آزاد کو ان کے معاصر بتایا ہے ان کے ہندو دوستوں کا نام بھی درج کیا ہے ولی کے دیوان میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ گوبند لعل، کھیل داس، بیر لعل، امرت لعل وغیرہ۔ آگے لکھتے ہیں کہ بیجا پور کے بزرگ ہاشم ولی کے چچا تھے اور ان کے خاندان کے کئی لوگ اورنگ آباد، بیجا پور کے باسی تھے اس لئے سفر دکن بھی ولی نے کیا ہو گا، سورت کا سفر دیوان ولی میں شامل سورت کی تعریف میں کہی گئی نظم سے ثابت ہے۔ اور ولی فریضۂ حج کے لئے حرمین کے بھی مسافر رہے ہیں

۔

سفر دہلی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ولی ۱۷۰۰ء میں دہلی گئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام بھی کیا ہو گا کیوں کہ ان کے استاد شاہ گلشن وہاں موجود تھے۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ولی کا تعلق شاہ گلشن سے استادی و شاگردی کا دہلی آمد سے قبل ہی رہا ہو گا کیوں کہ شاہ گلشن کی اصل احمد آباد ہے اور ان کے خاندانی رشتے برہان پور میں اقامت پذیر تھے۔ جہاں ان کی آمد بھی ہوتی تھی۔ اس لئے ان کی شاگردی کا تعلق دہلی سے قبل ہی رہا ہو گا۔ آمد دہلی کے بعد ولی کی شاعری کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ دہلی آمد کے بعد ولی نے شعر گوئی شروع کی ہو کیوں کہ ولی کی وفات جیسا کہ اس قطعہ سے ثابت ہوتا ہے ۱۷۰۹ء جو مولوی

عبدالحق نے دریافت کیا اور جس کے لکھنے والے احمد آباد کے مفتی محمد احسن ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ ولی ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے ہوں اور ۱۷۰۷ء میں دیوان جمع کر لیا ہو۔ اتنے قلیل عرصہ میں دیوان جمع کرنا بعید از قیاس ہے۔

ولی کی وفات ۱۷۰۹ء ۱۱۱۹ھ ۴ شعبان عصر کے وقت احمد آباد میں ہوئی۔ (۱۱۱۹ھ سے ۱۷۰۷ بر آمد ہوتے ہیں۔ ۱۷۰۹ غالباً سہوا لکھ گیا ہے بقول فاروقی)۔ ولی کو ان کے آبائی قبرستان نیلی گنبد میں دفن کیا گیا۔ یہ چینی پیر کے نام سے شہرت رکھتے ہیں کیوں کہ ان کی قبر پر چینی کے ٹکڑے جڑے ہیں۔

ولی کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ ان کی تربیت خانقاہی ماحول میں ہوئی اس لئے ان کی شاعری میں بھی تصوف، اور متصوفانہ خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی شاعری غم جاناں اور غم دوراں سے مرکب ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اس کی شاعری کا تھوڑا سا حصہ ایسا ضرور ہے جس میں اس نے تصوف کے نکات کو پیش کیا ہے مگر بیش تر حصہ ایسا ہے جہاں مجاز و حقیقت کے دو رویوں کو ایک کر دکھایا ہے۔ لہذا ایسے کلام کو جس عینک سے دیکھا جائے ویسا ہی نظر آئے گا۔''(۲۹)

اس تاریخ سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

ولی کا نام ولی اللہ ہے۔ اور والد کا نام شریف محمد علوی یا محمد شریف علوی ہے۔

قیاسی سنہ پیدائش ۱۶۴۹ء

ولی کا وطن گجرات ہے۔ شمس ولی اللہ اورنگ آبادی دوسرے شاعر ہیں جو اورنگ آباد کے ہیں۔ لوگ دونوں کے ناموں میں یکسانیت کی وجہ سے خلط ملط کا شکار ہوئے ہیں۔

انہوں نے شیخ وجیہہ الدین علوی اور نور الدین صدیقی سہروردی کے درسگاہوں سے کسب علم کیا تھا۔

ولی ایک بار دہلی آئے، ۱۷۰۰ء میں۔

شاہ گلشن سے ان کی شاگردی کا رشتہ تھا اور آمد دہلی سے قبل ہی رہا ہو گا۔ ولی نے فارسی میں انہیں استاد کیا ہو گا، کیوں کہ شاہ گلشن فارسی کے شاعر تھے۔

شاہ گلشن کے مشورہ کے بعد شاعری کی روایت درست نہیں کیوں کہ ولی کی وفات ۱۷۰۹ میں ہوئی، اتنی جلدی دیوان کا جمع ہونا ممکن نہیں۔

ولی کی وفات ۱۱۱۹ھ ۴ شعبان بوقت عصر احمد آباد میں ہوئی اور آبائی قبرستان نیلی گنبد میں مدفون کئے گئے۔

ولی کے معاصر فراقی اور آزاد ہیں جبکہ اشرف اور رضی شاگرد۔

ہندو دوستوں میں گوبند لعل، امرت لعل، کھیل داس بیر لعل کے نام ولی کے دیوان میں ملتے ہیں۔

ولی کے عزیزوں میں شمس الدین، اکمل و کامل کا نام درج کیا ہے۔

ولی شاہ وجیہ الدین کے بھائی شاہ نصر اللہ کی اولادوں میں سے ہیں۔

شاہ گلشن کا اصل وطن احمد آباد تھا جہاں سے ان کے اجداد ہجرت کر کے برہان پور میں سکونت اختیار کرتے ہیں۔ شاہ گلشن وہاں سے دہلی منتقل ہو جاتے ہیں اور دہلی میں قیام پذیر ہو جاتے ہیں۔

تاریخ ادب اردو/ سیدہ جعفر۔ گیان چند جین/ جولائی ۱۹۹۸ء:

سیدہ جعفر تاریخ ادب اردو میں ولی کے باب میں اب تک کے دستیاب حقائق کو زیر بحث لاتی ہیں۔ ان حقائق کا اندراج کافی تفصیل سے سیدہ جعفر نے اپنی تاریخ کی کتاب میں کیا ہے۔ محققین کی آراء اور ان کے دلائل کو بیان کرتے ہوئے سیدہ جعفر اپنے موقف کا بہت واضح اظہار تو نہیں کرتی ہیں۔ البتہ وقوعوں کے بیان میں دلائل کی ترتیب ہمیں ان کے نکتہ نظر تک لے جانے میں سعی ضرور کرتی ہے۔ مثلاً، شاہ گلشن اور ولی کے استادی و شاگردی کے تعلق کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ شاہ گلشن کا تعلق برہان پور اور احمد آباد سے بھی ہے اور احمد آباد جانا بعد قیام دہلی ثابت بھی ہے تو ولی اور گلشن کی استادی اور شاگردی کا سلسلہ دہلی سے قبل ہی قائم ہوا ہو گا اور دہلی میں ولی کے آمد کے بعد جس ملاقات کو روایت کیا جاتا ہے، اس سے پہلے بھی گلشن سے ولی کی ملاقات رہی ہو گی۔ میر کا بیان کہ ولی کو مضامین فارسی بکار لانے کا مشورہ شاہ گلشن نے دیا اور قدرت اللہ کا بیان کہ زبان دکھنی کے بجائے ریختہ کو اردوے معلی کے موافق کرو، کے متعلق لکھتی ہیں کہ ان دونوں بیانات میں تضاد ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتی

ہیں کہ ولی کی شاعری میں اول اول ضرور ہندوستانی رنگ ثابت ہوتا ہے اور ولی کی شاعری میں پہلے فارسی طرز و مضامین کے بجائے ہندوستانیت کی چھاپ تھی۔اس کے ساتھ ہی آب حیات میں مذکور مضمون کا وہ شعر بھی نقل کرتی ہیں،جسے ولی کا دہلی میں ایک عرصہ قیام کے لئے بطور دلیل ابراہیم سایانی نے پیش کیا ہے۔اور اس کو رد کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ شعر مضمون کا ہے۔ابراہیم سایانی کا کہنا ہے کہ ولی چالیس سال دہلی میں ٹھہرے۔اس کے بعد زور کا قول نقل کیا ہے کہ ولی ایک نہیں دو بار دہلی آئے۔اور اس پر نورالحسن ہاشمی کی تردید کہ ولی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ولی دوبار دہلی آئے اس کا سبب یہ ہے کہ آب حیات میں آزاد نے مضمون کا وہ شعر نقل کیا ہے:

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

غرض سیدہ جعفر ولی کے کسی بھی اختلافی مسئلہ میں یہ طریقہ اختیار کرتی ہیں کہ تقریبا سارے اقوال اس امر کے متعلق نقل کر دیئے جائیں۔البتہ دلائل کی ترتیب کا خیال رکھتی ہیں۔اس سے ولی کے باب میں کی گئی تحقیقات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ولی کے چچا حفیظ اللہ علوی ولی کے برادر نسبتی جمیل ولی کی رفیقۂ حیات،صاحبزادی علامہ شریف صدیقی اور ولی کے دوست اکمل اور ان کے بھائی کامل کے متعلق تمام معلومات ظہیر الدین مدنی و سخاوت مرزا کی تاریخ ادب اردو علی گڑھ سے مستعار ہیں۔اسی طرح ولی کی سنہ وفات کے متعلق تمام آراء کو یکجا کیا ہے اور آخر میں مولوی عبد الحق کے دریافت کردہ قطعہ تاریخ جس سے ولی کی سنہ وفات

۱۷۰۷ نکلتی ہے مندرج کیا ہے۔

ولی کے نام کے ضمن میں بھی تمام آراء کے اندراج کے بعد ملفوظات کبیری کو حوالہ بناتے ہوئے ۱۰۶۰ھ/۱۶۴۹ء ولی کا نام ولی اللہ لکھا ہے۔ملفوظات کبیری کی جو تحریر نقل کی ہے وہ یہ ہے:

"از شریف محمد چار پسر،میاں عبد الرحمن،میاں حبیب اللہ،میاں خلیل اللہ و میاں ولی اللہ۔۔۔۔"(۳۰)

ولی کو شاہ وجیہ الدین علوی کے خاندان سے منسوب کیا گیا ہے سیدہ جعفر نے لکھا ہے کہ ولی کا سلسلہ نسب شاہ وجیہ الدین کے بجائے ان کے بھائی شاہ نصر اللہ سے ملتا ہے۔ یہ معلومات ظہیر الدین مدنی کی تحقیق سے مستعار ہے (بحوالہ سخنوران گجرات ص۸۵)

"حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب کے بھائی شاہ نصر اللہ سے ولی کا سلسلۂ نسب ملتا ہے اور ان کا شجرہ شاہ ولی اللہ ابن شریف محمد بن سید عبدالرحمن بن احمد بن سید بہاء الدین بن شاہ نصر اللہ حسینی قرار پاتا ہے۔"(۳۱)

ولی کی ولادت کب ہوئی اس بحث میں عبدالجبار ملکاپوری کی تحقیق ۱۰۷۹ھ کو رد کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ ولی کے والد کی وفات چونکہ ۱۰۷۲ھ ۱۶۶۱ء میں ہوئی اس حساب سے ولی کی سنہ پیدائش اس سے قبل کی ہونی چاہیئے۔ آگے ظہیر الدین مدنی کے قیاس ۱۶۴۹ء کو نقل کرتی ہیں۔ ولی کے وطن کے متعلق بھی تمام آراء کے بیان کے بعد لکھتی ہیں کہ چونکہ ولی نے گجرات کے فراق میں جو نظم کہی ہے اس طرح کی نظم کوئی اپنے وطن کے بارے میں ہی کہہ سکتا ہے۔ سیدہ جعفر کے الفاظ میں ولی کو گجرات سے وہی انس تھا جو کسی کو اپنے وطن سے ہو سکتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ولی کے وطن کے بحث میں سیدہ جعفر کا جھکاؤ کس طرف ہے۔ ولی کے اسفار میں سورت، بغرض حج حرمین شریفین کا سفر، دکن کا سفر اور دہلی کے سفر پر کلام کیا ہے۔ لکھتی ہیں کہ ولی نے دکن کا سفر کیا تھا کیوں کہ ان کے رشتہ دار بیجاپور اور اورنگ آباد میں سکونت پذیر تھے۔ بیجاپور کے مشہور صوفی شاہ ہاشم ولی کے چچا تھے۔

سفر دہلی کے متعلق سیدہ جعفر نے ڈاکٹر زور اور حکیم شمس اللہ قادری کے اقوال درج کئے ہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری کا بیان ہے کہ ولی عہد اورنگ زیب میں دہلی گئے اور ڈاکٹر زور کا کہنا ہے کہ ولی عہد محمد شاہ میں بھی دہلی گئے۔ ولی جب دہلی گئے اس وقت شاہ گلشن وہاں موجود تھے۔ شاہ سعد اللہ گلشن کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے اسلاف احمد آباد کے تھے جو بعد میں برہان پور میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اور شاہ سعد اللہ گلشن احمد آباد سے دہلی منتقل ہو گئے۔ ان کا تعلق احمد آباد برہان پور اور دہلی تینوں جگہوں سے تھا۔ آگے سرو آزاد میں آزاد بلگرامی نے نورالمعرفت سے جو ایک اقتباس نقل کیا ہے جس سے ولی کا شاہ گلشن کا مرید اور شاگرد ہونا معلوم ہوتا ہے اسے درج کیا ہے۔

ولی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے مرتبین اور محققین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جنہوں نے ولی کے غیر مطبوعہ کلام پر تحقیق کی ہے اور تحقیق پیش کی ہے ان میں میاں اختر جوناگڑھی،عالی جعفری،نصیر الدین ہاشمی،مختار الدین احمد،ڈاکٹر غلام مصطفی خاں اور اکرام چغتائی کے نام شامل ہیں۔ دیوان اشرف گجراتی میں ولی کے الحاقی کلام کی تحقیق میاں اختر جوناگڑھی نے کی ہے ۔اکرام چغتائی نے نور الحسن ہاشمی کے مرتب کردہ دیوان (جس میں تمام غیر مطبوعہ کلام کو شامل کر لیا گیا ہے،)میں شامل ایک غزل جو نور الحسن ہاشمی نے ولی سے منسوب کر لیا ہے،اس کی تحقیق کی ہے اور کہا ہے کہ یہ غزل ولی کی نہیں بلکہ حسن کی ہے۔ جس کا شعر یہ ہے:

سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ
کہ جوں گل سے نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

سیدہ جعفر نے رسالہ نور المعرفت کے متعلق بھی کلام کیا ہے۔ رسالہ نور المعرفت جسے سید ظہیر الدین مدنی نے دریافت کیا ہے اس پر ان کی کتاب "رسالہ نور المعرفت تصنیف ولی شاعر ہندی "انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔اس سے قبل رسالہ نور المعرفت کا متن رسالہ "اردو "جولائی ۱۹۴۷ء میں شائع کر دیا گیا تھا۔ شیخ چاند نے اس رسالہ کے بارے میں لکھا ہے،یہ شیخ محمود کرمانی کے رسالہ "سلوک "کا نثری ترجمہ ہے۔اس پر ظہیر الدین مدنی اور سخاوت مرزا کی دلیل ہے کہ یہ وہی ولی ہیں جو شاہ گلشن کے شاگرد ہیں۔ یہ رسالہ فارسی نثر میں ہے۔اور اس میں شیخ نور الدین صدیقی کے حالات ان کی مدح اور ان کے فرزند شیخ صالح کی مدح،اور ان کے مدرسہ "ہدایت "کی تعریف میں تصنیف کیا گیا ہے۔ آزاد نے اسے تصوف پر مبنی رسالہ لکھا تھا جو درست نہیں ہے۔۔اس رسالے کی ۱۲۷۰ ھ میں سید نور الدین حسین فائق نے نقل تیار کرائی تھی

۔

ولی کی شاعری کے اثرات شمالی ہند پر،اس ضمن میں سیدہ جعفر لکھتی ہیں کہ ولی سے قبل شمالی ہند میں جعفر زٹلی،اٹل بلگرامی ،اور خواجہ عطا بانکہ وغیرہ ازرہ تفنن فارسی میں ہندی کا پیوند لگایا کرتے تھے۔ لیکن ولی کے سبب شمالی ہند میں اردو غزل نے باقاعدہ اپنے پیر جمائے اور وہاں غزل گوئی شروع ہوئی۔ حاتم،آبرو،اور فائز وغیرہ نے ولی کی زمینوں پر غزلیں کہیں۔اور ولی کی استادی کا اعتراف کیا۔ سیدہ جعفر لکھتی ہیں کہ ولی نے بیجا پور اور گولکنڈہ کے شعرا کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں،اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ گولکنڈہ اور بیجاپوری شعرا سے متاثر تھے۔اور ان سے کسب و خوشہ چینی بھی کی ہے۔اس کے علاوہ ایک

سوال اور اٹھایا ہے کہ ولی سے قبل گجراتی شعرا مثلا، علی جیو گام دھنی، خوب محمد چشتی، قاضی محمود دریائی، اور شاہ ہاشم وغیرہم اپنے شعری زبان کو گجری و گوجری لکھتے ہیں اور ولی کے معاصرین میں امین وہاشم خود کو گجراتی لکھتے ہیں پھر ولی خود کو دکھنی کیوں لکھتے ہیں۔ ان کے شعر سے جیسا کہ معلوم ہوتا ہے وہ اپنی شاعری کو دکھنی شاعری کہتے ہیں۔ اور دکھنی شعرا سے متاثر بھی معلوم ہوتے ہیں ۔ شعر ہے:

دکھنی میں میرے شعر سن شوقی ہوئے تیرے ولی
جس نے لگیا دل کے تئیں خوش شعر تجھ دیوان کا

نوٹ : نورالحسن ہاشمی کے مرتب کردہ دیوان کے ضمیمہ میں غزل نمبر چار میں یہ شعر یوں درج ہے۔

دکھن میں تیرے شعر سن شوقی ہوئے تیرے ولی
جس کے لگیا ہے دل کے تئیں خوش شعر تجھ دیوان کا

یہ شعر دیوان کے ضمیمہ میں شامل ہے اور نورالحسن ہاشمی کا کہنا ہے کہ یہ یقینی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غزلیں ولی کی ہی ہیں۔

دکھنی زباں میں شعر سب لوگاں کہے ہیں اے ولی
لیکن نئیں بولا کوئی یک شعر خوشتر زیں نمط

اور یہ کہ ولی کی کلیات میں شاہی، سلطان کی طرحیں اور مشتاق اور غواصی سے متاثر ہونے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

سیدہ جعفر ولی کی شاعری میں متصوفانہ اور عاشقانہ رنگ دونوں کی شمولیت کا بیان کرتی ہیں۔ اور انھیں انسان دوست، انسان کے باطنی رویوں کا شاعر بتاتی ہیں۔ ان کی شاعری میں متصوفانہ رجحانات اور ارضی خصوصیات کی تلاش بھی کی ہے۔ جب کہ ولی کی

شاعری میں تصوف کے مضامین بہت کم ہیں۔ کائنات اور خالق حقیقی کے متعلق ولی کے مضامین اس نوع کے نہیں جو بعد کے شعرا میں خالص متصوفانہ مضامین کے طور برتے گئے ہیں۔

> ''احترام آدمیت انسانی انداز، مسلک عشق اور متصوفانہ طرز و فکر ولی کی شاعری کی اہم خصوصیات بن گئی ہیں ۔ولی نے اپنے کلام میں دوسرے صوفی شعرا کی طرح خیال کی اولیت پر زور دیا ہے اور شہودی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے ۔ان کے بہت سے اشعار صوفیانہ واردات اور عارفانہ بصیرت کے ترجمان ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ان کی شاعری میں حیات کی نبض شناسی بھی ہے اور مادی زندگی کے مزاج کا شعور بھی۔''(۳۲)

احسن مارہروی نے ولی کی غزل کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جو دہلی آمد سے قبل کہی گئی ہیں اور دوسرے وہ جو دہلی آمد کے بعد کہی گئی ہیں۔ سیدہ جعفر کہتی ہیں کہ آمد دہلی سے قبل اور بعد کے خانوں میں تقسیم کر کے لوگوں نے ولی کی شاعری میں دکنی رویوں اور فارسی طرز کی نشاندہی کرنے اور اس خیال کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ ولی کی شاعری میں دو لسانی دھارے اور شعری روایات پائی جاتی ہیں، جبکہ یہ درست نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر ولی کی زبان میں دکنیت زیادہ ہوتی اور دکنی محاورے کا اثر زیادہ ہوتا تو دلی میں ولی کی پذیرائی اس نوع کی نہ کی جاتی۔ اور شاہ گلشن کے مشورے والی روایت کو رد کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ولی اگر شاہ گلشن کے مشورے کی پیروی کرتے ہوئے بقول قدرت اللہ اردوے معلی کے مطابق اپنی زبان کو کر لیتے تو دکھنی شعرا کے لئے ان کی زبان اور شاعری کیوں کر دلچسپ رہ جاتی۔ اس لئے شاہ گلشن کے مشورے کی ولی کو چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ ولی کے عہد میں دکھنی زبان خود بخود بتدریج لسانی ارتقاء سے گزر رہی تھی اور فارسی اثرات کو خود میں ضم کر رہی تھی۔ ولی اپنے عہد کے اسی لسانی تبدیلی کے موقع پر ظہور کرتے ہیں، اور شعری روایت کو ایک نئی طرز و زبان دے جاتے ہیں جس میں دکھنی کے ساتھ ساتھ شمالی آہنگ بھی شامل ہے، زبان کی سطح پر بھی اور شعریات کی سطح پر بھی کہ ولی اپنے پیش روؤں سے زبان نہیں البتہ مضامین و آہنگ ضرور اخذ کرتے ہیں۔

اس تاریخ کے مطالعہ سے جو معلومات سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں:

*ولی کا نام ولی اللہ ہے، بحوالہ ملفوظات کبیری۔

*ولی کے والد کا نام، شاہ ولی اللہ ابن شریف متوفی ۱۰۷۲ھ ۱۶۶۱ء

*ولی کی سال پیدائش ۱۶۶۱ء سے قبل از رہ قیاس ظہیر الدین مدنی ۱۶۴۹ء

*وطن گجرات "در فراق گجرات "نظم میں ان کی گجرات سے انسیت کی بنا پر

*ولی کے چچا اور برادر نسبتی اور ان کی رفیقہ حیات کے متعلق معلومات (بحوالہ ظہیر الدین مدنی)

*شاہ گلشن سے آمد دہلی سے قبل ہی برہان پور اور احمد آباد میں ملاقات کا امکان

*ولی کے غیر مطبوعہ کلام پر جن محققین نے کام کیا ہے ان پر کلام

*رسالہ نور المعرفت ولی کا تصنیف کردہ ہے جو شیخ نور الدین صدیقی اور ہدایت نامی مدرسہ کی تعریف میں لکھا گیا ہے ۔یہ رسالہ فارسی زبان میں تحریر کیا گیا ہے ۔

* آزاد کے اس بیان کی تردید کہ یہ رسالہ تصوف پر لکھا گیا ہے ۔

*شیخ چاند نے اسے رسالہ "سلوک "کا نثری ترجمہ کہا ہے جو شیخ کرمانی کی تصنیف تھی ۔

*یہ رسالہ ۱۱۱۱ھ اور ۱۱۱۹ھ کے درمیان لکھا گیا ہے ۔

*حاتم، آبرو اور فائز نے ولی کی زمینوں پر غزلیں کہی ہیں ۔

*ولی نے گولکنڈہ اور بیجاپوری شعرا اور اپنے ماقبل شعرا سے کسب فیض کیا ہے اور ان کی زمینوں پر غزلیں کہی ہیں ۔

*ولی کی شاعری میں متصوفانہ اور عاشقانہ رنگ

*احسن مارہروی کے اس خیال کی تردید کہ ولی کی غزلوں میں چونکہ دکھنی اثرات پائے جاتے ہیں اور فارسی طرز بھی ۔اس سبب جو دکھنی طرز کی غزلیں ہیں وہ ولی نے دہلی آمد سے قبل کہی گئی ہیں اور جو فارسی طرز کی غزلیں ہیں وہ دہلی آمد اور شاہ گلشن سے مشورہ کے بعد کی ہیں ۔

*شاہ گلشن والی روایت کو قبول نہیں کرتی ہیں کہ ولی کی دہلی میں اس قدر پزیرائی نہ کی جاتی ۔

*ولی کے عہد میں زبان جس تدریجی مراحل سے گزر رہی تھی اور اپنے اندر فارسی اسالیب و طرز کو سمونے کے راہ پر تھی ولی اسی عہد میں اسی زبان کی پیروی کرتے ہیں، نہ کہ شاہ گلشن کے مشورے کی ۔

اردو کا ابتدائی زمانہ/ شمس الرحمن فاروقی /۱۹۹۹ء:

اردو کا ابتدائی زمانہ شمس الرحمن فاروقی کی مشہور زمانہ کتاب ہے۔اس میں پہلی بار کچھ ایسی نئی معلومات کا انکشاف کیا گیا ہے جو اب تک کی اردو کی تاریخوں میں مذکور نہیں۔ شمس الرحمن فاروقی کی اس کتاب میں ولی کے متعلق ایک باب ''ولی نام کا ایک شخص'' کے نام سے شامل ہے۔اس میں ولی کے نام اور وطن احباب وغیرہ کے متعلق بات نہ کر کے فاروقی صاحب نے ولی کی سنہ وفات اور شاہ گلشن کی مشہور روایت اور اہل شمال کے تعصب پر مدلل بحث کی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کا کہنا ہے کہ ولی کی سنہ وفات کو ۱۷۲۰ء اور ۱۷۳۵ء تک اس وجہ سے کھینچ کر پہنچایا جاتا ہے کیوں کہ ولی کی وفات جس قدر تاخیر سے ثابت کی جاے گی۔ اتنا ہی اہل دہلی کا احسان ان پر ثابت ہو گا اور جس قدر دہلی /اور فارسی مشورے کا احسان ثابت ہو گا ولی کے شعری کارنامہ کی وقعت کم ہو گی۔

شمس الرحمن فاروقی ولی پر دہلوی احسان کی تردید میں کئی دلائل پیش کرتے ہیں۔ مولوی عبد الحق کا دریافت کردہ قطعۂ تاریخ جس سے ولی کی سال وفات ۱۷۰۷ء نکلتی ہے،اس کے مختلف فیہ ہونے کو فاروقی صاحب بیان کرتے ہوئے ولی کے کثرت سے دستیاب نسخوں کو حوالہ بناتے ہیں کہ جس شاعر کا دیوان اس کی وفات کے برسوں بعد تک کثیر تعداد میں پائے جاتے رہے ہوں اس سے گمان تو یہی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بے حد مقبول و مشہور شاعر تھا کہ ولی نہ کوئی ولی اللہ تھے اور نہ بزرگ کہ ان کے اقوال کو امتداد زمانہ کے باوجود محفوظ کیا جاتا رہے۔

فاروقی صاحب کی کتاب میں ولی سے متعلق جو باتیں درج ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ ۲۶ر ربیع الاول ۱۱۲۰ھ ۱۵ جولائی ۱۷۰۸ء کا سب سے قدیم نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ جس شاعر کی مقبولیت مسلم ہے اس نے اگر ۱۷۰۸ء کے بعد شاعری کی ہوتی تو کیوں کر اس کا کلام محفوظ نہ کیا جاتا۔ دہلوی شعرا کے کچھ اشعار ولی کے معترف ہونے کی دلیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ان اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے اس راے کو تقریبا قبول نہیں کیا ہے کہ دہلوی شعرا نے ولی کے اعتراف میں وہ اشعار کہے ہیں سوا ے حاتم کے کہ حاتم اپنے پیش رو کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ قائم اور میر کی روایت آمد دہلی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ہے کہ ولی ۱۷۰۰ء میں دہلی آکر شاہ گلشن سے مستفید ہوتے ہیں اور ان کی برکت سے شاعری کا آغاز کرتے ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ولی دہلی آمد سے قبل شاعری کر رہے تھے تو شاہ گلشن والی روایت کی چنداں ضرورت نہیں

رہتی ۔ فاروقی صاحب نے شاہ گلشن والی روایت پر ایک سوال یہ بھی قائم کیا ہے کہ آخر شاہ صاحب نے اتنے عرصہ کیوں انتظار کیا کہ کوئی دہلی سے باہر کا آئے تو اسے یہ قیمتی مشورہ دیں ۔ اور شاہ گلشن فارسی کے شاعر تھے ۔ ان سے بڑے شاعر بیدل اور سرخوش موجود تھے اگر مشورہ دینے کا کسی کو حق بھی تھا تو بیدل کا تھا ۔ ان دلائل سے فاروقی صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر ولی ۱۷۰۸ء میں انتقال کر گئے اور ۱۷۰۰ء دہلی آکر شاہ گلشن کے مشورے کے مطابق شاعری کا آغاز کرتے ہیں تو اتنے قلیل عرصہ میں کیسے ممکن ہے کہ ولی نے پورا دیوان جمع کر لیا ہو ۔ اس کے علاوہ فاروقی صاحب نے اپنے دعوی کو مدلل کرنے کے لئے دہلوی اور اورنگ آبادی زبان میں موجود نسبتوں کو حوالہ بنایا ہے ۔ فاروقی صاحب نے اس عہد کی اورنگ آباد دکن کی زبان کے معاملے میں عبد الستار صدیقی کی راے کا ندراج کیا ہے کہ اورنگ آباد اور دولت آباد میں اہل شمال کی آمد ،اورنگ زیب کے اورنگ آباد میں ایک طویل عرصہ تک قیام نے دکھنی علاقہ میں دو قسم کی زبانوں کی پرورش کی ایک جس پر شمال سے آئے ہوئے لوگوں کے اثرات زیادہ پڑے دوسرے جو دولت آباد کے علاقے سے باہر درواڑی علاقوں میں رائج رہی ۔ عبد الستار صدیقی نے اپنے مضمون "ولی کی زبان" میں لکھا ہے کہ اس وقت اورنگ آباد کی زبان دہلی کی زبان سے خفیف اختلاف رکھتی تھی لیکن یہ وہی زبان تھی جو اس وقت دہلی میں رائج تھی ۔ اردوے معلی کی زبان ۔ ولی اورنگ آبادی اسی زبان کو اپنی شاعری میں بروے کار لاتے ہیں ۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ "ولی کے زمانے کی اورنگ آبادی اردو (اور غالبا احمد آبادی اردو بھی) دہلی کی زبان سے بہت مختلف نہ تھی ۔"(۳۳)

فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ شاہ گلشن سے تعلیم کی روایت تو بعید از قیاس ہے البتہ ولی اپنا پیش رو حسن شوقی کو مانتے ہیں ۔ ولی نے محض ایک اردو شاعر کا ذکر اس انداز میں کیا ہے جس سے اس کو تسلیم کرنے کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ حسن شوقی ہے ۔ یعنی حسن شوقی ولی کے وہ پیش رو ہیں جس سے ولی اکتساب کرتے ہیں ۔

مندرج نکات

ولی کی سنہ وفات ۱۷۰۷ء یا ۱۷۰۸ء ہے ۔

ولی کا شاہ گلشن کے مشورہ قبول کرنے کی تردید کی ہے ۔

ولی کی شاہ گلشن سے ملاقات دہلی آمد سے قبل ممکن ہے ۔ ولی اور گلشن کی شاگردی استادی کسی اور چیز کے لئے ہوگی ۔

۱۷۰۰ء ولی دہلی آئے۔

شاہ گلشن سے ولی کے اکتساب کرنے کی روایت کا عقلی دلائل سے رد۔

دکھن اور ولی کے باب میں اہل دہلی کا تعصب۔

ولی کے پیش رو دہلی شعرا کے بجائے حسن شوقی ہیں۔ جن کی شعری سرمایے سے انہوں نے کسب کیا ہو گا۔ کیوں کہ ولی کی شاعری حسن شوقی کی شاعری کی قماش کی شاعری ہے۔

ولی کی زبان اورنگ آبادی ہے۔ ولی کے عہد میں جو زبان اورنگ آباد میں بولی جاتی تھی اس پر دہلوی اثرات کی نشاندہی۔

اردو ادب کی تاریخ/ڈاکٹر تبسم کاشمیری /۲۰۰۶:

تبسم کاشمیری کی تاریخ ادب اردو، اس وقت کی تازہ ترین تاریخوں میں سے ہے۔ اس میں ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک ادبی کارنامے اور واقعات جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ تبسم کاشمیری نے ولی کے باب میں ان کے نام اور وطن کے اختلافی مسائل پہ نہ توجہ کر کے اس لسانی ارتقاء پہ کلام کیا ہے جو ولی کی شاعری میں کارفرما نظر آتی ہے۔ تبسم کاشمیری دکھنی زبان کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مرکز گریز اور مرکز جو۔ کہتے ہیں کہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں دکھنی زبان لسانی سطح پر بہت تیز رفتاری کے ساتھ تبدل پذیر ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ تک دکھن میں زبان کی مرکز گریز روایت جاری و ساری نظر آتی ہے۔ مغلوں کی دکھن میں فتوحات کے باعث آہستہ آہستہ یہ روایت مرکز سے قریب ہوتی جاتی ہے۔ تبسم کاشمیری کہتے ہیں کہ دکھن کی زبان دراصل شمال کی ہی زبان ہے۔ جب تک وہ مرکز یعنی دہلی سے دور اور اپنی مقامیت کو برقرار رکھتی ہے، اس میں دکھنی عنصر کی فراوانی نظر آتی ہے اور جب سقوط گولکنڈہ و بیجاپور کے بعد یہ روایت مرکز جو روایت سے قریب آتی ہے، تو دہلوی اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں اور مقامی اثرات دبنے لگتے ہیں۔ ولی دراصل اسی مرکز جو روایت کے پہلے شاعر ہیں۔ اور ولی اسی اورنگ آبادی زبان کی اتباع کرتے ہیں جو دہلوی لوگ فتح دکھن کے بعد وہاں لے کر آئے۔ (یہ ساری باتیں وہی ہیں جو عبدالستار صدیقی نے اپنے مضمون "ولی کی زبان میں عرض کیا ہے)۔

ولی کا سفر دہلی ۱۷۰۰ء لکھتے ہیں دوسرے دفعہ کی آمد کو اختلافی درج کرتے ہیں ۔ البتہ اس وقت تک دیوان ولی کے دہلی پہنچ جانے کے بارے میں بھی بتاتے ہیں ۔ تبسم کاشمیری کے الفاظ میں:

"۱۷۰۰ء کے اسی دور میں سرزمین دکن سے رسد کا ایک سلسلہ پہلی مرتبہ شمال کی جانب روانہ ہوتا ہے ۔ یہ کوئی فوجی رسد نہیں تھی

یہ ایک ذہنی رسد تھی ۔ اور اس رسد کو دلی کے دروازوں تک پہنچانے والے کا نام ولی تھا ۔"(۳۴)

ولی نے یہ سفر اپنے دوست سید ابوالمعالی کے ہمراہ کیا ۔ تبسم کاشمیری یہ سوال بھی قائم کرتے ہیں کہ ولی کا یہ سفر، سفر شوق تھا یا اسکی کوئی اور وجہ تھی؟ ولی کے کلام سے اس کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا ۔ دوسرے یہ کہ ولی نے اپنے دیگر اسفار مثلاً سورت، حرمین شریفین پر کلام لکھا پھر سفر دہلی پر کچھ اظہار کیوں نہ کیا؟

شاہ گلشن سے مشورے والی روایت کے ذیل میں تبسم کاشمیری محمد صادق اور شمس الرحمن فاروقی کی رائے کا تتبع کرتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی ان کی یہ دلیل بھی ہے کہ شاہ گلشن والی روایت کو نہ ماننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس عہد میں ولی شاعری کر رہے ہیں اسی عہد میں ان کے دیگر معاصرین بھی اسی نوع کی شاعری کرتے نظر آتے ہیں اور اسی زبان کا تتبع کرتے ہیں ، کہتے ہیں کہ ولی کے معاصرین کے بارے میں کیا کہا جائے گا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ شاہ گلشن کے مشورے سے ولی نے اس نوع کی شاعری کی، کیوں کہ وہ بھی اسی طرز کی غزلیں کہہ رہے ہیں جس طرز کی ولی نے غزلیں کہی ہیں ۔

تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

"یہ تتبع کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ یہ اس دور کے عمومی لسانی شعور اور بدلی ہوئی ادبی فضا کا اثر تھا ۔ ولی اور ان کے معاصرین اسی شعور اور اسی ادبی فضا سے فیض یاب ہو رہے تھے ۔ نہ کہ شاہ گلشن کی ہدایات سے ۔۔۔۔۔۔ ولی کو فارسی اسلوب اختیار کرنے کا جو مشورہ دیا گیا تھا وہ پہلے سے ولی کے عہد کا تجربہ بن چکا تھا ۔ شاہ گلشن کے اس مشورے کو غور سے دیکھیں تو یہ الٹا ان کے خلاف جاتا ہے ۔ اس مشورے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ وہ دکن کے بدلے ہوئے اسالیب سے ناواقف تھے ۔ ورنہ وہ ایسی بات ہرگز نہ کہتے ۔"(۳۵)

ولی کے نام ۔ وطن ۔ مدفن اور سنہ وفات کے متعلق اس تاریخ میں کوئی بحث نہیں اٹھائی گئی ہے البتہ پہلے سے اٹھائے گئے مباحث کا حوالہ دے دیا ہے ۔ ولی کی تعلیم شیخ نور الدین احمد آباد کے مدرسے "ہدایت بخش" میں ہوئی ۔ رسالہ نور المعرفت انھیں کے اوصاف میں تحریر کیا گیا ہے ۔ ولی کے اسفار کے متعلق لکھتے ہیں کہ ولی نے احمد آباد بغرض تعلیم ،اورنگ آبادی خاندانی مراسم ،برہان پور بغرض حصول علم سفر کئے ۔ دہلی کے علاوہ سورت اور حج کے لئے بھی سفر کیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے وطن کے بارے میں مصنف کی کوئی واضح رائے نہیں ہے ۔

ولی کی شاعری پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ولی کی شاعری میں تخاطب کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں ۔ ایک آواز خود کلامی کی ہے اور دوسری محبوب سے تخاطب کی ہے ۔ خود کلامی کی آواز میں ولی اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترتے ہیں ۔ ذات کے اندروں میں رہنے اور اندر ہی اندر گم ہونے اور دریافت کرنے کا عمل ولی کے یہاں بھی نظر آتا ہے ۔ تخاطب میں محبوب سے مکالمہ اور پاس بلانے کا انداز ملتا ہے ۔ (ٹی ایس ایلیٹ نے شاعری میں تین طرح کی خود کلامی اور تخاطب کی بات لکھی ہے ۔ یہ دونوں قسمیں اسی زمرے سے تعلق رکھتی ہیں ۔

تبسم کاشمیری کہتے ہیں کہ ولی کی شاعری میں فکر و فلسفہ نہیں پایا جاتا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دکھنی شعری روایت میں خارجیت یعنی بدنی شاعری رہی ہے ۔ دکھنی شاعری میں سراپا نگاری ہے ۔ اور فکری عنصر سے خالی ہے ۔ ولی اسی شعری روایت کی غیر محسوس طریقہ سے پیروی کرتے ہیں ۔ ولی کے یہاں بھی سراپا نگاری کی مثالیں بہت کثرت سے ملتی ہیں ۔ وزیر آغا نے ولی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ بت پرست تھا ۔ تبسم کاشمیری لکھتے ہیں کہ وہ بت پرست ہی نہیں بت تراش بھی تھا ۔ اور یہ کہ ولی نے جس بت کی تراش خراش کی ہے وہ شمالی ہند کا محبوب ہے جو جور و جفا اور لطف و کرم سے مرکب ہے ۔ اور ولی سانولے حسن سے بھی مسحور ہیں ۔ یعنی ولی شمال و جنوب دونوں نوع کے محبوب کی تراش خراش کرتے ہیں ۔ دکھنی محبوب کا یہ رنگ ولی پر آکر ختم ہو جاتا ہے ۔

تبسم کاشمیری نے ولی کے شعری خصائص کے متعلق نقادوں کی آراء پر اظہار خیال کیا ہے ۔ مثلاً ولی کے تصور حسن و عشق کو دیگر نقادوں نے تنزیہی و تجریدی دائروں میں رکھنے کی کوشش کی ہے ۔ تبسم کاشمیری کہتے ہیں اس کی وجہ یہ رہی کہ ولی کو خانقاہی اور متصوفانہ حصار سے باہر نہ دیکھ سکنے کے سبب ولی کی شاعری میں اس زاویے کو اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ جب کہ ولی کی شاعری حسن و عشق کی شاعری ہے ۔ اس میں تصوف کا بیان بھی وہ گہرائی نہیں رکھتا جو بعد کی شاعری میں

متصوفانہ مضامین کی شمولیت نے شعری اسالیب میں رنگ آمیزی کی۔ جن حضرات نے ولی کی شاعری کو متصوفانہ مضمون تک محدود کرنے کی کوشش کی ہے وہ درست نہیں ہے۔ کیوں کہ ولی حسن و عشق کی زندہ کیفیات کا شاعر ہے۔

نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے، ولی کا عشق محض مجازی عشق ہے اور یہ عشق حقیقی کے سفر کی پہلی منزل ہے۔ اس خیال پر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''وہ سمجھتے ہیں کہ ولی کی ساری شاعری وحدت الوجودی اثرات سے مملو ہے اور حسن کے سارے مظہر محض مجازی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ نورالحسن ہاشمی کے نقطۂ نظر سے یہ لگتا ہے کہ وہ ولی کو محض شاہد حسن سمجھنے پر قناعت کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ کیا بہتر نہیں کہ ہم یہ سمجھیں کہ وہ ایک شاعر تھا، عاشق مزاج تھا اور تہذیبی روایت کے طور پر تصوف کا پیرو کار تھا۔ اور حسن کی کیفیات اس کے لئے محض مجرد نہیں تھیں۔''(۳۶)

تبسم کاشمیری لکھتے ہیں کہ ولی کی شاعری نے اردو روایت کو ایک کلیت عطا کی۔ اردو کی شاعری میں جو الگ الگ رنگ پائے جاتے تھے، شمالی اور دکنی رنگوں میں منقسم تھے، ولی نے اس کو یکجا کیا۔ اور اسے ایک راہ پر لا کھڑا کیا۔ اسی کو تبسم کاشمیری نے کلیت سے تعبیر کیا ہے۔

اس تاریخ سے ہمیں یہ نکات حاصل ہوتے ہیں۔

عہد ولی میں مرکز گریز روایت مرکز جو روایت بن جاتی ہے۔ اور ولی اسی مرکز جو روایت کے پہلے شاعر بن کر ابھرتے ہیں۔

ولی ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے۔

شاہ گلشن سے مشورے والی روایت میں محمد صادق اور شمس الرحمن فاروقی کی پیروی کرتے ہیں۔ اور یہ کہ ولی کے عہد میں یہ زبان ولی

کے معاصرین بھی برتتے ہوئے نظر آتے ہیں اس لئے شاہ گلشن کی مشورے کی انہیں ضرورت نہ تھی۔

ولی کی شاعری ارضی ہے، وہ حیات اور حسن و عشق کا شاعر ہے۔ محض تجریدی حسن کا نہیں بلکہ عشق کی زندہ کیفیات کا عاشق مزاج شاعر تھا۔

ولی کی شاعری میں محض متصوفانہ رنگ تلاش کرنے والے خیالات کی تردید ۔

اردو ادب کی انگریزی تاریخوں میں ذکر ولی

A HISTORY OF URDU LITERATURE BY RAM BABU SAKSENA /1927

مرزا عسکری نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے ساتھ ہی کچھ مواد کا اضافہ بھی کیا ہے۔اس لئے رام بابو سکینہ کے کیے گئے مباحث میں جہاں انہوں نے اضافہ کیا ہو گا اس کا بھی بیان کیا جائے گا۔رام بابو سکینہ نے اس کتاب میں ولی کا تذکرہ شعرائے اورنگ آباد کے باب میں کیا ہے۔ولی کے نام کے متعلق اختلافات کو درج کیا ہے۔کچھ محققین کا خیال ہے کہ ولی کا نام شمس الدین اور تخلص ولی ہے اور کچھ ان کا نام محمد ولی،لقب شمس الدین اور تخلص ولی بتاتے ہیں۔بلوم ہارٹ ان کا نام شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں ۔آزاد شمس ولی اللہ بتاتے ہیں۔رام بابو سکینہ لکھتے ہیں کہ یہ سارا خلط ملط شمس ولی اللہ نام کے بزرگ کے سبب ہوا جو احمد آباد کے تھے۔ان کے نام اور ولی کے نام کی یکسانیت کی وجہ سے لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا۔(مرزا عسکری کے ترجمہ کردہ نسخہ میں اختلاف کنندگان کے نام اس طرح درج ہیں،میر حسن،مرزا علی لطف و نساخ اور بلوم ہارٹ کے نزدیک شاہ ولی اللہ نام ہے ۔اور نواب علی ابراہیم،یوسف علی اور آزاد شمس ولی اللہ کہتے ہیں۔(۳۷)

مقام پیدائش کے بارے میں بھی اختلاف درج کرتے ہیں۔میر کے نکات الشعرا کا حوالہ دیتے ہوئے،رام بابو سکینہ نے ولی کی جائے پیدائش اورنگ آباد لکھی ہے۔اور سنہ پیدائش ۱۰۷۹ھ ۱۶۶۸ء بتائی ہے۔رام بابو سکینہ نے ولی کی سنہ پیدائش کا کوئی حوالہ درج نہیں کیا ہے۔وجیہ الدین علوی سے ان کے خاندانی تعلق کو رام بابو سکسیہ تسلیم نہیں کرتے اور انہیں قادریہ شیوخ کے سلسلے سے بتاتے ہیں۔لکھتے ہیں:

> It is again mistake to connect him by birth with Shah Wajihiuddin Alvi ,as he is descended from the Qadria shaikhs of Aurangabad .He was however a religious pupil of the saint and the qasidas and Tarjih-bands which wali has written in his praise express only reverence and veneration of the disciple from his pir .There is no mention of wali in the list of the descendants of Shah Wajihuddin .(38)

ترجمہ :

خاندان وجیہ الدین سے متعلق کرنے کی یہ پھر وہی غلطی ہے جب کہ وہ اورنگ آباد کے قادریہ سلسلہ سے تھے ۔وہ شاہ وجیہ الدین سے بیعت تھے ۔ جو قصیدہ اور ترجیع بند اپنے پیر کے سلسلہ میں لکھا وہ دراصل ان کی عقیدت اور محبت میں لکھا ہے ۔ان میں ان سے خاندانی تعلق کا ذکر نہیں ہے ۔(ترجمہ ۔زبیر ملک)

رام بابو سکسینہ کہتے ہیں کہ ولی گجراتی نہیں تھے ۔ان کے کلام سے بھی ان کا گجراتی ہونا ثابت نہیں ہوتا ۔ جو لوگ ان کے گجراتی ہونے کی دلیل میں اس نظم کا حوالہ دیتے ہیں جو ولی نے فراق گجرات پر لکھی ہے،یہ نظم ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے ۔ کیوں کہ یہ ظم ولی نے گجرات کے فراق پر ملال کرتے ہوئے بطور سیاح لکھی ہے نہ کہ بطور متوطن ۔شہر سورت پر لکھی ہوئی نظم بھی انہیں گجراتی نہیں ثابت کرتی ۔

رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ اورنگ آباد میں ولی بیس سال رہے ۔ پھر بغرض تعلیم احمد آباد آئے ۔ جہاں شاہ وجیہ الدین کے مدرسے میں داخل ہوئے ۔احمد آباد اس وقت کا مشہور تعلیمی مرکز تھا ۔یہیں وہ شاہ صاحب کے مرید ہوئے ۔ کچھ عرصہ بعد وہ اپنے وطن واپس لوٹ آئے ۔یہاں شعر و شاعری شروع کی ۔ پھر احمد آباد گئے ۔وہاں اپنے احباب کو کلام سنایا،جسے ان لوگوں نے کافی پسند کیا ۔

ان تمام باتوں کا رام بابو سکسینہ نے کوئی حوالہ درج نہیں کیا ہے ۔

ولی کے سفر دہلی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ولی کا سفر دہلی دو مرتبہ بیان کیا جاتا ہے ۔ایک ۱۷۰۰ء میں جہاں وہ شاہ گلشن سے ملے اور انہوں نے ولی کو فارسی شعرا کے طرز پر ریختہ کا دیوان مرتبہ کرنے کا مشورہ دیا ۔دوسری بار محمد شاہ کے عہد حکومت کے تیسرے سال یعنی ۱۷۲۲ء میں سید ابو لمعالی کے ہمراہ ۔ جو کہ سرہند اور دہلی کی خانقاہوں اور صوفیا کی زیارت کیا کرتے تھے ۔ اس سفر میں ولی اپنا دیوان ساتھ لائے ۔ جو بہت مشہور ہوا ۔رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ ولی صوفی طریقت میں بھی شاہ گلشن کے شاگرد تھے ۔

۱۱۴۱ھ بمطابق ۱۷۳۰ء میں دہ مجلس مرتب کی ۔ مترجمۂ مرزا محمد عسکری میں اس مثنوی کے آخری دو شعر بھی درج کئے گئے ہیں جس سے اس تصنیف کی سنہ کتابت نکالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

رام بابو سکسینہ نے ولی کے ہندی دیوان کا ذکر کیا ہے۔ گلشن ہند کے مصنف کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ ولی نے ایک ہندی دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ رسالہ نور المعرفت کے ضمن میں گل رعنا کے مصنف اور آزاد کی کہی گئی باتوں کا اعادہ کرتے ہیں کہ ولی نے رسالہ نور المعرفت تصوف پر لکھا۔ جو کہ اب ناپید ہے۔

ولی کا انتقال گجرات میں ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۴ء میں رقم کیا ہے۔

ولی کے احباب کے نام سے عنوان قائم کر کے ان کے کچھ دوستوں کا نام درج کیا ہے، ولی کے اشعار میں جن کا ذکر ملتا ہے، مثلا لالہ کھیم داس اور نگ آبادی، سید ابوالمعانی احمد آبادی، امرت لال، گوہر لال، اور محمد یار خاں دہلوی۔

ولی کے اسفار میں رام بابو سکسینہ ستارا، دہلی سورت وغیرہ مقامات کا ذکر کرتے ہیں۔ بنگال کے متعلق لکھتے ہیں کہ گارساں دتاسی نے ان کا بنگال کا سفر کرنا لکھا ہے۔ رام بابو سکسینہ کہتے ہیں کہ چونکہ ولی کی شاعری میں حسن بنگال کی تعریف پائی جاتی ہے اس سے دتاسی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ولی نے بنگال کا سفر کیا ہے جبکہ ولی کا سفر بنگال پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔

مرزا محمد عسکری نے ولی کے معاصرین کا احوال لکھ کر اس میں اضافہ کیا ہے۔ داؤد جو کہ اورنگ آبادی تھے متوفی ۱۱۴۶ھ کو ولی کا معاصر لکھا ہے۔

اس تاریخ میں مندرج مباحث :

نام کے اختلاف کا ذکر۔ سنہ پیدائش ۱۶۶۷ء سنہ وفات احمد آباد ۱۷۴۴ء

ولی کا وطن گجرات نہیں اورنگ آباد ہے۔

ولی شاہ وجیہ الدین کے خانوادے سے نہیں البتہ ان سے بیعت تھے۔

ولی اورنگ آباد کے قادریہ سلسلہ سے تھے۔

اسفار، دہلی، سورت ستارا۔ دہلی کا سفر دو مرتبہ کیا۔ ۱۷۰۰ء میں اور ۱۷۲۲ء عہد محمد شاہی میں۔

ولی کے کلام میں احباب کا نام، کھیم داس اورنگ آبادی، سید ابوالمعانی احمد آبادی، امرت لال، گوہر لال اور محمد یار خاں دہلوی۔

دہ مجلس کی ترتیب ۱۷۳۰ء میں کی۔

ہندی دیوان بحوالہ مصنف گلشن ہند۔

شاہ گلشن کے شاگرد اور صوفی طریقہ میں بھی۔ شاہ گلشن کا ولی کو ریختہ کے دیوان کا فارسی طرز پر مرتب کرنے کا مشورہ۔

تصوف پر مبنی رسالہ نور المعرفت ولی کی تصنیف جو کہ اب ناپید ہے۔ بحوالہ آزاد اور مصنف گل رعنا۔

URDU LITERATURE by T. GRAHAME BAILEY /۱۹۲۹ء

اس کتاب کا ترجمہ سید محمد عصیم نے ۱۹۹۳ء میں کیا۔

یہ تاریخ گراہم بیلی نے ۱۹۲۸ء میں مکمل کی۔ یہ ایک مختصر تاریخ ہے جس میں ابتدا سے لے کر ۱۹۲۸ء تک کی ادبی تاریخ پر نہایت اختصار سے کلام کیا گیا ہے۔ باب دوم میں ولی کا ذکر ملتا ہے۔ ولی کا نام شمس الدین ولی اللہ، وطن اورنگ آباد، اسلاف کا تعلق گجرات سے تھا لکھا گیا ہے۔ اور وہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے نسبت رکھتے تھے۔ گراہم بیلی لکھتے ہیں کہ ولی بیس سال کی عمر میں بغرض تعلیم گجرات آتے ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ اورنگ آبادی اس لئے لگایا جاتا ہے کہ انہیں دکھنی نہ سمجھ لیا جائے یا ولی ویلوری نہ سمجھا جائے۔ ولی کی سنہ پیدائش ۱۶۶۷ء اور وفات ۱۷۴۱ء درج کی ہے۔ اس کا کوئی حوالہ درج نہیں کیا گیا ہے۔ شاہ گلشن سے ولی کی شاگردی کا بیان ہے۔ دہلی آمد پر شاہ گلشن سے ملاقات اور ان سے تعلیم کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”دہلی میں انہوں نے شاہ گلشن سے بیعت کی اور اپنا کلام انہیں دکھایا۔ وہ دکنی میں کافی بڑی تعداد میں شعر کہہ چکے تھے۔ کیوں کہ وہ دکنی لوگوں کے درمیان رہتے تھے۔ اور ان سے قبل دکن کے تقریباً سو شاعر گزر چکے تھے جس کے کلام سے وہ لازمی طور سے واقف رہے ہوں گے۔ ان کے استاد نے ان کی دکنی شاعری کے حسن سے متاثر ہو کر انہیں فارسی کو خیرباد کہہ دینے کا مشورہ دیا۔“(۳۹)

ولی کی دوسری مرتبہ آمد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہیں دہلی سے بہت لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس لئے ۱۷۲۲ء میں وہ دوبارہ دہلی مع اپنے دیوان کے آئے۔ اہل شمال جنہیں یہ خبر نہ تھی کہ تقریباً پچھلے چار سو سال سے اردو میں شاعری اور نثر بھی لکھی جا رہی ہے ،وہ ولی کے کلام سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور ولی کو دلی میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ان کا کلام دلی کے بازاروں میں گایا جانے لگا اور

اس طرح ولی نے دلی کو مسخر کر لیا۔ ولی کے کلام کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک چوتھائی کلام خالص دکنی رنگ کی شاعری ہے۔ دوئم ایسا اردو کلام جس میں دکنی الفاظ کافی حد تک پائے جاتے ہیں۔ تیسری وہ قسم ہے جو خالص اردو کلام ہے۔ اس قسم کی غزلوں کی تعداد ۴۲۲ درج کرتے ہیں۔

روضتہ الشہداء ولی سے منسوب کی گئی ہے، اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ ولی کی تصنیف نہیں بلکہ ولی ویلوری کی ہے۔ گراہم بیلی ولی کے کلام کی صفائی اور اسلوب سادہ کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ولی کو اردو کے صف اول کے بارہ بڑے شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور دہلوی شعرا کو اس زبان میں شاعری کی طرف توجہ دلا کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ فقیر اللہ آزاد کو ولی کا ہم عصر لکھا ہے۔ دکن میں ولی کے نو عمر معاصرین کا عنوان قائم کر کے ان میں ان شعرا کا نام درج کیا ہے:

> ہاشم علی، مرثیہ گو (۱۶۶۰ء/۱۷۶۰ء) مراثی کا ضخیم مجموعہ "دیوان حسینی "، امامی، رضا، سعید گجراتی، غلام، قادر ۱۷۳۶۔۱۷۴۰ سے قبل فوت ہو چکے تھے، یتیم احمد، سید اشرف ۱۷۱۳ میں جنگ نامہ حیدری کا ترجمہ کیا، معتبر خاں عمر ۱۷۳۰ء (انہیں محمد فیاض ولی کا شاگرد لکھا ہے) سید محمد ولیح، یہ شعرا مرثیہ گو تھے ان کے علاوہ معاصرین کے عنوان کے تحت مذکور شعرا یہ ہیں۔ سراج الدین سراج ۱۷۱۴ء۔ ۱۷۶۳ء، غلام قادر سمیع ۱۶۹۵ء ۱۷۸۲ء، سعید محمد ایک مثنوی فیض عام ۱۷۲۷ء میں لکھی، مرزا داؤد ۱۷۵۴ء میں فوت ہوئے، ولی اورنگ آبادی کے شاگرد ہیں۔ ۵۰۰ اشعار پر مشتمل ایک دیوان ہے۔ صابر انہوں نے ۱۷۴۳ میں ایک مثنوی خاوند و زوجہ کے فرائض پر لکھی، سید عبدالحئی خاں صارم ۱۷۲۹ء ۱۷۵۸ء نوجوانی میں فوت ہوئے۔ آصف جاہ کے وزیر تھے۔ (۴۰)

مندرج مباحث :

نام شمس الدین ولی اللہ، وطن اورنگ آباد۔

سنہ پیدائش ۱۶۶۷ء سنہ وفات ۱۷۴۱ء احمد آباد

اسلاف گجرات سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہ وجیہ الدین سے خاندانی نسبت۔ بیس سال کی عمر میں بغرض تعلیم گجرات آئے۔

شاہ گلشن ان کے استاد تھے۔ ان کی دکھنی شاعری دیکھ کر شاہ صاحب نے فارسی شاعری ترک کرنے کا مشورہ دیا۔

۱۷۲۲ء میں دوسری بار دہلی مع اپنے دیوان کے آئے، اور اہل دہلی پر اپنے اثرات چھوڑے۔

ولی کی شاعری کی درجہ بندی ۔ایک خالص دکھنی،دوسری اردو اور دکھنی ملی جلی ۔ تیسری قسم خالص اردو کی ہے جس میں ۴۲۲ غزلوں کا ذکر کیا۔

مرزاداؤد ولی کے شاگرد اور فقیر اللہ آزاد ولی کے معاصر تھے۔

ولی کے نو عمر معاصرین کے نام۔

دہ مجلس روصتہ الشھد اولی کی تصنیف نہیں بلکہ ولی ویلوری کی تصنیف ہے۔

A History Of Urdu Literature / Muhammad Sadiq /1964

محمد صادق دکن یعنی اورنگ آباد اور گجرات پر شمالی ہند کے اثرات کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فتح اورنگ زیب سے قبل شمالی اثرات محمد تغلق کے عہد میں ہی دکن پر مرتسم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اور مغلوں کی فتح کے بعد تہذیبی اور لسانی سطح پر اورنگ آباد اور شمال بہت قریب آگئے تھے۔ لسانی سیاق میں دیکھیں تو دراصل اورنگ آباد میں وہی زبان خفیف سے اختلاف اور لہجہ کے ساتھ بولی جاتی تھی جو دہلی میں رائج تھی۔اس وقت کی دکھنی زبان شاخ اورنگ آبادی سے موسوم کی گئی۔اس کا سبب دہلوی زبان کا دکھنی زبان پر اثرات ہیں ۔ اس سے امتیاز کے لئے اورنگ آبادی کا استعمال دراصل دہلوی زبان کے اثرات کا ایک واضح ثبوت ہے۔

اس کی دلیل میں عزیز اللہ ہمرنگ کی تفسیر چراغ ابدی ۱۸۰۶ء)وہ اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے زبان دکھنی ہندی اور زبان ہندی اورنگ آبادی محاورہ میں اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اقتباس یہ ہے:

> ”اگرچہ بعض عزیزوں نے زبان دکھنی ہندی آمیز میں تفسیر جزو آخر کی لکھی ہے لیکن بہ سبب الفاظ دکھنی لطف زبان ہندی کا پورا نہیں پاتا اور دل یاروں کا واسطے مطالعہ اس کے رغبت کم لاتا۔اس واسطے خاطر قاصر میں اس فقیر کی آیا کہ تفسیر جزو آخر کی زبان ہندی میں بالفعل اورنگ آباد کے لوگوں کا محاورہ ہے،لکھے۔“(۴۱)

لکھتے ہیں کہ اس اقتباس کی زبان خود اس بات کو پختہ کرتی ہے کہ اورنگ آبادی محاورہ دکھنی ہندی سے مختلف تھا۔اور اس پر مولوی عبدالحق کی مزید رائے بھی درج کی ہے کہ ملحوظ خاطر رہے کہ مصنف چراغ ابدی،اورنگ آبادی زبان کو دکھنی سے ایک علاحدہ زبان کی طرح ٹریٹ کر رہا ہے۔اور عہد شاہجہاں اور اورنگ زیب کی صوبیداری کے دور میں اورنگ آبادی شمال سے مسلسل قربت کے سبب بیجاپور اور حیدرآباد اور مدراس کی زبان سے بالکل مختلف زبان تھی۔

ولی کی سنہ پیدائش ۱۶۶۷ء لکھی ہے ۔ان کے نام کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ان کے حقیقی نام سے قریب میاں ولی محمد اور محمد ولی ہے ۔ولی کے گجراتی یا اورنگ آبادی ہونے کے باب میں اختلاف کو مذکور کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ولی کا وطن گجرات تھا یا دکن اس میں شدید اختلاف ہے ۔ محمد صادق نے ولی کو گجراتی کہنے والے محققین اور انھیں دکنی کہنے والے محققین دونوں کے دعوی اور دلیل کو پیش کیا ہے اور آخر میں اپنی راے درج کی ہے ۔ولی کو دکنی لکھنے والے محققین کی دلیل ہے کہ سید ابوالمعالی کے فرزند کے نقل کردہ دیوان میں ولی کے نام کے ساتھ دکھنی کا لاحقہ لگا ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دکھنی تھے ۔اس کے علاوہ ولی کے کئی اشعار سے ولی کی نسبت دکھنی ظاہر ہوتی ہے ۔ولی کو جو محققین گجراتی لکھتے ہیں ان کی دلیل فراق گجرات میں لکھا گیا ولی کا قطعہ ہے،اور شہر سورت کے متعلق ان کے اشعار ۔ولی کو گجراتی کہنے والے محققین اول الذکر کے دلائل کو یہ کہہ کر رد کرتے ہیں کہ اس وقت شمال سے امتیاز کی غرض سے سارے جنوبی علاقہ کو دکھن کہہ دیا جاتا تھا ۔اس دلیل کے جواب میں دکھنی لکھنے والے محققین کا کہنا ہے کہ شعراے گجرات نے ہمیشہ دکھنی اور گجراتی شعرا کے درمیان امتیاز ی علامتیں رکھی ہیں ۔

ولی کو گجراتی کہنے والے محققین قاضی میاں اختر جوناگڑھی اور ظہیر الدین مدنی ہیں ۔ ظہیر الدین مدنی کے انہیں دلائل کا یہاں اعادہ کیا گیا ہے جو سخنوران گجرات میں گزر چکے ہیں ۔پسر شریف محمد اور محمد ولی اللہ نام کے دستاویزات و تمسک نامہ کی دستیابی جس کے ذریعہ ولی کو گجراتی ثابت کیا گیا ہے ۔ محمد صادق لکھتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ وہی شاعر ولی ہیں تب بھی ولی کا متوطن گجرات یا مولد گجرات ہونا ثابت نہیں ہوتا ۔ سوائے اس بات کے کہ ۱۶۹۵ میں ولی گجرات میں تھے ۔ محمد صادق لکھتے ہیں کہ میری دانست میں امکان یہ ہے کہ ولی کی پیدائش اور تعلیم گجرات میں ہوئی ہو ۔اور وہ اورنگ آباد میں رہائش پذیر ہو گئے ہوں ۔اس صورت میں اس کا امکان ہے کہ وہ خود کو شاعر ملک دکھن لکھیں ۔ محمد صادق لکھتے ہیں کہ میرے لئے یہ ناقابل تسلیم ہے کہ ایک شخص کی گجرات کی پیدائش ہے وہ گجری زبان میں شعر کہے،جو کہ دکھنی کی ہی طرح خفیف اختلاف کے ساتھ ایک بولی ہے،اور خود کو دکھنی لکھے ۔

ولی کی آمد دہلی اور شاہ گلشن سے اکتساب کے باب میں محمد صادق نے پہلی بار منطقی اور مدلل طریقہ اختیار کرتے ہوئے اس روایت پر سوالات قائم کئے ہیں ۔ولی کی آمد دہلی ۱۷۰۰ لکھتے ہیں اور شاہ گلشن سے ملاقات کے امکان کو بھی تسلیم کرتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے دہلی یا اس سے قبل برہان پور،احمد آباد میں ولی اور گلشن کی ملاقات رہی ہو اور انہوں نے ان کو کچھ ایسا

مشورہ دیا ہو۔ محمد صادق لکھتے ہیں کہ ولی کے دیوان کا جب مطالعہ کرو تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ولی ابتدا ہی سے ایک ایسی شاعری کر رہے ہیں جس میں فارسی مضامین اور دہلی سے قربت رکھتی اورنگ آبادی محاورہ والی زبان رواں دواں ہے۔ پھر ولی کی شاعری کے سلسلے میں یہ کہنا اور ان کے کلام کو ماقبل آمد دہلی اور مابعد آمد دہلی کے خانوں میں بانٹ کر دکھنی اور فارسی اثرات کی تلاش درست نہیں ہے۔ آمد دہلی کے وقت ولی ۳۱ سال کے تھے اور مابعد دہلی ۷ سال زندہ رہے۔ ایسے میں ۷ سال کی شاعری کی نشان زدگی ممکن نہیں ہے۔ احسن مارہروی نے محض ۸۱ غزلوں کی نشاندہی کی ہے کہ وہ دکھنی لہجہ کی ہیں تو کیا ولی ۳۱ سال کے عرصہ میں محض ۸۱ غزلیں کہیں اور سات سال کے عرصہ میں سارا کلام مرتب کر لیا۔ محمد صادق لکھتے ہیں کہ ولی کے کلام کو سوائے ایک غزل کے اس قسم کے خانوں میں بانٹنا مناسب نہیں۔ اور ولی کی شاعری میں فارسی کے اثرات بہ حیثیت موضوع و مضامین و اسلوب پائے جاتے ہیں اس کی تردید کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اگر ولی دکھنی میں شاعری کر رہے تھے تو اہل دہلی ان سے اس قدر متاثر کیوں ہوئے، ان کے مستعجب ہونے کا سبب کیا ہوا۔ اور شاعری اپنے ہم عصروں کے لئے کی جاتی ہے اور انہیں کی زبان میں۔ ولی مراجعت دہلی کے بعد سات سال تک آخر ایسی زبان میں شاعری کیوں کریں گے جو ان کے معاصرین کی زبان ہی نہیں۔ محمد صادق لکھتے ہیں کہ ولی نے اپنی شاعری جس زبان میں کی ہے وہی زبان ان کے معاصرین داؤد، اشرف، اور سراج کے یہاں بھی مستعمل ہے۔ اس لئے میر اور قدرت اللہ کی مضامین فارسی کو بکار لانے اور دکھنی زبان کے بجائے اردوے معلی کی زبان اپنانے والی روایت، دراصل اہل دہلی کی کسی زرخیز تخیل کی اختراع ہے۔ اس کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل دہلی ریختہ میں شاعری کی اولیت کا سہرا دہلی شہر یا اگر ولی نے اول اول ریختہ کہا بھی تو ان کا یہ کارنامہ کسی دہلوی کے مشورے کے مرہون منت گردانا جائے۔

دوسری مرتبہ دہلی آمد عہد محمد شاہی میں بتایا جاتا ہے۔ محمد صادق لکھتے ہیں کہ یہ درست نہیں۔ اور دوسری آمد دہلی کے لئے جس روایت کو بنیاد بنایا گیا ہے وہ مصحفی کا وہ قول ہے جس میں شاہ حاتم کا حوالہ دیتے ہوئے مصحفی نے ولی کے دیوان کا عہد محمد شاہی میں آنے کو مذکور کیا ہے۔ محمد صادق لکھتے ہیں کہ دیوان کے دہلی آنے سے لوگوں نے یہ قیاس کیا ہے کہ ولی بھی دہلی ساتھ آئے۔ جب کہ اس میں ولی کے آنے کو مذکور نہیں کیا گیا۔ اور دلیل میں مضمون کا وہ شعر پیش کرتے ہیں جس سے ولی کا دہلی میں قیام کا امکان نظر آتا ہے۔

دل ولی کا لے لیا۔۔۔۔۔

جب کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے (گلشن گفتار، اور چمنستان شعرا میں شعر ذرا سی تبدیلی کے ساتھ مضمون سے منسوب ہے) کہ یہ شعر ولی کا نہیں ہے۔

محمد صادق نورالحسن ہاشمی کی اس بات کو بھی رد کرتے ہیں کہ ولی کے کلام کے بعد دہلی میں بوڑھے مشاق شعرا نے بھی اس زبان میں شعر کہنا شروع کر دیا، یہ درست نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اس زبان کو منھ لگایا وہ نوجوان ایہام گو شعرا تھے۔

محمد صادق نے ولی کے ہندی الفاظ کے استعمال کی توجیہ یہ کی ہے کہ ولی کے یہاں ہندی الفاظ انہیں غزلوں میں پائے جاتے ہیں جن میں متکلم عورت ہے۔ جن میں اظہار عشق عورت کی طرف کیا جا رہا ہو۔ اس لئے یہ کہنا کہ ولی کی زبان آمد دہلی سے قبل دکھنی آمیز تھی درست نہیں کہ کسی بھی صنف کی اپنی لفظیات ہوتی ہیں، تلمیحات و استعارات ہوتے ہیں۔ اس صنف کو برتتے وقت انلوازمات کا اس صنف میں در آنا فطری ہے۔

ولی کی سنہ وفات کی بابت مولوی عبدالحق کی تحقیق کردہ تاریخ ۱۷۰۷ء کو درست خیال کرتے ہیں اور اس کی تائید میں احمد آبادی بزرگ کے کتب خانہ میں موجود ولی کے دیوان میں مندرج تاریخ وفات ۴ شعبان ۱۱۱۹ھ بوقت عصر کو دلیل بناتے ہیں۔

محمد صادق ولی کی شاعری کو عشق مجازی اور حسن کی شاعری کہتے ہیں۔ عشق مجازی میں عشق حقیقی کی تلاش کی قسم کے مضامین ولی کی شاعری میں بے حد کم ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ولی کی شاعری میر کی سی درد آگیں اور کیفیت کی شاعری نہیں حظ و انبساط کی شاعری ہے۔ اسی وجہ سے ولی اور میر میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔

CLASSICAL URDU LITERATURE FROM THE BEGINNING TO IQBAL
ANNEMARIE SCHIMMEL 1975

اینا میری شمل نے دکھن کی شعری روایت کو علاقوں میں تقسیم کر کے وہاں کی ادبی پیش رفت کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً، گولکنڈہ، بیجاپور، گجرات و گلبرگہ، اورنگ آباد وغیرہ۔

اورنگ آباد کے عنوان کے تحت ولی کا بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ اورنگ آباد وہ علاقہ ہے جو مغلوں کی دکھنی فتوحات سے قبل احمد نگر کی نظام شاہی حکومت کے ماتحت آتا تھا۔ شمال کے بعد اردو کی ادبی تاریخ میں اورنگ آباد ہی ادبی مرکز بنا

۔جہاں شمالی یعنی دہلوی اور دکھنی دونوں dilect پائے جاتے تھے۔ اورنگ آبادی،دراصل دکھنی اور دہلوی محاورہ بیک وقت اس کی خصوصیات تھیں۔

سترہویں صدی کے نصف آخر کا شاعر شمس الدین ولی اللہ ولی ہیں جنھیں بابائے ریختہ اور اوردو کا باوا آدام کہا جاتا ہے۔ شمل نے انہیں The ruler of the kingdom of speech لکھا ہے۔ان کے وطن اور مقام وفات کے متعلق اختلاف درج کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ولی اورنگ آبادی خاندان میں ۱۶۶۸ء میں پیدا ہوئے۔احمد آباد میں تعلیم حاصل کی جہاں وہ صوفی بزرگ نور الدین سہر دوردی کے شاگرد رہے۔انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر عرصہ اورنگ آباد میں گزارا۔ان کی وفات ۱۷۰۷ میں ہوئی یا ۱۷۴۱ء میں اس میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

شمل لکھتی ہیں کہ ولی کی شعری زبان بولی کی زبان ہے۔اور وہ فارسی شاعری سے تاثر پذیر ہیں۔ان کی شاعری عشق مجازی اور عشق حقیقی کے درمیان ڈولتی رہتی ہے،جیسا کہ ایرانی اور ہندوستانی صوفی شعرا کا شاعرانہ طرز رہا ہے۔ولی کی شاعری میں متصوفانہ خیالات نظریاتی سطح پر مستعمل نہیں ہوتے جیسا کہ شمالی ہند کے بعد کے شعرا میں نظر آتا ہے۔دکھنی شعرا کی طرح ولی کی شاعری

میں بھی یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی،البتہ ولی اپنی شعری زبان کی بنت اس طور پر کرتے ہیں کہ اس کی تہ میں کئی معنی کے امکان موجود رہتے ہیں۔ لکھتی ہیں:

> " In Wali,s poetry we certainly do not fail pure theological preaching or theoretical sermonizing over sofi doctrines ,as was the case with the early dakhni writers ,he rather restricted himself to the apt application of the symbolic imagery as current in sufi poetry .such inherited images were also practical to hide the true meaning of a poets verse .since they allowed a mystical ,an amorous ,or even a political interpretation .,,(154)

ترجمہ:

> شمل ولی کی عشقیہ شاعری کے متعلق لکھتی ہیں کہ،ولی کی عشقیہ غزلیں صوفی رنگ بھی رکھتی ہیں وہ ولی کی پیروی کرنے والے شعرا کی غزلوں سے زیادہ رواں ،ارضی متاثر کن اور زیادہ انسانی ہیں۔ان میں تازہ استعارے ہیں اور تازہ موضوعات۔ان کی غزلوں میں روز مرہ کی انسانی حقیقتیں ہیں،اور یہ رویے شاید و باید ہی کلاسیکل فارسی شاعری میں پائے جاتے ہوں۔ولی کی شاعری میں ان کا معاشرہ نظر آتا ہے۔ہندوستانی پھول

،ہندوستانی ہیروز جیسے رام لکشمن،ارجن وغیرہ مستعمل ہیں۔ولی کی شاعری میں دکھنی و ہندوستانی رنگ تو ہیں ہی لیکن ان کی شاعری میں فارسی شاعری سے اثر پذیری کے اثرات موضوع و مواد دونوں سطحوں پر نظر آتا ہے۔

ولی کے سفر دہلی اور اور شاہ گلشن سے ملاقات کے ذیل میں لکھتی ہیں کہ ولی جب ۱۷۰۰ میں دہلی آئے یہاں ان کی ملاقات شاہ گلشن جو کہ نقش بندی سلسلہ کے بزرگ اور فارسی کے شاعر تھے اور ولی کے حقیقی استاد تھے،سے ملاقات ہوئی۔انہوں نے ولی کو مشورہ دیا کہ اپنے دکھنی کلام کو وہ ویسے ہی مرتب کریں جیسے دہلی کے فارسی گو شعرا اپنا دیوان مرتب کرتے ہیں۔اور یہ بھی کہ علاقائی لہجہ کو چھوڑ کر وہ زبان استعمال کریں جو دہلوی سے زیادہ قریب ہے۔ولی کی غزلوں میں دکھنی اور گجراتی اثرات دونوں پائے جاتے ہیں۔ شمل لکھتی ہیں کہ ولی چونکہ اسفار زیادہ کرتے تھے تو آسانی سے ان علاقوں میں بولی جانے والی زبان کو اپنی شاعری میں برت لیتے تھے۔آگے لکھتی ہیں کہ ولی دوبارہ دہلی آئے یا نہیں اس بارے میں اختلاف ہے البتہ ولی نے اپنا بیشتر وقت اور باقی ماندہ وقت اورنگ آباد میں گزرا۔ شمل کہتی ہیں کہ ولی نے اپنی شاعری سے پہلی بار دہلوی فارسی گو شعرا کو یہ احساس دلایا کہ اپنی مادری زبان میں بھی شاعری کے بہت سے امکانات ہیں۔

مندرج مباحث :

اورنگ آباد دہلی کے بعد ادبی مرکز بنا۔

اورنگ آبادی میں دہلوی اور دکھنی محاورہ بیک وقت پائے جاتے ہیں۔

ولی کا نام شمس الدین ولی اللہ ولی،بابائے ریختہ۔

اختلاف وطن،اورنگ آبادی خاندان میں ولی کی ولادت ۱۶۶۸ء میں ہونا۔

احمد آباد میں تعلیم حاصل کرنا اور نور الدین سہروردی کی شاگردی میں ہونا۔

اخیر زندگی کا بیشتر حصہ اورنگ آباد میں گزارنا۔

وفات کے متعلق ۱۷۰۱ء اور ۱۷۴۱ء کے اختلاف کا اندراج۔

شاعری میں عشق مجازی و عشق حقیقی کا امتزاج۔

ولی کی شاعری کی زبان بولی کی زبان ہے۔

ولی کی شاعری میں ہندوستانی رنگ اور ساتھ موضوع اور مواد دونوں کی سطح پر فارسی کے اثرات۔

ولی کی شاعری سے دہلوی شعرا کی اثر پذیری۔

A HISTORY OF URDU LITERATURE / ALI JAWAD ZAIDI 1993

علی جواد زیدی کی یہ تاریخ اردو ادبیات کی مختصر تاریخ ہے۔اس کتاب کے تیسرے باب میں ولی کا بیان ملتا ہے۔ علی جواد زیدی نے ولی کے باب میں اختلافی مسائل کو زیر بحث لانے کے بجائے ولی اور شاہ گلشن سے مشورے والی روایت کو مباحثہ کا مرکزی واقعہ بنایا ہے۔ علی جواد زیدی نے شاہ گلشن سے متعلقہ روایت کی تحقیق میں تنقیدی رویہ اپناتے ہوئے اس ملاقات کے ممکنہ مباحث اور مفروضات پر سوالات قائم کئے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے،ولی کو شاہ گلشن نے اردو میں فارسی طرز اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ علی جواد زیدی نے لکھا ہے کہ ولی سے قبل اور بعد کی فارسی شاعری سے کوئی بھی شاعر نابلد نہیں تھا۔اور نہ ہی فارسی شاعری ممنوع تھی۔اس عہد کے شعرا فارسی اور فارسی طرز سے خوب واقف تھے۔ایسا مشورہ کسی ایسے کو ہی دیا جا سکتا ہے جو شعری دنیا میں بالکل ہی مبتدی ہو جب کہ ولی بالکل نہ تھے۔دوسرے ولی کا سفر دہلی ۱۷۰۷ کا واقعہ ہے جیسا کہ حاتم نے ذکر کیا ہے اس وقت ولی اپنا دیوان مرتب کر چکے تھے۔اور ان کے اشعار کے داخلی شہادتوں سے بھی ولی کی شاعری پر شاہ گلشن کے مشورے کے اثرات تلاش کرنا ناممکن ہے۔ کیوں کہ ولی کی غزلوں میں کیفیت اور بسا اوقات مختلف ہوتے ڈکشن میں ایسی ہم آہنگی ہے کہ دہلی میں چند روزہ اقامت کے بعد کہی گئی غزلوں کو شناخت کرنا ممکن نہیں۔اور ولی سے پہلے کے دکنی شعرا کے لئے فارسی طرز نا معلوم نہیں تھا۔اور فارسی مواد و مضامین، جنس اور متصوفانہ خیالات، عشق اور تصوف کے رائج مضامین کو کسی خاص زبان یا ملک سے شناخت نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خواص آفاقی ہیں۔ولی کی فنکاری یہ ہے کہ ماخوذ خیالات کو بھی شخصی تجربے،معروضیت اور مقامیت میں ڈھال دیتے ہیں۔خالص ہندوستانی علامات گنگا جمنا سرسوتی،ہری دوار،سیتا،رام اور کرشن یہ سب فطری طور پر ان کی شاعری کا حصہ بنتے ہیں۔

علی جواد زیدی آگے لکھتے ہیں کہ ولی اپنی ابتدائی تخلیقات میں اپنے ہم وطن دکنی شعرا سے زیادہ قربت رکھتے ہیں۔ لیکن اورنگ آباد کے طویل قیام اور دہلی میں مختصر عرصہ کے قیام نے ہو سکتا ہے ان کے کلام پر اثر مرتب کیا ہو،اور شاہ گلشن کے مشورے نے بھی اپنا رول ادا کیا ہو اور یہ کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ولی کے دیوان میں موجود غزلیں کسی ایک طرز پر نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی لفظیات اور اسلوب میں موجود تنوع کو عہد بند کرنا مشکل ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی شاہ گلشن کے مشورے سے منسوب کرنا حماقت ہوگی۔ اس کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ شاہ حاتم کی شہادت کہ ولی سفر دہلی میں اپنا دیوان ساتھ لائے تھے،اس بیان سے ولی کی شاعری کے اس حصہ کلام پر شاہ گلشن کے مشورے کے اثرات کا ہونا امکانی ہے جو سفر دہلی کے بعد کہا گیا ہو۔ لیکن اس کی تحقیق آسان نہیں۔ آگے علی جواد زیدی محمد صادق کے اس شک کا حوالہ دیتے ہیں کہ مشورے کی یہ ساری تفصیلات میر تقی میر اور قدرت اللہ کے ذریعہ خلق کئے گئے ان ماخذوں سے تیار کی گئی ہے جو علاقائی تعصب سے ملوث ہیں۔ ممکن ہے یہ جنوب کے عظیم المرتبت شاعر مخالف کسی زرخیز تخیل کی اپج ہو۔ علی جواد زیدی نے ولی کا وطن احمد آباد لکھا ہے۔ اور اورنگ آباد سورت اور دہلی کے اسفار کا ذکر کیا ہے۔ علی جواد زیدی نے دہلوی شعرا پر ولی کی شاعری کے اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔

ان تواریخ کے مطالعہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں بیان کی گئی بیشتر معلومات و حقائق تذکروں سے اخذ کی گئی ہیں ۔ مورخین نے تذکروں میں بیان کردہ یا فراہم کردہ اطلاعات کو من و عن قبول کیا ہے اور انہیں ہی اپنی تاریخوں میں درج کیا ہے۔ سوائے ان تاریخوں کے جن کے مورخین نے باقاعدہ تذکروں میں بیان کردہ اطلاعات کا منطقی اور دیگر معلومات سے اس کا تجزیہ کر کے نفس مسئلہ کو محققانہ رنگ دیا ہے۔ ان میں محمد صادق اور شمس الرحمن فاروقی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ کچھ مورخین نے ان دو، مورخین کی ہی بتائی ہوئی باتوں اور ان کی آراء کا اعادہ کیا ہے۔ ان میں سیدہ جعفر، تبسم کاشمیری کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ محمد صادق نے اردو ادب کی تاریخ انگریزی میں ۱۹۶۴ء میں لکھی۔ سیدہ جعفر، شمس الرحمن فاروقی، علی جواد زیدی ، تبسم کاشمیری کی تاریخیں ان کے بعد کی ہیں۔ اس طور محمد صادق کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے ولی کے باب میں ان مسلمہ حقائق پر سوال قائم کیا ،اور اس کے رد میں عقلی و نقلی دلیلیں بھی پیش کیں۔ لیکن محمد صادق سے قبل شیخ چاند نے (مجلہ عثمانیہ۔ ۱۹۲۷، بہمن ۱۳۳۷ف) میں شاہ گلشن کی روایت پر بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا۔ شیخ چاند کے بعد محمد صادق پہلے تاریخ نویس ہیں، جنھوں نے اس روایت پر تفصیلی گفتگو کی۔ ان کے مابعد کے مورخین نے اس پر کچھ اضافہ تو نہ کیا البتہ ان کے قائم کئے گئے سوالات اور ان کے دلائل تاریخ کی روایت میں اس طور شامل کیے گئے کہ ولی کے ضمن میں بیان کردہ وہ باتیں جو اب

تک تسلیم شدہ تھیں وہ برابر سوال کے دائرہ میں آتی رہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے بھی محمد صادق کی طرح خاص طور سے شاہ گلشن اور ولی کا سال وفات اور اہل شمال کے تعصب کے باب میں کچھ نئے دلائل کا اضافہ کیا، جس سے محمد صادق کی باتوں کی توثیق ہوتی ہے۔

تذکروں کی اثر انگیزی تاریخوں پر مسلم ہے۔ ہم ولی کے باب میں یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان اختلافی امور کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ میر، قائم، اور مصحفی کے بیانات ساری تاریخوں میں گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انہیں تین تذکروں پر مورخین اپنی ساری تحقیق کی بنیاد رکھتے ہیں۔ لیکن ان تین تذکروں اور تاریخوں کے بیچ آزاد کا تذکرہ آب حیات ہے۔ اور اس میں مذکور بیانوں سے ادب کے دیگر مسائل کی طرح ولی کے باب میں بھی کچھ گمراہیاں راہ پا گئی ہیں۔ آب حیات پر ضروری ہے کہ خصوصی توجہ دی جائے۔ کیوں کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں ہمیں کچھ ایسے نکات ملتے ہیں جو اس سے قبل کے تذکروں میں نہیں پائے جاتے۔ اس سے پہلے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ آزاد نے جہاں پہلی بار شعرائے اردو کے احوال تفصیل سے درج کئے وہیں اول اول ان کے شاعرانہ خصائص پر کلام کرتے ہوئے شعرا کی شاعرانہ مرتبت و قدر کی تعیین کی بھی کوشش کی ہے۔ آزاد نے اپنے سے قبل کے تذکروں سے استفادہ تو کیا ہی ہے اپنے زمانے کے اس خاص رو یعنی نو آباد کار بیانیہ کو بھی مستحکم کرتے ہیں۔ اوپر ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں آب حیات کے اثرات اردو ادب میں کس حد تک راسخ ہیں اسے سمجھنے کے لئے احتشام حسین کا شاہ نصیر کے متعلق یہ قول دیکھیں کہ:

"قوت متخیلہ تیز تھی۔ مگر خیالوں میں گہرائی اور جاذبیت نہ تھی۔ اپنے عہد میں وہ بہت بڑے شاعر قرار دیئے جاتے تھے۔ مگر آج ان کا کلام بے روح اور بے مزہ قسم کی صناعی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی صرف تاریخی اہمیت ہے۔"

آزاد کا نظریۂ فن احتشام حسین کے اس قول کے پس منظر میں دیکھنا مقصود نہیں، بلکہ آزاد آب حیات میں، بین السطور کلاسیکی شاعری کی فی زمانہ فرسودگی کا جو ہلکا اشارہ کرتے جاتے ہیں، وہ آواز بلند آپ احتشام حسین صاحب کے یہاں سن سکتے ہیں۔ آزاد نے شعرا کی تعیین قدر پر خاص توجہ صرف کی، انہوں نے شاعر کے متعلق جس خصوصیت کو منسوب کیا برسوں اس کا ادب میں اعادہ کیا جاتا رہا۔ مثلاً سودا "واہ" اور میر "آہ" کے شاعر ہیں، اس کے اثرات ادبی دنیا پر واضح ہیں۔ اسی طرح ولی کے باب میں بھی آزاد نے کچھ ایسے بیانات مذکور کئے جو زمانے تک دہرائے جاتے رہے۔ ولی کے سلسلے میں جن امور کو آزاد نے آب حیات میں

درج کیا ان میں کچھ آج بھی اختلاف فیہ ہیں۔ مثلاً ولی کی آمد دہلی، رسالہ نور المعرفت، ولی کا شاہ گلشن سے کسب فیض وغیرہ وغیرہ

۔

محمد حسین آزاد نے میر قائم اور مصحفی کے علاوہ قاضی نور الدین فائق کے تذکرہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ نور الدین صدیقی سہروردی اور ولی کے درمیان پیری مریدی کا تعلق تھا، یا رسالہ نور المعرفت ولی کی تصنیف کردہ کتاب ہے، یہ معلومات آزاد نے انہیں کے تذکرہ مخزن الشعرا سے حاصل کی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ قاضی نور الدین فائق نے محض ولی کی تصنیف کہا جب کہ آزاد نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے اسے تصوف پر مبنی تذکرہ لکھا، اور اس کی کوئی سند یا دلیل بھی نہ دی۔ ظہیر الدین مدنی کی دریافت سے اب معلوم ہو چکا ہے کہ یہ تصوف پر مبنی رسالہ نہیں بلکہ نور الدین صدیقی سہروردی کی مدح اور "ہدایت بخش" نامی مدرسے کی تعریف میں فارسی زبان میں تصنیف کردہ رسالہ ہے۔

آزاد نے اپنے تذکرے میں کچھ ایسی باتوں کا اضافہ کیا جو اس سے پہلے کے تذکروں میں عام طور سے نہیں پائے جاتے۔ طبقات شعرائے ہند میں لکھا گیا کہ ولی کو فن عروض و قافیہ میں اچھی استعداد نہ تھی۔ آزاد نے اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور یہاں تک لکھ دیا کہ ولی کو فن عروض کے علاوہ فارسی زبان کی بھی اچھی استعداد نہ تھی۔ جو کچھ ان کی شاعری میں فارسیت کا عنصر نظر آتا ہے وہ بزرگوں کی صحبت کا اثر ہے۔ ورنہ ولی زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔

آزاد نے ولی کی دوسری آمد دہلی کو اتنے وثوق سے بیان کیا کہ مورخین اسے سچ جانتے ہوئے اسی کا اعادہ کرتے رہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ اتنا تو ثابت ہے کہ ولی عہد محمد شاہی میں مع اپنے دیوان کے دہلی آئے۔ ان کے اس بیان کی بنیاد حاتم کے بیان میں نقل کردہ مصحفی کا وہ قول ہے جس میں عہد محمد شاہی کے دوسرے جلوس میں ولی کے دیوان کے دہلی آنے کو مرقوم کیا گیا ہے ۔ مصحفی نے کہیں نہیں لکھا کہ ولی دیوان کے ساتھ آئے۔ لیکن آزاد نے اس سے یہ اخذ کیا کہ ولی مع دیوان ساتھ آئے۔ اس روایت نے ولی کے باب میں کافی غلط فہمیاں پیدا کیں۔ آزاد کے بعد گل رعنا کے مصنف نے بھی آزاد کی اسی روایت کو بغیر تحقیق نقل کیا۔ اگرچہ حکیم شمس اللہ قادری نے اس بات کی تردید کی اور لکھا کہ اس بات کی کوئی دلیل نہ آزاد کے پاس ہے اور نہ ہی گل رعنا کے مصنف کے پاس۔ لیکن حکیم شمس اللہ قادری نے اس بات کو بہت واضح انداز میں نہیں بیان کیا اور نہ ہی اس کی نشان دہی کی کہ آزاد نے یہ کیوں کہا اور اس روایت کا منبع کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شمس اللہ قادری کی تردید کے بعد بھی مورخین پر یہ واضح نہ ہو سکا اور وہ اس کو روایت کرتے ہوئے آگے بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً عبد القادر سروری جن کی تاریخ

۱۹۵۸ کی تحریر کردہ ہے،اس میں لکھتے ہیں کہ ولی عہد محمد شاہی میں دہلی آئے۔اس کی وہ کوئی دلیل نہیں لاتے۔جب کہ قائم کے بیان کردہ سنہ ۱۷۰۰ کے بارے میں کسی کو بھی شک نہیں،عہد محمد شاہی کی روایت کو قبول کرنے اور قائم کی روایت ۱۷۰۰ آمد دہلی کو نہ بیان کرنے کی کچھ وجہ تو ہوگی۔مصنف نے اسے نظر انداز کر دیا ہے۔تذکرہ محبوب الزمن ۱۹۱۱ء ۱۳۲۹ھ میں ولی کی آمد دہلی عہد محمد شاہی میں ہی لکھی گئی ہے۔اس کی وجہ غالبا یہ معلوم ہوتی ہے کہ تذکرہ محبوب الزمن کے مصنف کا عندیہ ولی کے متعلق اختلافی مسائل کی چھان بین کے بجائے ولی کے احوال میں ایک تسلسل قائم کر کے انہیں بیان کر دینا ہے۔ان کے یہاں کسی بھی نوع کے عقلی و منطقی دلائل کو بروے کار نہیں لایا گیا ہے۔عبد القادر سروری نے بھی غالبا محبوب الزمن اور آب حیات سے استفادہ کیا ہے۔جیسا کہ آزاد نے دوسری آمد کے ذیل میں انتہائی وثوق سے "اتنا تو ثابت ہے" جیسے محقق بات کی طرح مذکور کیا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے بھی "دکن میں اردو" میں ولی کی دو مرتبہ آمد کو تحریر کیا ہے۔دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ولی کی وفات کے بابت لکھتے ہیں کہ بعض ۱۱۵۵ھ اور بعض ۱۱۴۳ھ سنہ وفات درج کرتے ہیں۔لیکن مولوی عبد الحق کی تحقیق ۱۱۱۹ھ زیادہ درست ہے۔۱۱۱۹ھ مطابق ہے ۱۷۰۷ کے اور دوسری آمد دہلی عہد محمد شاہی کے دوسرے سنہ جلوس میں ہے۔اور عہد محمد شاہی کی ابتدا ۱۷۱۹ سے ہوتی ہے۔یہ کیسے ممکن ہے کہ ولی ۱۷۰۷ میں فوت ہو جائیں اور اس کے تیرہ سال بعد دہلی کا سفر بھی کریں۔

جمیل جالبی بھی اسی روایت کو دہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔رام بابو سکسینہ، گراہم بیلی نے بھی یہی نقل کیا ہے۔شمل اور علی جواد زیدی اور تبسم کاشمیری نے اسے اختلافی لکھا ہے۔سیدہ جعفر کا بھی اس معاملہ میں کوئی واضح موقف نہیں ہے۔ولی کے باب میں مذکور حقائق کے اثرات سیدہ جعفر کی رقم کردہ تاریخ پر دیکھا جا سکتا ہے خاص طور سے سخنوران گجرات اور محمد صادق کی تاریخوں کے اثرات۔پھر بھی اس معاملہ میں ان کی کوئی واضح رائے سامنے نہیں آتی ہے۔

حکیم شمس اللہ قادری کے بعد جس نے دوبارہ آمد دہلی کو رد کیا ہے وہ محمد صادق ہیں۔محمد صادق نے لکھا کہ عہد محمد شاہی میں ولی کے دیوان کی دہلی آمد سے لوگوں نے یہ قیاس کیا کہ ولی بھی ساتھ آئے۔محمد صادق یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس خیال کو تقویت آزاد کے نقل کردہ اس شعر سے بھی پہنچی،جو دراصل مضمون کا شعر تھا۔

شاہ گلشن سے کسب فیض والی روایت کا آغاز میر سے ہوتا ہے۔ میر نے می گویند سے اپنی بات شروع کر کے باقی خانے خالی چھوڑ دیئے۔ نہ ہی اس کا اشارہ کیا کہ یہ روایت کس کی ہے اور نہ کہیں یہ مذکور کیا کہ کب دہلی آئے۔ اس طرح ولی کی آمد دہلی اور شاہ گلشن سے کسب فیض کے باب میں کسی بھی ایسے نشان کا نہ چھوڑنا جس سے اس بات کی تصدیق یا تردید کی جاسکے، میر کی اپنی نیت پر بھی سوال قائم کرتا ہے۔ اس روایت میں رنگ و روغن قائم، قدرت اللہ اور باقی بیشتر تذکرہ نگاروں نے بھرا۔ حالانکہ آزاد نے جب اپنا تذکرہ لکھا تو حتمی طور سے یہ نہ کہہ سکے کہ ولی نے شاہ گلشن سے کسب فیض کیا یا ان سے شعری معاملہ میں تعلیم لی ،اور ان کے مشورے سے اردوے معلی میں شاعری شروع کی۔ میر کی روایت کے متعلق آزاد کے یہاں ایک قسم کا تردد پایا جاتا ہے۔ تذکرہ نگاروں کی طرح کم و بیش یہی روایت تاریخ نویسوں نے بھی دہرائی ہے اور دلیل میں انہیں کے اقوال کو نقل کیا ہے۔

عالمگیر کے چوالیسویں سنہ جلوس پر دہلی آمد اور شاہ گلشن سے کسب فیض کی روایت ادبی تاریخ نگاری میں یوں چسپاں ہے کہ اس کی تردید کا حوصلہ اکثر مورخین نہ کر سکے۔ جمیل جالبی نے یہاں تک لکھا کہ ولی کی آمد دہلی پر شاہ گلشن نے وہ تاریخ ساز مشورہ دیا جس نے اردو دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اور جمیل جالبی کی ولی کی وفات کے سلسلے میں ساری دلیلیں بھی اسی روایت پر مبنی ہیں ،کہ ولی اگر ۱۷۰۰ میں دہلی آئے تو ۱۷۰۷ میں اتنی جلدی اتنا کلام کیسے کہہ گئے۔ اگر وہ اس روایت پر تکیہ نہ کرتے تو ممکن تھا کہ وہ دیگر سوالوں تک رسائی حاصل کر لیتے۔ مؤرخین نے شاہ گلشن والی روایت سے نتائج بھی جدا جدا نکالے ہیں۔ مثلاً رام بابو سکسینیہ نے فارسی طرز پر کلام/دیوان کو جمع کرنے کا مشورہ مراد لیا۔ (رام بابو کا یہ مشورہ آب حیات سے مستعار ہے) گراہم بیلی نے یہ اخذ کیا کہ شاہ گلشن ولی کی دکھنی شاعری سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں فارسی ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ اینا میری شمل نے یہ نتیجہ بر آمد کیا کہ شاہ گلشن نے ولی کو ان کے دکھنی کلام کو فارسی طرز پر مرتب کرنے کا مشورہ دیا۔ جمیل جالبی نے مضامین فارسی کو برتنے کا مشورہ مراد لیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی محمد صادق نے ولی کی بابت دہلوی تعصب پر سب سے پہلے کلام کیا۔ انہوں نے ولی کے کلام کی اندرونی شواہد اور منطقی دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ولی کے متعلق یہ روایتیں دہلوی تعصب کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ انہوں نے باقاعدہ لکھا کہ اہل دہلی ریختہ میں اولیت کا سہرا شہر دہلی کے سر باندھنا چاہتے تھے اور اگر کوئی غیر دہلوی اس زبان میں شاعری کا پہلا دعویدار کے روپ میں سامنے آیا بھی ہے تو وہ کسی دہلوی کے ہی احسان سے گراں بار ہے۔ حالانکہ شاہ گلشن اصلا

گجراتی تھے۔ محمد صادق کے دلائل یہ ہیں کہ اگر ولی دہلی آمد کے وقت شاعری نہیں کر رہے تھے تو اہل دہلی کس بات سے اتنے متاثر و مستعجب ہوئے۔ اور اگر شاہ گلشن نے انہیں اردوے معلی میں شاعری کا مشورہ دیا تو کیا دہلی سے مراجعت کے بعد وہ اپنے ہم عصروں کے درمیان ایک غیر زبان میں شاعری کر رہے تھے۔ جب کہ شاعر اپنے ہم عصروں کے لئے ہی شاعری کرتا ہے ۔ولی ایسا کیوں کر کریں گے۔ تیسرے یہ کہ ولی کے ہم عصر بھی اسی زبان میں شاعری کر رہے تھے جس زبان میں ولی شاعری کرتے ہیں، انہیں کس نے مشورہ دیا تھا۔ محمد صادق کی ان باتوں کا ماحصل یہ کہ وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دہلی اور اس وقت کی اورنگ آبادی زبان تقریبا ایک تھی، سوائے خفیف سے اختلاف کے علاوہ ان دونوں میں کچھ بھی فرق نہ تھا۔ اس لئے شاہ گلشن کے اس مشورے کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی۔ علاوہ ازیں ولی کے کلام کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ احسن مارہروی نے اسے ماقبل آمد دہلی اور مابعد آمد دہلی کے خانوں میں تقسیم کر کے اس پر دہلوی اور دکھنی اثرات نکالنے کی جو کوشش کی ہے وہ درست نہیں۔ کیوں کہ ولی کے کلام میں دکھنی عناصر اور بلحاظ اسلوب و بلحاظ مواد و مضامین فارسی اثرات موجود ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں۔ اس کا سبب دہلی کا سفر نہیں ہے اور نہ دہلوی زبان کے اثرات ہیں، بلکہ اس صنف کے سبب ہے جس میں عورت متکلم ہوتی ہے اور جو ہندی روایت کی ایک مشہور صنف رہی ہے۔ محمد صادق لکھتے ہیں کہ اگر آپ کسی صنف کو ذریعۂ اظہار بناتے ہیں تو اس صنف کے خصائص اس کی لفظیات، استعارات و تلمیحات لامحالہ شاعری میں در آئیں گی۔ اور وہ لفظیات جسے خالص دکھنی لکھ کر ولی کی شاعری میں دکنی عناصر کی تحدید کی گئی ہے ان کا استعمال تو بعد کے دہلوی شعرا تک کے یہاں نظر آتا ہے۔ مثلاً ساجن، پیو، پیا، موہن، پیتم وغیرہ، اس میں فقط ولی کا اختصاص نہیں ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ محمد صادق کے ان دلائل اور استنباط کی بازگشت بعد کے مورخین میں سنائی دینے لگتی ہے۔ چنانچہ سیدہ جعفر، علی جواد زیدی، ظہیر الدین مدنی، تبسم کاشمیری، شمس الرحمن فاروقی، اس روایت کو رد کرتے ہیں یا شدید تشکیک کا اظہار کرتے ہیں

۔

شمس الرحمن فاروقی نے تحقیق میں اضافہ کرتے ہوئے محمد صادق کے دلائل و خیالات کو اور تقویت پہنچائی اور مزید دلائل سے دہلوی تعصب کو واضح کیا۔ اور اس تعصب کے پیچھے اسباب و سیاست پر کھل کر لکھا۔ محمد صادق کا خیال تھا کہ ولی شاہ گلشن کے شاگرد رہے ہوں گے اور ممکن ہے ان کو مشورہ بھی دہلی میں یا دہلی سے قبل کسی ملاقات میں دیا ہو، لیکن ولی کے کلام کی داخلی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس راہ پر ابتدا سے ہی گامزن ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے لکھا کہ اول شاہ گلشن شاعری کے

میدان میں اس قدر مستند نہ تھے کہ کسی کو مشورہ دیتے ۔ دوئم وہ اتنے عرصہ تک منتظر ہی کیوں رہے کہ کوئی غیر دہلوی آئے تو اسے اپنے مشورے سے نوازیں ۔ سوئم اس وقت اگر کوئی اس قسم کے مشورہ دینے کا اہل تھا تو اس وقت کا مستند ترین شاعر بیدل تھا۔ فاروقی نے یہ بھی لکھا کہ ولی شاہ گلشن کے شاعری میں شاگرد نہ تھے وہ کسی دیگر معاملہ میں ان کے شاگرد رہے ہوں گے۔

تاریخوں سے ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ روصتہ الشھدا ولی کی تصنیف نہیں بلکہ ولی ویلوری کی تصنیف کردہ ہے ۔ روصتہ الشھدا سے متعلق سب سے پہلے حکیم شمس اللہ قادری نے اپنی تحقیق پیش کی ہے ۔ اور ولی کا سال وفات اس تصنیف سے متعلق کر کے ۱۷۴۱ء تک پہنچائی جاتی تھی۔ اس طرح ولی کی سنہ وفات ۱۷۴۱ء کی بھی تردید ہو جاتی ہے ۔

تاریخوں سے ہی ہمیں علم ہوتا ہے کہ رسالہ نور المعرفت فارسی میں تحریر کردہ رسالہ ہے ۔ یہ نور الدین صدیقی سہروردی اور مدرسہ "ہدایت بخش" کی مدح میں تحریر کیا گیا ہے ۔

ادبی تاریخ سے ہم نے اس باب کی ابتدا میں جو توقعات کی تھیں کہ اس میں ترتیب و تنظیم اور تحقیق و تنقیح کی ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جن سے منتشر معلومات ایک منطقی سلسلے میں بندھ جاتے ہیں ۔ اور خلاف واقعہ معلومات کی حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے ،اور زیادہ قابل قبول راے کی صورت معلوم حقیقت کی جگہ لے لیتی ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام ادبی تاریخیں اس امید پر پوری نہیں اترتیں ۔ آب حیات ،رام بابو سکسینہ کی تاریخ اور عبد القادر سروری کی تاریخ ،نصیر الدین ہاشمی مرحوم اور سیدہ جعفر کی تاریخیں ہمیں کسی نئے معلومے تک نہیں پہنچاتیں ۔ ان تاریخوں میں بیان کردہ معلومہ کو روایت کر دینے کا مزاج ملتا ہے ۔ جب کہ حکیم شمس اللہ قادری کا تنقیدی و تحقیقی ذوق انھیں معلوم حقیقت کو منطقی و عقلی کسوٹیوں پر پرکھتا ہے ۔ جمیل جالبی کی تاریخ ہمیں ولی کے شاعرانہ کمالات کی بابت کافی کچھ بتاتی ہے ، لیکن ولی اور دہلی معاملہ اور شاہ گلشن والی روایت میں وہ میر اور قائم کی پیروی کرتے ہیں اور دلائل سے اسے درست ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں ۔ سب سے زیادہ قابل ذکر کام اس سلسلے میں محمد صادق کا ہے ۔ علی جواد زیدی اور تبسم کاشمیری محمد صادق کی پیروی کرتے ہیں ۔ شمس الرحمن فاروقی کی کتاب میں شامل مضمون "ولی نام کا ایک شخص" دبستانی تعصب کی مزید پرتیں کھولتا ہے ۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی تاریخوں میں ولی کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ۔

حواشی:

۱۔ محمد حسین آزاد۔ آب حیات۔ کتابی دنیا دہلی۔ سن اشاعت ۲۰۱۴ء۔ ص ۸۸،۸۷

۲۔ ایضا۔ ۸۵

۳۔ ایضا۔ ۸۵

۴۔ ایضا۔ ۸۴

۵۔ ایضا۔ ۸۵،۸۴

۶۔ ایضا۔ ۸۸

۷۔ قاضی نورالدین فائق۔ مخزن الشعرا۔ اتر پردیش اردو اکادمی۔ دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۲۔ ص ۱۱۹

۸۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی۔ گلشن گفتار۔ مرتبہ: سید محمد ایم اے۔ مطبع: خورشید پریس یوسف بازار نیا بل، طبع اول ۱۳۳۹ف۔ ص ۱۹

۹۔ میر تقی میر۔ نکات الشعرا۔ مرتبہ: محمود الٰہی۔ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ۔ پہلی اشاعت، ۱۹۸۴۔ ص ۳۴

۱۰۔ علی الحسینی گردیزی۔ تذکرہ ریختہ گویاں۔ مرتبہ: ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری۔ اتر پردیش اردو اکادمی۔ ۱۷۶۰، ص ۱۵۵

۱۱۔ محمد قیام الدین قائم چاندپوری۔ مخزن نکات۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔ پہلا اکادمی ایڈیشن ۱۹۸۵ء، ص ۲۹

۱۲۔ حکیم سید شمس اللہ قادری۔ اردوے قدیم۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۲۵۔ ص ۱۰۸

۱۳۔ ایضا۔ ص ۱۰۸

۱۴۔ ایضا۔ ص ۱۰۰

۱۵۔ عبدالقادر سروری۔ اردو کی ادبی تاریخیں۔ گلشن پبلشرز گاؤکول چوک سری نگر،۱۹۸۷۔ پہلی اشاعت ۱۹۵۸، ص ۱۷۷

۱۶۔ نصیر الدین ہاشمی۔ دکن میں اردو۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی۔ چوتھی اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۳۰۱

۱۷۔ ایضا۔ ص ۳۰۲

۱۸۔ نصیر الدین ہاشمی۔ یوروپ میں دکھنی مخطوطات۔ شمس المطابع عثمان گنج حیدرآباد، دکن، ۱۹۳۲ء، ص ۳۵۲ تا ۳۵۴

۱۹۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۲۰۱۳، ص ۳۹۸

۲۰۔ ایضا۔ ص ۳۹۸

۲۱۔ ایضا۔ ص ۴۰۱

۲۲۔ ایضا۔ ص ۴۰۲

۲۳۔ ایضا۔ ص ۴۱۷

۲۴۔ ایضا۔ ص ۴۱۲

۲۵۔ ایضا۔ ص ۴۱۳

۲۶۔ ایضا۔ ص ۴۱۳

۲۷۔ ظہیر الدین مدنی۔ سخنوران گجرات۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔ پہلی اشاعت ۱۹۸۱۔ ص ۸۶

۲۸۔ ظہیر الدین مدنی۔ ولی گجراتی۔ سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نمبر ۱۔ ۱۹۵۰۔ ص ۴۸

۲۹۔ ظہیر الدین مدنی۔ سخنوران گجرات۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔ پہلی اشاعت ۱۹۸۱ء۔ ص ۸۸

۳۰۔ سیدہ جعفر، گیان چند جین۔ تاریخ ادب اردو۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۲۵۵

۳۱۔ ایضا۔ ص ۲۵۶۔۲۵۵

۳۲۔ایضا۔ص ۲۸۲

۳۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔اردو کا ابتدائی زمانہ۔ آج پبلیکیشن کراچی۔ تیسری اشاعت،۲۰۰۹۔ ص ۱۳۷

۳۴۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری۔اردو ادب کی تاریخ۔ایم آر پبلی کیشن، نئی دہلی۔ سن اشاعت ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۹

۳۵۔ایضا۔ص ۲۳۱

۳۶۔ایضا۔ص ۲۳۸

۳۷۔رام بابو سکسینہ۔تاریخ ادب اردو۔مترجم: مرزا محمد عسکری۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ،۱۹۲۹ء، ص ۷۲

Ram Babu Seksena ,A history of Urdu literature ,Asian educational services .1990 ,page 38.

،no,41.

۳۹۔ٹی گراہم بیلی۔اردو لٹریچر۔مترجم: سید محمد عصیم۔ مطبع تاج پرنٹرس نجف روڈ، دہلی۔ ۱۹۹۰ء، ص ۶۷

۴۰۔ایضا۔ص ۷۳،۶۹

41. Muhammad sadiq ,A history of Urdu literature,oxford university press ,1984,page no ,63.

42. Anne marie Schimmel, A history of Indian literature ,ed.by Jan Gonda ,vol.8.Fasc.3. Classical Urdu literature from the beginning to Iqbal,page .153.Otto Harrassowitz Wiesbaden .1975.Germany.

۴۳۔ سید احتشام حسین۔اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ قومی کونسل اردو، دہلی۔ گیارہویں اشاعت ۲۰۱۹ء، ص ۱۲۴

باب چہارم

غزلیات ولی کا فنی مطالعہ

ولی کی شاعری اور اردو کی کلاسیکی رسومیات و شعریات

ہماری کلاسیکی شاعری بالخصوص غزل کی باقاعدہ ابتدا ولی سے ہوتی ہے۔ ولی کی شاعری نے ہمارے کلاسیکی طرز غزل کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس کلاسیکی شاعری کی شعریات پر نہ تو اس زمانے کے شعرا نے کلام کیا اور نہ ہی اس عہد کے تذکرہ نگاروں نے کلاسیکی شعریات کے باب میں کچھ تحریر کیا۔ بقول شمس الرحمن فاروقی کہ اس عہد و تہذیب میں شعریات کی فہم عام تھی اور اسے ایک مسلمہ اصول کی طرح جانا جاتا تھا۔ اس لیے اس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی کہ اسے تحریر بھی کیا جانا چاہئے۔ آج جب ہمارے عہد میں کلاسیکی شاعری کے فہم رکھنے والے معدوم ہوتے جارہے ہیں تو اس شعریات کی بازیافت ضروری ہو گئی ہے جن کے تحت ہم اپنی کلاسیکی شاعری کو سمجھ سکیں، اور یہ جان سکیں کہ وہ کیا اصول تھے جنھیں پیمانہ جان کر اچھے اور برے شعر کی تمیز کی جاتی تھی۔ شعریات کی بازیافت میں ہمارے نقادوں میں سر بر آوردہ نام شمس الرحمن فاروقی کا ہے کہ انھوں نے کلاسیکی اصول شعر کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ تذکروں اور کلاسیکی شاعری کے ذریعہ وہ اصول اخذ کیے جن کے تحت اس معاشرے میں شعر کے اچھے برے ہونے پر کلام کیا جاتا تھا۔ بامعنی لفظ، وزن و بحر، قافیہ اور ربط شعر کی تخلیق کے لئے بدیہی ضرورتیں ٹھہریں۔ ان کے بغیر شعر وجود میں نہیں آسکتا۔ مضمون آفرینی، معنی آفرینی، خیال بندی، کیفیت، شور انگیزی، یہ سب اردو شاعری کی شعریات کی اصطلاحیں ہیں۔ فاروقی صاحب نے اول الذکر کو وجودیاتی تصورات اور آخر الذکر کو علمیاتی تصورات کے ذیل میں رکھا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ تمام کی تمام شعریات کسی شاعر نے ایک ساتھ استعمال کر لی ہوں، اور ایک معیار متعین کر دیا ہو۔ یہ شعریات کی اصطلاحیں اردو کے بیشتر کلاسیکی شعرا کے کلام کو پڑھ کر اور تذکروں میں موجود تنقیدی جملوں سے اخذ کی گئیں۔ اس سلسلے میں شمس الرحمن فاروقی رقم طراز ہیں:

> ”چنانچہ تقریباً ۱۷۰۰ء سے لے کر تقریباً ۱۸۷۰ء تک تمام ہی اہم شعرا کو اس بات کا احساس معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئی شعریات بنا رہے ہیں۔ اور ان سب نے کچھ شعر اس مضمون کے ضرور کہے ہیں کہ ان کے خیال میں

شاعری کے خواص کیا ہیں، یا کیا ہونا چاہئے، کوئی ضروری نہیں کہ وہ خواص خود ان کی شاعری میں موجود ہوں
(۱)"۔

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۷۰۰ سے ۱۸۷۰ تک کلاسیکی اردو شعریات وضعی حالت میں رہی۔ اس کی شعریات کی بنت میں فارسی اور سنسکرت شعریات شامل رہیں اولاً دکنی شعرا میں فارسی اور سنسکرت شعریات کی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ دکنی شاعری میں فارسی اور سنسکرت طرزیں دونوں رائج تھیں۔ کسی شاعر کے یہاں فارسی اثر نمایاں ہوا تو کسی کے یہاں مقامی اور سنسکرت عنصر۔ ولی سے قبل کے شعرا ہاشمی اور نصرتی کی شاعری کو دیکھا جا سکتا ہے کہ ہاشمی کی شاعری مقامی اثرات رکھتی ہے اور نصرتی فارسی طرز کی پیروی کرتے ہیں۔ غرض یہ دونوں طرز دکنی شاعری میں جدا جدا رائج تھے۔ ولی نے ان دونوں اسٹائل کو اپنا یا اور انہیں یکجان کر کے ایک نئی شعریات کی داغ بیل ڈالی ۔

ولی سے قبل اور ولی کے عہد میں ہندوستان میں جس قسم کی فارسی شاعری کی جا رہی تھی اسے سبک ہندی کا نام دیا گیا۔ سبک کے معنی اسٹائل(Style) کے ہیں۔ سبک ہندی سے مراد فارسی زبان میں کی گئی وہ شاعری جس میں ہندی اسٹائل کی آمیزش ہو ۔ یعنی اس فارسی شاعری کو ہندوستانی طرز کا نام دیا گیا۔ یہ ہندی طرز ہندوستانیت اور مقامی اثرات رکھتا تھا۔ اسی سبب خود فارسی الاصل شعرا جو ہندوستانی تہذیب اور اس تصور شعر سے آگاہی نہ رکھتے تھے وہ اس طرز کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ سبک ہندی کی خصوصیات میں مقامی عناصر کی شمولیت (تہذیب وزبان کی سطح پر) کے علاوہ تصور شعر میں بھی فرق تھا۔ سبک ہندی کی شروعات ہمارے یہاں خسرو سے کی جاتی ہے۔

ہندوستانی قدیم تہذیب کو سبک ہندی کے شعرا نے جہاں اپنی شاعری میں جگہ دی وہیں سنسکرت شاعری کی شعریات سے بھی کچھ چیزیں اخذ کیں۔ ایہام کا تصور فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز نہ تھا۔ یہ ہماری شاعری میں سنسکرت شاعری کے ذریعہ آیا۔ اس کی کارفرمائی سبک ہندی کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے اور دکنی شاعری میں ایہام کی چھوٹ کہیں کہیں پڑتی دیکھی جا سکتی ہے ۔ نظامی کدم راؤ پدم راؤ کا تخلیق کار لکھتا ہے کہ:

دو آرت سبد جس کوت میں نہ ہوئے
دو آرت سبد باج ریجھے نہ کوئے (۲)

دو آرت کوت سے مراد دو معنی رکھنے والی نظم سے ہے۔ یعنی دکنی شاعری میں ایہام کا شعور پہلے سے موجود تھا۔ نظامی سے قبل خسرو کے یہاں ایہام سے متعلق خاصا کلام ملتا ہے۔ دیباچہ غرۃ الکمال میں خسرو خود کو ایسے کلام کا موجد لکھتے ہیں جس کے ایک شعر سے ساتھ معنی دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ امیر خسرو لکھتے ہیں:

> ''اس سے قبل شعرانے، جو شعر کو آراستہ کرنے والے ہیں، صنعت ایہام میں ایک بال کو اس طرح چیرا ہے (ایسا ایہام پیدا کیا) کہ دو معنی حاصل کر سکے۔ بندے نے اپنی کلک تیز سے معنی کے بال کے سرے کو اس طرح چیرا ہے کہ ایک بال کے شگاف سے سات معنی حاصل ہوئے۔ اگر چہ ان پرواز کرنے والوں (کے ایہام میں بھی) دونوں طرف موے محاسن تھے اور میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن میری طراری اس سے کہیں زیادہ ہے۔۔۔۔۔۔ خسرو کی طبع فکر نے ایسا ایہام ایجاد کیا جو آئینہ سے زیادہ پسندیدہ ہے کیوں کہ آئینہ میں ایک صورت، ایک خیال سے زیادہ نظر نہیں آتی، لیکن یہ ایسا آئینہ ہے کہ اگر تم ایک چہرہ اس کے روبرو لاؤ تو یہ سات درست اور روشن خیال دکھاتا ہے۔ میں نے اس ایہام کا نام ایہام ذوالوجوہ رکھا ہے۔ دیکھنے والے کو چاہئے کہ خوب طرح سے شعر کے گرد چکر لگائے۔''(۳)

نظامی اور خسرو کے درمیان کسی قسم کی نسبت نہیں پائی جاتی سوائے اس کے کہ دونوں ہندوستانی مزاج کے پروردہ ہیں۔ نظامی کی دو آرت بات سے صاف ہے کہ دکنی دور کی زبان میں ایہام کے حامل شعر ہی زیادہ بہتر تصور کیے جاتے تھے۔ اور ایسے لفظوں کا انتخاب جس سے دو معنی کا وہم پیدا ہو شاعری کا وصف جانا جاتا تھا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس قسم کی شاعری کا چلن دکنی زبان میں رائج ہو گیا تھا، لیکن نظامی کی بات یہ ضرور ظاہر کرتی ہے کہ دو معنی رکھنے والے اشعار شاعری کا حسن خیال کیے جاتے تھے۔ فارسی میں خسرو سے لے کر بیدل وغیرہ اور نظامی سے ولی تک ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہندوستانی مزاج شاعری اپنا جوہر بتدریج ہند فارسی اور دکنی اردو اور ریختہ میں پھیلاتی جاتی ہے۔ ایہام کے تعلق سے یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ اس کے کئی اقسام ہیں۔ ایہام خالص، ایہام تناسب، ایہام صوت، ایہام تضاد یا طباق، ایہام پیچیدہ وغیرہ۔ ایہام جہاں معنی آفرینی کے راستے ہموار کرتا ہے وہیں مناسبات اور رعایتیں شعر کا حسن بڑھاتی ہیں۔ رعایت بھی معنی آفرینی کا ایک ذریعہ ہے۔ کلاسیکی شاعری کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ رعایت اور مناسبات کی شاعری ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ کلام کو مناسبات اور رعایتوں سے سجانا کلاسیکی شعرا کا وصف خاص رہا ہے۔ معنی آفرینی میں معاون وسائل، مذکورہ اصطلاحوں کو جان لینے کے بعد یہ بات جان لینا بھی ضروری ہے کہ مضمون اور معنی کے درمیان تفریق کیسے قائم ہوئی۔ اور مضمون اور معنی سے مراد کیا ہے۔ لفظ معنی ''اولا''مضمون '' کے معنی میں مراد لیتے

تھے ۔یعنی جس مفہوم میں آج ہم لفظ "مضمون "کو استعمال کرتے تھے اسی مفہوم میں لفظ "معنی " کو استعمال کیا جا تا تھا ۔مضمون سے مراد آئیڈیا اور تھیم کے ہیں۔سبک ہندی کے شعرانے لفظ "معنی "کو معنی یعنی میننگ(meaning) کے مفہوم میں استعمال کیا اور مضمون کو "خیال "کے مفہوم میں۔ شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

> "ورنہ "معنی "بمعنی میننگ(meaning) کا استعمال،یعنی معنی اور "مضمون " کی تفریق،سبک ہندی کے شعرا کی بہت بڑی دریافت ہے ۔اس دریافت کی بنیاد اس صورت پر ہے کہ کلام میں معنی پیدا کرنے کا عمل، کلام میں مضمون باندھنے کے عمل سے الگ ہے ۔"(۴)

یعنی سبک ہندی کے شعرانے معنی اور مضمون میں تفریق قائم کی اور اپنے شعری خصوصیات میں اضافہ کیا۔ معنی اور مضمون کی اور زیادہ وضاحت کے لیے یہ کہاجاسکتاہے کہ محبوب کا حسین ہونا،معشوق کے چہرے کا آفتاب کی طرح روشن ہونا،یہ کسی شعر کا مضمون ہوسکتاہے اور اس شعر میں جس قدر معنی نکلیں اسے معنی کے خانہ میں رکھیں گے۔ مثلاولی کا شعر ہے :

مکھ ترا آفتاب محشر ہے
شور اس کا جہاں میں گھر گھر ہے

شعر میں محبوب کے چہرے کی تابناکی کا مضمون باندھا گیا ہے۔ چہرے کو آفتاب محشر کہہ کر چہرے کی تابناکی کی طرف اشارہ ہے ۔یعنی محشر کے آفتاب کی طرح تیرا چہرہ روشن ہے ۔ کہاجاتاہے کہ حشر کے دن آفتاب سوا نیزے کے قریب بلند ہو گا اور بہت زیادہ روشن،حدت و تپش والا ہو گا۔ محبوب کے چہرے کو محشر آفتاب کہہ کر یہ بھی کنایہ رکھا گیا کہ اس کے حسن کی تاب لانا مشکل ہے۔اور جس طرح حشر کے سورج کا چرچاہے اسی طرح تیرے روشن رو ہونے کا چرچاہے۔دوسرے مصرعہ میں شور اس کا،میں ابہام ہے کہ اس کا مرجع آفتاب محشر ہے جس کے بارے میں سارے عالم میں یہ بات عام ہے کہ وہ گرم اور جھلسانے والا ہو گا،دوسرے اس کا مرجع محبوب کا چہرہ بھی ہے بلکہ اصل معنی اس کے یہی ہیں کہ محبوب کے حسن کا چرچا گھر گھر عام ہے ۔محشر کے معنی شور و ہلچل کے بھی ہیں اور اس حوالہ سے شور لفظ اور محشر کی مناسبتیں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔اس کے علاوہ محشر اور جہاں بھی آپس میں علاقہ رکھتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مضمون سے معنی تک کا سفر ہمیں شعر کی تفہیم میں کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔اردو شاعری کا یہ وصف خاص ہے کہ اس میں ایک لفظ کو کئی معنوں میں برت سکتے ہیں۔الفاظ کا تجریدی وصف اسے کثیر الجہتی معنوں کا حامل بناتا ہے۔اس

شعر پر ہی نگاہ کریں کہ "اس کا "فقرہ نے معنی کے کئی رخوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اس کا میں حقیقی آفتاب محشر کا مفہوم بھی ہے اور محبوب کے چہرے کا بھی، جو کہ محشر کے آفتاب کی طرح روشن ہے۔ محشر کے مفہوم کو اگر اور وا کریں تو اس کا ایک مفہوم اٹھایا جانا بھی ہے۔ اور ظاہر ہے سورج جب نکلتا ہے تو اسے اگنے سے تعبیر کرتے ہیں اس کے بلند ہونے کو اٹھائے جانے کے مفہوم میں شامل کر سکتے ہیں۔ اس تشبیہ کی وضوح سے محبوب کے چہرے کو سورج کی طرح نکلنے اور نمودار ہونے کے مفہوم میں دیکھیں تو یہ واضح ہو گا کہ محبوب جب جب اپنے گھر سے یا جس جگہ سے بھی نکلتا ہے تو مانند محشر آفتاب لوگوں کو اپنے حسن کی گرمی سے پگھلاتا جاتا ہے۔ جس سبب چہار عالم شور پڑ گیا ہے۔ گھر گھر کا فقرہ اس شور کی شدت میں اضافہ کرتا ہے۔

مضمون آفرینی سبک ہندی کی خصوصیات میں سے ہے۔ مضمون آفرینی سے مراد ایک ہی آئیڈیا یا خیال کو طرح طرح سے بیان کرنا۔ جس کے بارے میں انیس کا مشہور شعر ہے کہ

گل دستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

مثلاً کمر کے مضمون کو الگ الگ ڈھنگ سے بیان کرنا۔ غزلیہ شاعری میں محبوب کی کمر کا باریک ہونا یہ اس کا وصف سمجھا جاتا ہے۔ اور غزلیہ شاعری کی رسومیات میں سے ہے کہ محبوب کے کمر کو باریک ہی باندھا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس مضمون کو باندھا جائے تو غزل کی شاعری میں یہ قابل قبول نہ ہو گا۔ ولی کے یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسی مضمون کو ولی طرح طرح سے شعر میں ڈھالتے ہیں:

کاف کوفی ہے تجھ کمر کا پیچ
جگ میں اس کو سر کلام کیا
تجھ کمر کوں دیکھ حیراں ہو رہا
مو قلم لے ہاتھ میں مانی ہنوز
مجھ کوں سب عالم کہے باریک بیں
گر لگے ٹک ہاتھ وہ نازک کمر

کمر چونکہ باریک تصور کی جاتی ہے۔ اسی لئے اسے ضعیف و ناتواں تصور کر کے عاشق کی ضعیفی و ناتوانی کا مضمون بھی ولی نے خوب نکالا ہے۔ مثلا:

میں غم سوں گل سراپا جیوں مو ہوا ہوں لیکن
مجھ ناتواں کی جان وو مو کمر نہ آیا
رہے وہ مو کمر جیوں دیدۂ تصویر حیراں ہو
لکھوں گر خامۂ موسوں بیاں مجھ ناتوانی کا

یہ تصور اردو شاعری کی ابتدا سے اس کی شعریات میں شامل رہا ہے۔ مضمون سے مضمون نکالنا اور برتے ہوئے مضمون کو نئے ڈھنگ سے باندھنا کلاسیکی شاعری میں عام تھا۔ ان کے نزدیک نئی بات پیدا کرنے سے مراد پہلے سے معلوم حقیقت کو نئے طریقہ سے بیان کرنا ہے نہ کہ کسی نئی حقیقت کی دریافت ہے۔ ہماری کلاسیکی شاعری کی رسومیات میں کائنات اور موجودات کائنات اور خالق کائنات کے سارے تصورات طے شدہ ہیں۔ ان میں تغیر پذیری کے کوئی امکانات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کلاسیکی شاعری کے تذکرہ نویسوں کے یہاں، تلاش معنی یا معنی یابی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس سے مراد کائنات یا انسان سے متعلق کوئی نئی دریافت نہیں ہوتی بلکہ بیان کی گئی یا معلوم حقیقت کے متعلق نیا طرز اظہار مراد ہوتا ہے۔ فیض احمد فیض مضمون آفرینی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مضامین سے شاعر کے اپنے محسوس کردہ تجربات کے بجائے وہ بندھے عنوانات مراد لئے جاتے ہیں جن پر تقریبا ہر شاعر طبع آزمائی کرتا تھا، حسد ور قابت، معشوق کی بے وفائی، دنیا کی بے ثباتی، عاشق کی نقاہت، شب ہجراں کی طوالت۔ شاعر کے لئے یہ مختلف اقسام کے مصرعہ ہائے طرح تھے جن پر وہ زیادہ سے زیادہ خوبصورت گرہ لگا سکتا تھا۔ اسی کشیدہ کاری کو ہم مضمون آفرینی کہتے ہیں۔"(۵)

سبک ہندی کی شاعری کی ایک خصوصیت مثالیہ یعنی تمثیلی طرز بھی ہے۔ اس میں پہلے مصرعہ میں ایک بات کہی جاتی ہے، یعنی ایک مکمل بات رکھی جائے اور دعوی میں کوئی شاعرانہ دلیل پیش کی جائے۔ مثلا

ولی کا شعر ہے:

غرور زر سوں بجا ہے سکوت بے معنی
کہ بے صدا ہے سدا کوہسار خاموشی
اسباب سوں دنیا کے بے غرض ہوں سدا میں
بن تیل اور بتی ہے روشن چراغ میرا

پہلا مصرعہ تو بالکل واضح ہے کہ دنیا کے اسباب سے میں بالکل بے غرض ہوں، دوسرے مصرعہ میں پہلے مصرعہ کی بات کو مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا کہ جیسے بغیر تیل اور بتی کے چراغ روشن ہو جائے ویسے ہی میں دنیا میں ہوں کہ مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں میں اسباب سے بے نیاز ہوں۔ روشن چراغ میرا میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ باوجودیکہ تیل اور بتی کی مجھے ضرورت نہیں پھر بھی میرا چراغ روشن ہے۔ اسباب دنیوی کے باوجود بھی میں صاحب کمال اور صاحب نام ہوں۔

تمثیلی طرز شاعری کے بارے میں ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ولی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے شعر سازی کے اس طرز کو اردو میں رواج دیا جسے ہم سبک ہندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ طرز اس زمانے کے ایرانی و ہندی فارسی گویوں میں بہت مقبول تھا۔ اس طرز کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں استعارات حقائق میں اور حقائق استعارات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ پیچیدہ بیانی کی گرہیں باعث انبساط واہتزار ہوتی ہیں۔ الفاظ کے تہہ بہ تہہ تلازمات و انسلاکات سے نئے نئے مضامین ومعانی کی تخلیق و تولید ہوتی ہے۔'' (٦)

پیچیدہ بیانی کے رنگ کا ولی کا شعر ہے:

بیان سینہ چاکاں اے ولی کیوں کر سنے ہر یک
کہ بوئے گل سے نازک تر ہے آہنگ زبان دل

اس شعر کی نثر یہ ہے کہ عاشق کے سینہ چاک ہونے کی آواز ہر ایک نہیں سن سکتا کہ اس کے چاک ہونے کی آواز یا آہنگ بوئے گل سے نازک تر ہے۔

پھول سے نکلنے والی خوشبو کی لطافت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ لطیف تر ہوتی ہے ۔نازک تر یہاں لطیف تر کے معنی میں ہے ۔عاشق کے سینہ کا چاک ہونے کا آہنگ گل کی خوشبو سے بھی لطیف ہوتی ہے ۔اس لئے اسے ہر ایک نہیں سن سکتا۔ سینہ چاکاں لا کر گل اور دل میں مناسبت پیدا کی گئی ہے ۔گل جب تک کھلتا نہیں تب تک اس کی خوشبو باہر نہیں نکلتی ۔اس کا کھلنا اس کے سینہ کا چاک ہو جانا ہے ۔اس کے سینہ کے چاک ہونے یعنی اس کے کھلنے پر اس کی خوشبو باہر نکلتی ہے اور گل ۔اپنی سینہ چاکی کا بیان اپنی خوشبو کے ذریعہ کرتا ہے ۔پہلے مصرعہ میں ہر یک کا لفظ لا کر خوشبو کے عام ہونے کی طرف اشارہ بھی ہے اور عاشق کے سینہ چاکی کے آہنگ کو خاص بھی کیا گیا ہے کہ اسے ہر یک نہیں سن سکتا۔اس آہنگ سے واقف لوگ ہی اسے سن سکتے ہیں ۔بیان سینہ چاکاں میں جہاں عاشق کا کنایہ رکھا ہے وہیں گل کے کھلنے کی صورت کو عاشق کے سینہ کے چاک ہونے کی کیفیت کو مکمل تشبیہ میں ڈھال دیا ہے ۔اس مناسبت کے علاوہ لفظ بیان، آہنگ، زبان، سنے کی مناسبات بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

اس طرح ہم دیکھیں تو سبک ہندی کی خصوصیات ایہام، پیچیدہ خیالی، مضمون آفرینی، مثالیہ رکھنے والی شاعری کا پورا اثر ولی کے کلام میں نظر آتا ہے ۔اردو شاعری کا خاص وصف مناسبات و رعایتیں ہیں ۔ان کے بغیر ولی کی شاعری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ولی اپنے تقریبا ہر شعر میں اس کا اہتمام کرتے ہیں۔

رعایتوں اور مناسبات کی کچھ مثالیں ولی کی شاعری سے دیکھیں:

سبز چیرے نے ترے اے سبز بخت
زہر قاتل ہو کیا جیو لخت لخت

بے آب لگے آب حیات اس کی نظر میں
پانی ہوا تجھ گال کے جو عشق میں گل کر

تجھ زلف سوں لیا ہے کعبہ سیاہ پوشی
تیرے ذقن کے شر موں پانی ہوا ہے زم زم

ترے خیال میں اے بحر حسن دیدۂ تر
ہوئے ہیں آب سراپا حباب کے مانند

سبز چیرے اور سبز بخت کی مناسبت کے علاوہ زہر میں بھی مناسبت ہے کہ زہر کھا کر انسان کا جسم سبز ہو جاتا ہے اور زہر سبز بھی استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے شعر میں بے آب، آب حیات، پانی ہوا، اور گل کی مناسبتیں واضح ہیں۔ تیسرے شعر میں ذقن اور پانی میں مناسبت ہے کہ معشوق کے زنخداں کو کنویں اور چاہ سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس کے لیے چاہ اور ذقن دونوں لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ چاہ کی تشبیہ پانی کے تصور کے ساتھ ہی ہے۔ زم زم بھی پانی اور کنویں دونوں معنی کا حامل ہے کہ آب زم زم اور زم زم کنواں دونوں مستعمل ہے۔ آخری شعر میں بحر حسن، دیدۂ تر، آب اور حباب آپس میں علاقہ رکھتے ہیں۔ ولی کا کلام رعایت و مناسبات سے سجا ہوا ہے، یہ تو چند مثالیں تھیں۔ جب کہ ولی کے بیشتر کلام میں رعایتوں اور مناسبتوں کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اردو کلاسیکی غزل کی رسومیات کا بیشتر حصہ فارسی غزل سے مستعار ہے۔ غزل کے مرکزی کردار عاشق و معشوق ہیں۔ اور عشق غزل کا بنیادی موضوع ہے۔ غزل اصلاً عشق و محبت، وصل و جدائی، وفا و بے وفائی جیسے جذبات و مضامین کو عاشق و معشوق کے ذریعے بیان کرنے والی صنف ہے۔ فارسی غزل میں عشق کا معیار لیلیٰ و مجنوں و شیریں فرہاد کے عشق سے متعین ہوتا ہے۔ ہماری اردو غزل میں بھی ان کرداروں کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ ان کرداروں کے نام عشق کی کیفیت کے لئے مثال بنا بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ عشق کی آگ میں جلنا، جدائی کے تعب جھیلنا، گریہ و شیون کرنا، مجنوں و دیوانہ ہو جانا، وصل کی تمنا کرنا، عشق میں ناتوانی کی حد تک پہنچنا عاشق کے کردار کا لازمہ ہیں۔ معشوق کا ستم پیشہ ہونا، جور و جفا کرنا، بے وفا سنگ دل ہونا، معشوق کے کردار کا وصف خاص ہے۔ معشوق کا حسین ہونا بدیہی ہے۔ اور اس کا حسن لاثانی ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے حسن کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ معشوق کے حسن نے اردو غزل کو لاتعداد موضوعات دیے ہیں۔ مثلاً اس کے قد کا بالا ہونا، اس کی کمر کا باریک ہونا۔ اس کے دہن کا چھوٹا ہونا، اس کی زلف کی درازی، اس کے لبوں کی سرخی، اس کی آنکھوں کا نشیلا ہونا، اور اس کے حسن کا لازوال ہونا معشوق کے متعلق موضوعات ہیں۔ ولی کا شعر ہے:

حسن تیرا ہے ہمیشہ یکساں
جنت سے بہار کیوں کے جاوے

معشوق کے یہ اوصاف ناقابل تغیر ہیں۔ ان میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ کمر کے مضمون کو باریک ہی باندھا جائے گا اور لب سرخ ہی بیان کیے جائیں گے۔ غزل میں عاشق و معشوق کے علاوہ کچھ اور بھی کردار ہیں جن کو غزلیہ شاعری میں ہمیشہ پیش کیا گیا ہے

۔ تیسرا کردار رقیب کا ہے۔ یہ بھی عشق کا دعویدار ہو گا۔ اور عاشق کا دشمن سمجھا جائے گا۔ رقیب غزل کی شاعری میں ہمیشہ روسیہ ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ذیل میں خیر کے کلمات غزل کی شاعری میں نہیں لائے جاتے۔ ناصح کا کردار بھی غزل کی شاعری میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ناصح کو ظاہر پرست سمجھا جاتا ہے۔ یہ مذہبی، دیندار، مشرع پیش کیا جاتا ہے۔ عاشق کو چونکہ عشق سے غرض ہے۔ اسے شراب، عشق و معشوق سے غرض ہے اس لیے اسے کفر کرنے والا تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل ناصح کا کردار اسے ان چیزوں سے باز رکھنے والے مذہبی کردار کے طور پیش کیا جاتا ہے۔

فارسی غزلیہ شاعری میں یہ کردار غزل کے بنیادی کرداروں میں سے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہی کردار ہماری اردو شاعری میں بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان سے منسوب مضامین کو ہی اردو شاعری اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ عاشق کا معشوق کے حسن میں گرفتار ہونا، اس کے عشق میں دیوانہ ہونا۔ محبوب کا ستم گری کرنا، رقیب کا حائل ہونا اور ناصح کا نصیحت کرنا۔ انہیں کے ذریعہ اردو کی عشقیہ غزل نے اپنی تعمیر کی ہے۔

یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ یہ غزل کی تصوراتی دنیا ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ عشق میں دیوانہ ہو جانا۔ ناتواں ہو کر مو کمر ہو جانا۔، محبوب کا آفتاب محشر ہونا، اس کے قد بالا کا سرو ہونا، لبوں کا یاقوت ہونا۔ یہ غزل کے تصوراتی دنیا ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ولی نے غزل کے ان کرداروں کو ان کی تمام خصوصیات کے ساتھ اپنی غزل میں مستحکم کیا۔ اور فارسی غزل کی رسومیات ولی کی غزل کے لیے زمین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس پر ولی نے طرح طرح کے گل و بوٹے اگائے ہیں۔ اور ان کرداروں کے توسط سے فارسی غزلیہ شاعری کے مضامین بھی اردو شاعری کا حصہ بنے۔ فارسی اور اردو غزل میں مضمون کے مشترک ہونے کے بارے میں قاضی افضال لکھتے ہیں:

> ''مضمون کی سطح پر اشتراک اور اشتقاق کی اکثر صورتیں فارسی اور اردو غزل میں مشترک ہیں ۔۔۔۔۔ جو کلیدی الفاظ اردو کی کلاسیکی غزل میں رائج و مقبول رہے ہیں وہ سب کے سب فارسی غزل سے مستعار ہیں۔ یہی الفاظ ان دونوں زبانوں کی شاعری میں مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب جب کوئی شاعر بالکل نیا لفظ/استعارہ اختراع نہ کرلے، تب تک نئے مضمون کا امکان نہیں بلکہ (اڈانس انگریزی میں لکھنا ہے اسے) کے ایک

مشاہدہ کی بنیاد پر یہ کہنے کا جی چاہتا ہے کہ شاید عربی سے اردو تک غزل کی روایت میں مضمون کی بنیاد یہی اشتراک یا اشتقاق ہے۔"(۷)

قاضی افضال کا محولہ بالا اقتباس ہمیں مضامین کے وجودی سروکاروں سے واقف کراتا ہے۔ الفاظ و استعارہ کسی بھی خیال و مضمون کو وجود میں لانے کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ بولا ہوا لفظ ہی لکھا جا سکتا ہے اور ہر لفظ تہذیبی علامت ہوتا ہے۔ قاضی افضال جب یہ کہتے ہیں کہ عربی سے لے کر اردو غزل کی روایت تک مضمون کی بنیاد یہی اشتراک و اشتقاق ہے تو وہ ہمیں اس یکساں تہذیبی و تاریخی ورثہ تک لے جاتے ہیں، جو ان تین زبانوں میں مشترک ہیں۔ جس کے یکساں عناصر ہمیں الفاظ و استعارہ و تلمیح کی صورت میں ایک بڑی روایت میں جوڑتے ہیں۔ مقامی خصائص اور جغرافیائی حالات سے پیدا شدہ مضامین کے علی الرغم یکساں تہذیبی تصورات اور تاریخی ورثہ ہمیں ان مضامین کے سبب جوڑتا ہے۔ اس حوالے سے اردو شاعری کا بیشتر حصہ اپنے ماقبل کے ان تہذیبی و تاریخی ورثوں سے اشتقاق رکھتا ہے۔

ولی کی شاعری فارسی غزل کی تصوراتی دنیا، فارسی غزل کی رسومیات کی پابندی تو کرتی ہی ہے، لیکن ان تصورات کو اپنانے کا طریقہ الفاظ، استعارات، اور تلمیحات کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکا ہے۔ گل چہرہ، گل عذار، گل رخاں، غنچہ دہن، غنچہ لب، سرو صنوبر، شمشاد، ستم گر، ظالم جیسے الفاظ ہمیں فارسی غزل کے اس تصوراتی محبوب تک لے جاتے ہیں جو فارسی غزلیہ شاعری کے محبوب کا وصف خاص ہے۔ اسی طرح غمزہ کو تیغ، ابروؤں کو کمان، شعر کے دو بیت اور مصرعے کہنا، حسن کو آفتاب سے تشبیہ دینا، اور اس جیسی بہت سے تشبیہات فارسی سے مستعار ہیں۔ ولی جب ان الفاظ کا استعمال اسی تصور غزل کے سیاق میں کرتے ہیں تو وہ محبوب کے اسی تصور کو اردو شاعری کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ ولی کی شاعری محبوب کے اس تصور کو اردو کی شعری دنیا میں پوری شدت سے قائم کرتی ہے۔ مثالیں:

اے غنچہ دہاں نام ترا جب سے لیا ہوں
اس آن سوں خوش باس ہوا ہے دہن گل

مکھ ترا بحر حسن ہے جاناں
زلف پر پیچ موج عنبر ہے
مجھ سے کیوں کر ملے گا حیراں ہوں

شوخ ہے بے وفا ہے سرکش ہے

غزل کے عاشق کا کردار ولی کی شاعری میں دیکھیں کہ:

نہ پوچھو عشق میں جوش و خروش دل کی ماہیت
بر نگ ابر دریا بار ہے رومال عاشق کا

بے آب لگے آب حیات اس کی نظر میں
پانی ہوا تجھ گال کے جو عشق میں گل کر
اغماض کیا چلتا رہا مجھ کوں نہ دیکھا
کیا اس کوں مرے حال پہ کچھ پیار نہ آیا

ولی کے یہاں ناصح کا کردار دیکھیں:

دیکھ احوال مرا ناصح مشفق نے ولی
ہاتھ سے ہاتھ ملا درد سے سینہ کوٹا
حقیقت سوں تری مدت ستی واقف ہیں ہم زاہد
عبث ہم پختہ مغزاں سوں نہ کر اظہار خامی کا

فارسی تصور عشق کے ساتھ ہی ولی کی شاعری میں ہندوستانی و مقامی تصور عشق کا نظریہ بھی ملتا ہے۔ ولی کی غزلوں میں مقامی اثرات کی نوعیت زبان کے تعامل کی سطح پر دو قسم کی ہیں ۔ ایک ایسے الفاظ جو مقامی ہیں۔ لیکن وہ الفاظ کوئی استعارہ یا تلمیح کی حیثیت نہیں رکھتے۔ مثلا پیو، پیا، چنچل، نگھر گھٹ، موہن وغیرہ۔ کچھ الفاظ ہندوستانی ایسے بھی ہیں۔ جن الفاظ کا استعمال شعر میں محض لفظی معنی کی حد تک مستعمل ہے۔ یعنی محبوب یا معشوق کی جگہ پر ایک مقامی لفظ جسے محبوب کے مترادف کے طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

زبان کا تعامل تہذیبی تصورات سے مل کر وجود پذیر ہوتا ہے۔ کسی ادبی فن پارہ میں تہذیبی تصور پر مبنی استعارہ جب مستعمل ہوتا تو فن پارہ تک اسی تہذیبی تصور کے تحت ہی تعمیر ہوتا ہے۔ زبان میں تہذیبی اثرات کا تعامل کئی طریقوں سے ہوتا ہے

۔لفظ کی سطح پر، محاورے و ضرب الامثال کی سطح پر،استعارہ تلمیح کی سطح پر۔ کسی زبان پر کسی اور زبان کے اثرات لفظی سطح پر پڑ سکتے ہیں اور پڑتے ہیں لیکن الفاظ کا دساور کسی تہذیبی تصور کو تبدیلی کے مراحل سے نہیں گزارتا۔استعارہ و تلمیح دراصل زبان میں تہذیبی اثرات منتقل کرنے کے لیے بہت موثر ہوتے ہیں۔ہم ولی کی شاعریمیں دیکھتے ہیں کہ الفاظ کی سطح پر وہ ہندی یا سنسکرت الفاظ یہاں تک کہ ان کی شاعری کے مخاطب کو بھی اپنی شاعری میں بار بار استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا یہ استعمال لفظی استعمال ہے۔ مثلا:

پی کے ہوتے نہ کروں توں مہ کی ثنا
معتبر نئیں ہے حسن دور نما
لیا ہے جس سوں موہن نے طریقہ خود نمائی کا
چڑھیاں ہے آرسی پر تب سوں رنگ حیرت فزائی کا
سجن کی انجمن میں ہوئے تب ہر یک طبع روشن
ولی چرچا اچھے مجلس میں جب طبع آزمائی کا

ان اشعار میں دیکھیں پیو، موہن، سجن ہندی الفاظ ہیں اور مقامی شاعری کے مخاطب یعنی معشوق ہیں۔ان کے ذریعہ ہندی شاعری کے معشوق کا تصور نہیں ابھرتا۔یہ محض مترادف کے طور پر برتے گئے ہیں۔ گرچہ فارسی شعرا کے لیے یہ الفاظ نئے ہوں گے لیکن اگر انہیں اس کے معنی سے آگاہی ہوجائے تو اس کے لیے انہیں کسی تہذیبی یا ثقافتی پس منظر کے دریافت کی ضرورت نہ پڑے گی۔اس کے برعکس ولی کی شاعری میں ایسے الفاظ اور ترکیبیں بھی ملتی ہیں جن کے تہذیبی سیاق کو جانے بغیر اس کے مفہوم تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ مثلاً گج گامنی، سنسکرت میں محبوب کی چال کو ہاتھی کی چال سے تشبیہ دیتے ہیں۔اور مستانہ چال کو ہاتھی کی چال سے متصف کیا جاتا ہے، مستانہ چال چلنے والے محبوب کے لیے گج گامنی کی تشبیہ لائے ہیں۔ ظاہر ہے سنسکرت شاعری میں گج گامنی محبوب کی صفت ٹھہرے گی۔اس تصور کو جانے بغیر کسی دوسری تہذیب کا فرد اسے نہیں سمجھ سکتا۔اسی طرح کنول کو آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔یا جوگی کا تصور جو خالص ہندوستانی کردار ہے۔ولی نے ایسے تہذیبی استعارہ کے حامل الفاظ کو بھی اپنے کلام میں برتا ہے۔ لیکن ان کی تعداد فارسی کے مقابلے میں کم ہے۔ولی کے یہاں سے مثال دیکھیں:

کھڑا ہے راستی کے دم میں یک پگ پر سو جیوں جوگی

ترے قدسوں لگا ہے دھیان سرو جو بناری کا

اس شعر میں جب تک جوگی کے کردار سے واقفیت نہ ہو شعر پوری طرح نہیں واضح ہو سکتا۔ یہ شعر سنسکرت شعریات سے اثر پذیری، مقامی اثرات اور فارسی غزل کی رسومیات تینوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

نین دیول میں پتلی یو ہے یا کعبہ میں اسود ہے

ہرن کا ہے یو نافہ یا کنول بھیتر بھنور دستا

جو دھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سے اے صنم

ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

ولی کے یہاں مقامی اثرات سے اثر پذیری کا ایک پہلو اور بھی ہے کہ ان کی کچھ غزلوں میں مقامی محبوب کی جھلک بہت واضح ہے ۔ دکھنی شاعری کے ذریعہ سنسکرت شاعری کا طرز کہ عورت متکلم اور مرد مخاطب ہو، عورت برہ کی آگ میں جلتی ہے اور اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہے ولی کے یہاں بھی اس قسم کی شاعری کے کچھ نمونے ملتے ہیں۔ غزل نمبر ۷۲ اور غزل نمبر ۷۳ کو دیکھا جاسکتا ہے کہ وہاں عورت اپنے غم اور محبت کا اظہار کرتی ہے۔ ان غزلوں میں مرد متکلم نہیں بلکہ عورت ہے۔ اس صورت کے علاوہ ولی کی کچھ غزلوں میں محبوب بالکل مقامی نظر آتا ہے۔ فارسی غزل کا تصوراتی محبوب یہاں نہیں ہے بلکہ حقیقی محبوب کی صورت نظر آتی ہے۔ عشق کا کھلا اظہار ہے اور جس سے کیا جارہا ہے اس کے سامنے ہونے کا احساس بھی ہے۔ ان غزلوں کا محبوب ارضی ہے، مخاطب حقیقی ہے اور سامنے بھی۔ غزل نمبر ۹ اور دس اس کے لئے دیکھی جاسکتی ہیں۔

ولی کا اسلوب:

ولی کی شاعری کا اسلوبیاتی جائزہ لینے اور ولی کے اسلوبیاتی مطالعات سے بحث کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم اسلوبیات سے کیا مراد لیتے ہیں یا ادبی تنقید کا اسلوبیاتی طریقۂ کار کس طرح کسی ادبی متن کی قرأت کرتا ہے۔؟ اسلوبیات کا لسانیات سے گہرا رشتہ ہے۔ یہ لسانی اصطلاحات کو بروئے کار لاتی ہے لغت، نحویات، صرفیات و معنیات کے مختلف اقسام اسلوبیاتی تنقید میں برتے جاتے ہیں۔ اسلوبیاتی تنقید اس اسلوب کو بھی شناخت کرتی ہے جو فن کار کے انفرادی فنی برتاؤ سے مخصوص ہے۔ اسلوب کی تشکیل میں کلام کے ترکیبی نظام کو بھی کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ لفظ سے میری مراد لفظ کی مختلف اقسام ہیں۔ مثلاً اسم، فعل ،حرف کے علاوہ لفظ بطور تشبیہ و استعارہ اور لفظ بطور نرالفظ وغیرہ۔ اسلوب کی تشکیل میں تخلیق کار کے زمانی عرصہ اور مکانی حدود سب کو دخل ہے۔ زبان کا ساختیہ ایک حال پر قائم نہیں رہتا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ فی معنی زبان کا ساختیہ ارتقاء پذیر رہتا ہے۔ ہم اس تبدیلی کو تخلیقی روایت کے ارتقائی مدارج میں تلاش کر سکتے ہیں۔ مثلاً اردو کا دکنی اسلوبیاتی زاویے سے کسی ادبی متن کا مطالعہ تخلیق کار کے اسلوبیات کو نشان زد کرنے کے ساتھ ساتھ امتیازی اسلوبیاتی مرحلے پر موجود تخلیق کار کے اختراعی اور جدت پسند طریقہ ہائے اظہار کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔ تخلیق کار ادبی وسائل اور اظہار کی جن فنی تدابیر کو استعمال میں لا کر اپنا مخصوص اسلوب پیدا کرتا ہے ان وسائل تک رسائی حاصل کرنا اسلوبیاتی نقاد کی ذمہ داری ہے۔ اردو غزل کی روایت خالص مشرقی روایت ہے اور اس روایت میں بیان و بدیع کے مستعملات شعری اسلوب کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں؛ اس لیے کلاسیکی شعری متن کے اسلوبیاتی مطالعے میں بدیع و بیان کے مباحث سے انحراف یا صرف نظر ممکن نہیں ہے۔ ہمیں شاعر کے یہاں لازمی طور پر یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ لفظ کو ادائے معنی کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی، مضمون

آفرینی اور اثر پیدا کرنے کے لیے کس طرح استعمال میں لاتا ہے۔اس کے یہاں جملوں کی ترکیب اور شعر کی تعمیر کس طرح ہوتی ہے۔ہمارے یہاں اسلوبیاتی تنقید کا تصور اگرچہ جدید تصور کہا جاتا ہے اور یہ بھی مغرب کے زیر اثر یہاں آیا ہے لیکن ہمارے یہاں اسلوب کی مقامی بنیادیں اور خصوصیات بھی موجود رہی ہیں؛اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو اسلوبیات میں قدیم و جدید کا امتزاج ہے۔اس امتزاج کو ملحوظ نظر رکھے بغیر ر کلاسیکی شاعری کی اسلوبیاتی قرأت صائب نہیں ہو سکتی۔گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> اسلوب، عہد ولی کا اسلوب،، عہد میر کا اسلوب، عہد غالب مومن کا اسلوب، عہد اکبر واقبال کا اسلوب۔ ہم بنظر غائر ان مختلف زمانوں کے ادبی وشعری اسالیب کا جائزہ لیں تو ہم اسلوب کی مکانی وزمانی جہت کو نشان زد کر سکیں گے۔ ہم شاعروں کے اسالیب پر نظر کریں تو ان کے مابین مابہ الامتیاز اوصاف مل جائیں گے جو ان کے اسلوب کی انفرادیت کو نشان زد کرنے میں معاون ہوں گے۔
>
> مشرقی روایت میں ادبی اسلوب بدیع کے پیرایوں کو شعر و ادب میں بروئے کار لانے اور ادبی حسن کاری کے عمل سے عہدہ برا ہونے سے عبارت ہے۔یعنی یہ ایسی شے ہے جس سے ادبی اظہار کی جاذبیت، کشش اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔یعنی مشرقی روایت کی رو سے یہ طور لازم نہیں بلکہ ایسی چیز ہے جس کا اضافہ کیا جا سکے۔اس اسلوب کے قدیم و جدید تصور یعنی اسلوبیات کے تصور میں پہلا بڑا فرق یہی ہے کی اسلوبیات کی رو سے اسلوب کی ادبی حیثیت اضافی نہیں بلکہ اصلی ہے یعنی اسلوب لازم ہے یا ادبی اظہار کا ناگزیر حصہ ہے یعنی ادبی اسلوب سے مراد لسانی سجاوٹ، زینت کی چیز نہیں جس کا ردیا اختیار میکانیکی ہو بلکہ اسلوب فی نفسہ ادبی اظہار کے وجود میں پیوست ہے۔(۸)

اسلوبیاتی تنقید نظام لسان سے کام لیتی ہے۔یہ اپنی طرف سے متن کو معنی پہنانے کے بجائے علم لسانیات کی رو سے سے متن کے مختلف عناصر یعنی صوتی، نحوی، صرفی پہلوؤں سے بحث کرتی ہے اور اور اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ لفظ متن میں آہنگ کی تشکیل کیسے کرتا ہے اور جملوں کی ترکیب معنی کی تعمیر کس طریق پر انجام دیتی ہے۔اس طریقہ پر تنقید میں تخیل کی آزادی کے بجائے عقل اور قواعد کی پابندی لازم ہے۔اس ناحیہ سے اگر ہم غور کریں کریں تو ولی کی شعری زبان کا اولین مطالعہ کرنے والوں میں عبدالستار صدیقی کا نام سب سے اہم ہے۔عبدالستار صدیقی نے ولی کی زبان کا بطور خاص مطالعہ کیا ہے۔عبدالستار صدیقی اردو لسانیات کے ان فاضلوں میں شمار ہوتے ہیں جنھیں لفظ شناسی، لغت اصطلاح اور علم اللسان کے باب میں سند کی حیثیت حاصل ہے۔عبدالستار صدیقی زبان اور اسلوب پر مرور زمانہ کے اثرات کا گہرا شعور رکھتے تھے۔اردو زبان کی

ساخت میں زمانی انقلاب سے ہونے والے تغیر و تبدل کو نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ انہیں ترکیبوں و جملوں کی بدلتی صورت اور لفظوں کی معنوی توسیع اور تقلیب کا وافر علم تھا۔ وہ تبدیلی کے اس عمل کو زبان کی زندگی، تحرک اور ارتقا سے تعبیر کرتے تھے۔ عبدالستار صدیقی اپنی ان خوبیوں اور خصوصیات کی وجہ سے ولی کی زبان کے سلسلے میں درجۂ استناد پر فائز قرار دیے جاسکتے ہیں۔

عبدالستار صدیقی کا کا مضمون ولی کی زبان سے متعلق یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں انھوں نے نے لسانی امتیازات کی نشاندہی میں زمانی سیاق سے پہلو تہی برتنے کے نقصانات دکھائے ہیں اور بتایا ہے کہ ولی کی زبان بالخصوص اورنگ آباد کی زبان دکن کے عام محاورے سے مغائرت اور دہلوی لہجے سے قربت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ تاریخی ترقیات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ کیوں کر ان کو زبان کی ارتقائی منزلیں اپنے پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

عبدالستار صدیقی ولی کے یہاں پہلے ایسے الفاظ کی نشاندہی کرتے ہیں جو دہلوی اور اورنگ آبادی زبان میں مشترک ہیں۔ وہ تذکیر و تانیث میں پیدا ہونے والے والے اختلافات پر زمانی و مکانی اثرات کی طرف بھی اشارے کرتے ہیں۔ نحوی ترکیب میں عبدالستار صدیقی ولی کو شمالی ہند کا مماثل پاتے ہیں۔ عبدالستار صدیقی زبان میں لفظ کی ملفوظی صورتوں کو اہمیت دیتے اور فلسفۂ لسان کی رو سے صحیح بات بھی یہی ہے کہ لفظ کی ملفوظی صورت ہی اس کی واقعی صورت ہے۔ لفظ جس زبان سے مستعار ہے اس زبان میں لفظ کی ملفوظی صورت جو کچھ بھی ہو لیکن وہ جس زبان میں لایا گیا ہے اس زبان کے صوتی نظام اور لہجے کی کی پیروی اس پر لازم ہے۔ ولی کے یہاں الفاظ کی ملفوظی صورتیں پائی جاتی ہیں اور اس کا جواز لسانیات کی رو سے ہی ملتا ہے۔ لسانی نقطۂ گاہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے عبدالستار صدیقی نے ولی کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ ساکن الاوسط الفاظ کو متحرک الاوسط باندھنا نہ ولی کا عیب قرار دیا جاتا رہا ہے یہاں بھی عبدالستار صدیقی زبان کی ملفوظی شکل اور عام محاورے میں رائج تلفظ سے استدلال کرتے ہیں۔

حرف کی تبدیلی سے لفظ میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ قلب و ابدال کا قاعدہ کئی زبانوں میں رائج رہا ہے۔ مثلاً سوکھا کو سکا، باہر کو بھار لکھنا، ٹ،ڈ،ڑ کی پے بہ پے تکرار ہونے پر پہلے حرف کو ت اود د سے بدل دینا جیسے جیسے ٹکڑا کو تکڑا، ڈانٹنا کو دانٹنا، ٹھاٹ کو تھاٹ، ڈیوڑھی کو دیوڑھی لکھنا، حصر کو مختلف لہجہ میں ظاہر کرنا جیسے تمھی کو تمی، یائے متوسطہ اور یائے متاثرہ کو الف سے مخلوط

کرنااوراسم کے ساتھ فعل میں بھی اسے برتنا،اں سے جمع بنانا،واحد مؤنث کاالف پر اختتام ہو تو اں لگا کر ی کو مخلوط کر دینا جیسے تسبی سے تسبیاں۔

عبدالستار صدیقی کا یہ مطالعہ الفاظ تک محدود ہے لیکن اس سے ولی کے اسلوبیاتی مطالعے میں مدد ملتی ہے کہ لسانی مذاق و مزاج کو سمجھے بغیر اسلوبیاتی مطالعہ ممکن نہیں۔ دبستان دہلی اور دبستان اورنگ آباد کی زبان جن پہلوؤں سے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتی ہے ان پہلوؤں کا جائزہ غزلیات ولی کی قرأت کو آسان کر دیتا ہے۔ ولی نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ہم ان کے مزاج اور مذاق سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اس بات کا علم بھیحاصل ہوتا ہے کہ اگر کسی بھی شاعر کے لسانی مزاج اور مذاق کے ساتھ لفظ کی فی زمانہ مروج صورتوں کو پیش نظر نہ رکھاجائے تو کیسی کیسی غلطیوں کا امکان ہوتا ہے۔

عبدالستار صدیقی کا مضمون ن ولی کی لسانی مزاج و مذاق کے بارے میں ہمیں آگاہی دیتا ہے۔ شمالی ہند کی زبان سے ولی کی زبان اور اورنگ آبادی اردو کا جو رشتہ ہے اس رشتے کو سامنے لاتا ہے۔ نکتۂ نگاہ سے صرف نظر کر کے ولی کی زبان میں مغایرت کی نشاندہی کرنے والوں کی غلطیوں کو نشان زد کرتا ہے۔ یہ مطالعہ اگرچہ متن کی تعبیر میں ولی کے لسانی رویے کو معنیاتی سطح پر سامنے نہیں لاتا، نہ ہی اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ مختلف صوتیے کس طرح ولی کے یہاں آہنگ کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس کمی کے باوجود ولی کے اسلوبیاتی مطالعے میں اس مضمون کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ولی کی لسانی خصوصیات کو دیکھنے اور پرکھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ولی نے کس نوع کے الفاظ اور اصوات کو ترجیحاً استعمال کیا ہے۔ ولی کی دکنی نسبت اس بات کا امکان پیدا کرتی ہے کہ ان کے یہاں دکنی کا لسانی مزاج موجود ہو گا۔ اس صورت میں ہمیں دکنی کے لسانی مزاج تک رسائی حاصل کرنا ہوگی کہ دکنی کا صوتی آہنگ کس طرح تشکیل پاتا ہے اور اسے بعد کی اردو شاعری کے آہنگ سے کیا نسبت ہے؟ دکنی کے بارے میں اردو ماہرین (۹) کا خیال ہے کہ اس میں غیر مسموع لہاتی بندش کی آواز مثلاق مفقود ہے جس کی وجہ سے صفیری آوازخ کی تکرار زیادہ ہو جاتی ہے۔ ژ کا صوتیہ بھی دکنی آہنگ میں مفقود ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے دکن اور شمالی ہند کے صوتی آہنگ میں موجود امتیاز کو نشان زد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کے صوتی آہنگ کی امتیازی شان عربی-فارسی کی چھ آوازیں یعنی ف ا ز ا ژ ا خ ا غ اور ق سے ہی قائم ہے۔ جن میں سے دو آوازیں یعنی ق اور ژ دکنی آہنگ سے خارج ہو جاتی

ہیں۔ باقی ماندہ چار عربی فارسی آوازیں یعنی ف/غ/خ اور ز سے ترکیب پانے والے الفاظ اگرچہ دکنی میں
بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن ان کے بغیر بھی دکنی اسلوب بدستور قائم رہتا ہے۔" (۱۰)

اس مقام پر ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ غزلیات ولی میں صوتی آہنگ کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ آیا وہ دکنی آہنگ کی پیروی کرتے ہیں یا پھر ان کا شعری آہنگ دکنی آہنگ سے علاحدہ شان رکھتا ہے؟ ولی شعر کے صوتی آہنگ کو کس طرح ترتیب دیتے ہیں انتخاب الفاظ میں اصوات کی ترتیب میں سب کو باہم ممزوج کرنے کے لیے کیا طریقے اپناتے ہیں۔ اس عمل سے ان کے یہاں شعر کی اثر آفرینی اور معنی آفرینی پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ اس پہلو کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں ولی کے اشعار دیکھنے ہوں گے:

ہنسلی گل میں دیکھ کہتے ہیں
چاند سیں مکھ کا ہے گا یوہالا

شراب شوق سے سرشار ہیں ہم
کبھو بے خود کبھو ہوشیار ہیں ہم

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

موت سی عشاق ہیں عشاق جفا کے
بے داد کہ وہ ظالم بے داد نہ آیا

ولی کے اشعار میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دکنی اور غیر دکنی اصوات کو بروئے کار لاتے ہیں۔ معنی و مضمون کی بات سے پرے اسلوب کی سطح پر ولی کا غالب پہلو ان کا اورنگ آبادی لہجہ اور آہنگ ہے لیکن وہ اپنی ماقبل روایت کے اثرات سے بالکل آزاد نہیں کہے جاسکتے کہ اس کی مثالیں بھی ولی کے یہاں ملتی ہیں۔

ولی ہماری شعری روایت کا ایسا نشان ہے جہاں سے شعری جہان منقلب ہو کر ایک نئے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ ولی کا تعلق اس اورنگ آبادی دبستان سے ہے جہاں اقلیم سخن پر مثنوی کی حکمرانی باقی نہیں رہتی اور غزل اردو شعری روایت میں ایک طاقتور اور توانا صنف کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے اور اس صنف کو توانا و طاقتور بنانے میں ولی کے شعری اجتہاد اور صنفی ترجیح کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ولی نے کس نوع کے شعری اسلوب کی تشکیل کی کہ دکنی اسلوب کا قائم مقام اسلوب

پیدا ہو گیا۔ اور شمال کے لوگ اس اسلوب کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے اور ولی کی ایسی پیروی کی کہ ولی اورنگ آبادی دبستان کے مستحق اور اردو غزل کے مجدد ہوتے ہوئے شمالی ہند کے شاعر معلوم ہونے لگے۔ ایسا اس وجہ سے ہوا کی ولی کی اگائی پود اور لگائی گئی صدا ایسی سحر کن ثابت ہوئی کہ شمال کی شعری فضا کو اسیر کر لیا۔ یہاں پر ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ ولی نے غزل میں ایسا کون سا طور اختر ع کیا جو چل نکلا تو اس نے اورنگ آباد اور دہلی نام کے دو دبستان پیدا کر دیے۔ ولی کی شاعری کا یہ پہلو اسلوبیاتی مطالعے ہی سے روشن ہو کر سامنے آتا ہے۔ اسلوبیاتی تبدیلی کے پیچھے اقتداری تبدیلی کے تاریخی پہلو بھی کار فرما رہے ہیں جن کی طرف عبد السّتار صدیقی نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ اورنگ آباد کی تشکیل اور وہاں اردو لہجے اور لسانی مزاج کا ارتقاء؛ یہ دو پہلو ولی کے اسلوبیاتی مطالعے میں اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ولی نے صناعی اور فنکاری کا جو پیمانہ وضع کیا اور اظہار معانی کے لیے زبان کا جو طور منتخب کیا اس نے ولی کے اسلوب کو بنایا۔ ولی نے مضمون و خیال کے ساتھ ساتھ دکنی آہنگ سے اپنے اسلوب کو منفرد بنانے کی سعی اور ان کی یہ سعی اورنگ آبادی لہجے اور محاورے میں ممزوج ہو کر نیا رنگ لانے میں کامیاب رہی۔

جلوہ میرا ہوا شاہد معنی
جب زبان سے اٹھے نقاب سخن

ولی کی اسلوبیاتی تشکیل میں ان کے تصورِ شعر کو بھی بہت کچھ دخل ہے اور ولی کے دیوان کو دیکھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ولی نے سبک ہندی کی روایت سے کسب فیض کیا اور بیدل جیسے بڑے شاعر کی فنی تدبیروں کا اثر بھی قبول کیا۔ اس کسب نے ولی کے یہاں اظہار کی گہرائی اور لطافت پیدا کی۔ ولی کا یہ طرز اظہار دیکھتے ہی اہل شمال ان کی طرف لپک پڑے۔ اگرچہ ولی کے اثر کو چھپانے اور ان کے اسلوب کی پیروی کو پردے میں رکھنے کے لیے انہوں نے اپنی ترکیبیں کیں جن کا بیان سابقہ تین ابواب میں گزر چکا ہے۔

ولی کے شعری اسلوب کو جانچنے پرکھنے والے مطالعات ایسے ہیں کہ ولی کی اہمیت و افادیت کو ثابت کرنے کے لیے اس شعری فضا کو پیش نظر رکھتے ہیں جو ولی کے بعد ظہور میں آئی۔ یہ شعری فضا جیسا کہ اوپر بھی مذکور ہوا ولی کی پیروی کرنے سے پروان چڑھی۔ ولی کے شعری اجتہاد سے کیا جانے والا استفادہ دہلوی دبستان کی تشکیل میں کلیدی مقام کا حامل ہے۔ ولی کے اسلوبیاتی

اختراع کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ماقبل ولی اور مابعد ولی کی شعری فضا کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایسا کرنے پر ہی ولی کی واقعی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ہمارے یہاں اب تک ولی کا جس قدر بھی مطالعہ کیا گیا ہے وہ بیشتر زمانۂ مابعد کے شعرا کے حوالے سے کیا گیا ہے یعنی ولی کی شاعری کے بارے میں جب ہم کچھ لکھتے پڑھتے ہیں اور سوچتے ہیں تو ہمارے ذہن میں میر و غالب یا بعض دوسرے شعرا ہوتے ہیں اور ہم انھیں زمانۂ مابعد کے شعرا کے تناظر میں ولی کی اہمیت و انفرادیت پر گفتگو کرتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ ولی کے ادبی کارناموں اور شعری اکتسابات کا اگر صحیح معنوں میں اندازہ لگانا ہو تو ہمیں ان کا مطالعہ ان سے پہلے کہ شعرا مثلاً حسن شوقی، قلی قطب شاہ، نصرتی وغیرہ کی شاعری کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔''(۱۱)

ولی کے شعری سرمائے میں دو نمائندہ اسالیب کے امتزاج سے ایک تیسرے اسلوب کی تعمیر صاف دکھائی دیتی ہے سبک ہندی کی فارسی روایت اور دکنی کی اردو روایت کو ولی نے اس طرح ممزوج کیا اور اس پر اورنگ آبادی آہنگ کو اس طرح غالب کیا کہ اظہار کی تیسری جہت پیدا ہو گئی۔ ایسا نہیں ہے کہ ولی سے پہلے فارسی اور اردو کے درمیان امتزاج پیدا کرنے اور فارسی لفظیات کو برتنے کا اہتمام نہ ہوا ہو؛ ایسا زمانے سے ہوتا رہا تھا۔ لیکن ایک اثر آفریں صوتی آہنگ کی دریافت ایک معنی آفریں طرز اظہار ہمیں ولی کے ہاں پائے تکمیل کو پہنچتا ہوا نظر آتا ہے اور اسی سے ولی کے نمائندہ اسلوب کی شکل و صورت نکھر کر سامنے آتی ہے جو انھیں شمال میں زبان و شاعری کی نئی روش کا مؤسس اور مخترع بناتی ہے:

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے
نین جامی، جبیں فردوسی وابرو ہلالی ہے
نکوہ میں فیضی و قدسی، سرشت طالب و شیدا
کمال بدر، دل اہلی و انکھیاں سوں جمالی ہے
تو ہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب و شوکت
ترے ابرو یہ مجھ بے دل کو طغرائے وصالی ہے

یہاں لفظی رعایت معنی کی مناسبت اور تاریخی و علمی اشخاص سے ربط کی صورت جس کمال فن کاری سے پیدا کی گئی ہے وہ ولی کی فنی دستگاہ کی شہادت دیتی ہیں۔

ولی نے زبان کو برتنے اور اسے نیا رنگ وآہنگ عطا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ولی ہی نے پہلے پہل ایسی ترکیبوں کو بکثرت اپنی شاعری میں رواج دیا جو آگے جا کر اردو غزل کا عام طور قرار پائی کیا میر اور کیا سودا اور ان سے پہلے کے اساتذہ سب نے اس طرز سخن کو اپنانے اور اورنگ آبادی طرز سخن کو اپنا لہجہ بنانے میں کامیابی پائی۔ ولی نے اردو غزل کے محاورے اور لسانی مزاج کو روانی و سلاست بہم کرنے کے لیے اپنی اختراعی قوت اور ایجادی طبیعت سے ایسے طریقہ ہائے اظہار نکالے کہ وہ ترکیبیں وضع کرنے، مرکبات ڈھالنے اور الفاظ و محاوروں کا رواں طور غزل میں پیوست کرنے کے لیے سند بن گئے۔ سحر پرداز، ہوش دشمن، آتش خاموش، گوشۂ داماں، مروت آشنا، دردریائے خوبی، گوہر کان حیا، یوسف کنعان دل، حصار خاموشی، موج آب وفا، حصار خاموشی، مصرع زنجیر جنوں جیسے مرکبات ہمیں ولی یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں یہ نہ صرف ولی کے اچھوتے اور شفاف اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں بلکہ معنی آفرینی، مضمون بندی کے اسالیب کو وضع کرنے اور رواج میں لانے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ولی نے دکنی روایت سے اس قدر زمانی و مکانی قربت کے باوجود اپنا نادر اسلوب وضع کرنے اور صاف و شفاف لہجہ پانے میں کامیابی حاصل کی کہ تعجب ہوتا ہے کہ وہ انھوں نے تو انا روایت کی حصار سے نکل کر اپنی نئی آواز پیدا کرنے میں کیوں کر کامیابی حاصل کی۔ ظاہر ہے اس کا پورا کریڈٹ ولی کی طباعی اور اختراعی صلاحیت کے ساتھ اس کی طبع وقاد کو جاتا ہے جس نے اس طرح کے اچھوتے اور نادر شعر اس زمانے میں خلق کیے۔ آج ایسے اشعار کو پڑھئے تو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کلاسیکی غزل کا نقطۂ آغاز ہیں بلکہ یہ نقطۂ عروج کے شعر لگتے ہیں :

مسند گل منزل شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

سیاہی خط شب ناز سوں مصور ناز
لکھا نگار کے لب نگار خاموشی

ہند آریائی روایت نے جس ادبی معاشرے اور کلچر کی تشکیل کی اور زبان واسلوب کی سطح پر ملکی زبان میں جس طرح ظہور پایا کہ زبان اپنی علاقائی نسبتوں، شناختوں، وضعی رشتوں سے نکل ایک ملک گیر لہجہ واسلوب پانے میں کامیاب ہوئی۔ اسلوب کی اس ترقی، تنقیح و تہذیب میں ولی کا مرتبہ واقعی بابائے آدم کا ہے۔ ولی نے اسلوب کی ایسی وضع کو کامیاب بنا کر مقبول خاص وعام کیا جسے ہم ہند آریائی اسلوب کے نقطۂ ارتقا کا حرف اول کہہ سکتے ہیں۔ ولی نے ایک طرف ہندستانی اساطیر، اشخاص، کرداروں، مقامات، دریاؤں، پرندوں، موسموں اور پھولوں وغیرہ کو کمال فن کاری سے برتا۔ دوسری طرف اس نے فارسی غزل کی حسن اور صنفی خصائص کو مقامیانے اور اردو غزل کو فارسی غزل کے ہم پلہ بنانے کا کارنامہ انجام دیا۔

زلف تیری ہے موج جمنا کی
پاس تل اس کے جوں سنیاسی ہے

اب دیکھیے کہ اس نے تشبیہ سے ایک خیالی پیکر کو حسی پیکر میں کس خوش اسلوبی سے بدل دیا ہے۔ یہاں تشبیہ و تعلیل کا عمل ایک ساتھ انجام پایا ہے۔ مصرعہ ایسا کہ ایک تصور ہے تو دوسری تصویر ہے اور ایک دوسرے میں ایسے ممزوج ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا حسن نہیں کھلتا۔ زلف کے مقابل تل کی ماہیت کو کیفیت میں بدلنے کا کیا ہی خوب کام کیا ہے کہ دریا کے کے پاس سنیاسی کو آسن جمائے دکھایا ہے اور دورد کھائے دینے والے دھارے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک بہتے جاتے ہیں۔ سنیاسی ساکن اور دریا لہریں اٹھاتے رواں ہے۔ تل ساکت ہے اور زلف لہراتی جاتی ہے یا پھر دریا خاموشی سے بہتا ہے اور زلف سکون سے شانے چوم رہی اور تل مبہوت ہو کر اسے دیکھے جاتا ہے۔ دوسرا شعر:

تیری زلفاں کی حلقے میں دسے یوں نقش رخ
کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دیوالی میں

یہاں ایک مادی پیکر سے دوسرے بدنی پیکر کا تقابل کر کے کس خوش اسلوبی سے محبوب کے حسن کی داد دی ہے۔ دیے رات ہی کو روشن ہوتے ہیں اور زلف کی سیاہی کو اس رات سے جو نسبت وہ بالکل عیاں ہے۔ اسی طرح چہرے کی تابناکی اور دیے کی چمک اور روشنی کا تعلق بھی بالکل واضح ہے۔

ولی کے یہاں نئی شعری روایت کا ظہور اگرچہ ہر جگہ عیاں وبیاں ہے لیکن وہ اپنی سابقہ روایت سے بھی کسب فیض کرتا ہے۔ نئی روایت میں پرانی روایت کو مدغم کرنے کا عمل حد درجہ فنکارانہ وصناعانہ ہے۔ وہ فارسی اور ہندی لفظیات کے مابین ایسی خوش آہنگی کو قائم کرنے میں کامیاب ہے جس سے ثقالت کا امکان بھی جاتا رہتا ہے۔ کیفیت کو بیان کرنے اور حسن کے لیے استعارہ و تشبیہ تلاش کرنے میں ولی کی جدت طبع جس سبک آہنگ کو سامنے لاتی ہے؛ وہ سبک آہنگ اس فراوانی سے ان کے پیش روؤں کے یہاں ہمیں نہیں ملتا۔

ایک اور پہلو قابل غور ہے وہ یہ ہے دکنی غزل کی روایت جو کہ ایک ثانوی صنف کی حیثیت سے اس عہد میں موجود رہی جسے ولی نے غالب صنف سخن کے رتبے پر فائز کیا اس روایت میں بھی ہم ہند فارسی لسانی روایت کے امتزاج کی یہ صورت دیکھتے ہیں۔ یہ صورت ہمیں قلی قطب شاہ سے لے کر غواصی، نصرتی، حسن وغیرہ تک کے یہاں مل جاتی ہے۔ یہ دکنی کے مستند اساتذہ ہیں اور شاعری کا فارسی سے آزاد دکنی رنگ میں بھی ان کی شاعری نے گراں قدر سرمایہ بہم کیا ہے۔ ولی شاعری کے اس پہلو سے مستفید ہوتے وقت دونوں روایتوں کے ادغام کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ نصرتی کے چند شعر ہیں جو ہندستانی الاصل تصور زبان پر استوار کیے گئے:

چند ربدن کہیاں تو موں سنبھال بول
سورج مکھی کہیا تو کہی یوں نہ گھال بول
دونوں بھی تجھ نکلوں تو سکے تج کو کیا کہنا
کہی اس بہشت حسن کو جسم جگ اوجال بول

یہ دونوں ہی شعر ایک مخصوص لسانی مزاج اور مذاق شعر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ولی نے اس طرز میں بہت زیادہ کلام نہیں کہا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس نوع کا کلام ولی کے یہاں بالکل عنقا ہو لیکن ولی کے اس نوع اشعار میں جو بات واضح طور پر دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ولی یہاں بھی زبان کی سہولت وروانی کو پانے اور سبک اسلوب کو نبھانے میں کامیاب ہیں:

پرت کنٹھا جو پہنے اسے گھر بار کرناں کیا
ہوئی جوگن جو کئی پی کی اسے سنسار کرناں کیا
جو پیونے نیر نیناں کا اسے کیا کام پانی سوں
جو بھوجن دکھ کا کرتی ہے اسے ادھار کرناں کیا
نئیں کُئی دھرم دھاری جو کہے پیتم سوں سمجھا کر
کہ دکھیا کوں بجھو ہی سوں اتا بیزار کرناں کیا

یہ تینوں شعر لفظیات میں دکنی مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہاں تصور عشق بھی وہی ہے یعنی عورت عاشق ہے اور محبوب مرد ہے۔ ان اشعار میں ہم میرابائی کا رنگ بھی دیکھ سکتے ہیں یعنی یہ اشعار نسائی لہجے میں عرفان حق اور ترک دنیا پر بھی منطبق کیے جا سکتے ہیں۔ ولی بالعموم دکنی رنگ سخن کا مکمل تتبع نہیں کرتے بلکہ اس سے آزادانہ معاملہ کرتے ہیں یعنی پورے شعر کی ترکیب میں مخصوص لفظی ترتیب کا اہتمام نہیں کرتے کہ کوئی فارسی لفظ آنے نہ پائے بلکہ وہ زبانوں کا امتزاج پیدا کرتے اور ان کے درمیان ایک صوتی آہنگ پیدا کرتے ہیں جس سے لہجہ سبک اور قرأت بالکل رواں ہو جاتی ہے۔

دیکھے سوں تج لباں کے اپر رنگ پان آج
چوناں ہوئے ہیں لالہ رخاں کے پر ان آج

لباں، رنگ، لالہ رخاں، پان، چونا اور پر ان دیکھیے یہاں کس طرح ایک رواں اور خوش آہنگ امتزاجی اسلوب تعمیر کیا گیا کہ کہیں زبان اکھڑتی نہیں اور معنی یابی کا عمل بھی دو آتشہ ہو کر سامنے آتا ہے۔ چونا اگر پان میں زیادہ ہو جائے تو وہ زبان پر زخم ڈال سکتا ہے۔ محبوب کا حسن ہمیشہ سے جان لیوا اور قاتل خیال کیا گیا ہے لیکن یہ اوصاف اپنے ظاہری معنی میں اگرچہ منفی ہیں

لیکن یہ حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ جانے، ہوش کے غائب ہوجانے کو بیان کرتے ہیں اور فریفتگی کی صورت ہے تو اس سے کیفیت کی جو شکلیں پیدا ہوتی ہیں اس میں سے ایک کیفیت جی کے کٹنے کی ہے۔ لالہ رخاں کے پران کہہ کے حسینوں کے درمیان اپنے محبوب کے زیادہ قابل توجہ اور دلکش ہونے کی بات کو داخل مضمون کر دیا ہے۔

ولی کی شاعری کو اسلوبیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے اور پڑھنے کی خاطر خواہ کوشش اردو تنقید میں نہیں ملتی۔ لسانیاتی ارتقا، اسلوبیاتی توسیع اور زبانوں کے امتزاج و صوتی تناسب کی حصولیابی کے لحاظ سے ولی کا اسلوبیاتی مطالعہ حد درجہ کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس طرز مطالعہ سے ولی شعری جہتیں واضح ہو کر سامنے آسکتی ہیں۔

ولی کا عروضی نظام:

ولی کے عروضی مطالعہ میں ولی کی غزلیات کو شامل کیا ہے ۔ نور الحسن ہاشمی کے مرتب کردہ کلیات ولی میں ولی کی کل ۴۰۴ غزلیں ہیں ۔ ان کے علاوہ ۸۲ فردیات، ۲۶ رباعیاں، ۹ مخمسات، ۳ مستزاد، ۲ ترجیع بند، شاہ وجیہ الدین کی مدح ترجیع بند کی ہیئت میں کی ہے ۔ ۶ قصائد، قصائد کے عنوانات یہ ہیں ۔

(۱) در حمد و نعت و منقبت و موعظت (۲) در نعت خیر البشر (۳) در منقبت حضرت مولیٰ علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ (۴) در مدح بیت الحرام (۵) در مدح حضرت میراں محی الدین قدس سرہ (۶) در مدح حضرت شاہ وجیہ الدین نور اللہ مرقدہ ۔

۲ مثنویاں ہیں ۔ ایک شہر سورت کی تعریف میں ہے ۔ ان کے علاوہ ۵۰ پچاس غزلیں نور الحسن ہاشمی نے ضمیمہ میں رکھی ہیں ۔ ضمیمہ میں یہ غزلیں اس لئے رکھی گئیں ہیں کہ محمد شاہی عہد کے دیوان ولی میں یہ غزلیں شامل نہیں ہیں ۔ اس وجہ سے برائے تحقیق ان کو ضمیمہ میں شامل کیا گیا کہ بعد کی تحقیق سے اگر یہ ولی کی غزلیں حتمی طور پر محقق ہو جاتی ہیں تو باقی غزلوں کے ساتھ اصل کلیات میں جگہ دی جائے گی ۔ یہ ضمیمہ برائے احتیاط وضع کیا گیا ہے ۔

یہاں ولی کی ۴۰۴ غزلوں کا ہی عروضی مطالعہ کیا گیا ہے ۔ ولی کے علم عروض سے آگاہی پر محمد حسین آزاد نے کلام کیا ہے کہ ولی کو علم عروض سے خاطر خواہ آگاہی نہ تھی ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ولی کی غزلوں میں عروضی خامی تو دور ان کی غزلیں بے حد مترنم اور رواں ہیں ۔ روانی شعر کا حسن ہے ۔ عروضی پیمانہ پر پورا اترنے کے باوجود شعرا کی غزلیں رواں ہوں ضروری نہیں ۔ گرچہ روانی کے لئے ہی عروضی پیمانہ کو وضع کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود کہ شعر عروضی لحاظ سے مکمل ہو، اپنے اندر روانی بھی رکھتا ہو ضروری نہیں ۔ ولی کی بیشتر غزلیں انتہائی رواں ہیں ۔

ولی کے شعری آہنگ کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''ولی کی ایک اور خصوصیت ان کا وہ مخصوص راگ اور لے ہے جس سے اردو شاعری پہلی بار بھرپور طریقے سے آشنا ہوئی ۔ اور یہ راگ اور لے خود اردو شاعری سے مخصوص ہو گئے ۔ اس راگ کو مسلسل غزلوں میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ شعروں کا مجموعی راگ ایک ہی احساس کے پھیلاؤ سے ہم آہنگ ہو کر سروں کو بیدار

کرتا ہے اور راگ کا نرم خرام دریا بہنے لگتا ہے۔ لمبی بحروں کی غزلوں میں یہ راگ پھیل گیا ہے اور اس میں ایک آہستہ روی پیدا ہو گئی ہے، لیکن چھوٹی بحروں می غزلوں میں یہ راگ اپنی تیزی سے اثر کو گہرا کر دیتا ہے ۔ولی کی لے ،اس کے ترنم اور لہجے سے اردو شاعری کا مخصوص ترنم اور لہجہ قائم ہوتا ہے۔ اردو شاعری کے قدرتی راگ (ردھم،اس لفظ کو انگریزی میں لکھنا ہے)کو دریافت کرنے میں بھی اولیت کا سہرا ولی ہی کے سر بندھتا ہے۔" (۱۲)

ولی کے شعری آہنگ کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ فائز کی کل بتیس غزلوں میں سے ۱۹ غزلیں ولی کی زمینوں پر کہی گئی ہیں۔ شاہ حاتم کے یہاں بھی متعدد غزلیں ملتی ہیں جو ولیکی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ فائز کی ان غزلوں کی نشاندھی جو ولی کی زمینوں میں کہی گئی ہیں مسعود حسین رضوی ادیب نے اپنی مرتب کردہ کتاب "شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر فائز دہلوی اور اس کا دیوان "میں کردی ہے۔ ولی کی زمین میں کہی گئی غالب کی بھی ایک غزل ملتی ہے ۔غالب کی مشہور زمانہ غزل:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ولی کی زمین میں ہے۔ ولی کی غزل دیکھیں:

اگر باہر اپس کے گھر سوں موہن یک قدم نکلے
تماشا دیکھنے اس کا ہر ایک سینے سوں غم نکلے

حاتم نے ولی زمیں میں جو غزلیں کہی ہیں ان کے مطلعے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

جس کے دل میں ترا خیال ہوا اس کو جینا یہاں محال ہوا (حاتم)

جلوہ گر جب سوں وہ جمال ہوا
نور خورشید پائمال ہوا (ولی)

تاباں ہے اس جبیں سے مرے دل میں نور آج
جس نور سے ہر یک ہوا کوہ طور آج (حاتم)

جو لاں گری میں گرم ہے وہ شہسوار آج
سینے سوں عاشقاں کے اٹھے ہے غبار آج (ولی)

جب چمن سوں چلا وہ سرو بلند
ہر قدم سرو کو کیا پابند (حاتم)

جب سوں ہوا ترا یو قد دلربا بلند
سنتا ہوں ہر طرف سوں صدائے بلا بلند (ولی)

آتا ہے جب سوار ہوا وہ کٹار بند
عاشق کے سر کو اس کا تکے ہے شکار بند (حاتم)

تجھ بدن پہ جگ کے ہوئے گل عذرا بند
گلشن میں تجھ بہار کے ہے نوبہار بند (ولی)

جو چمن میں جا کے میں قامت کا تجھ چرچا کروں
کیا عجب گر قیامت سرو پر برپا کروں (حاتم)

خوبیٔ اعجاز حسن یار گر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں (ولی)

کاملوں کا یہ سخن مدت سے مجھ کو یاد ہے
یعنی بے شوق جینا زندگی دشوار ہے (حاتم)

ہے بجا عشاق کی خاطر اگر ناشاد
غمزۂ خوں خوار ظالم بر سر بے داد ہے (ولی)

جس کو تیرا خیال ہوتا ہے
اس کو جینا محال ہوتا ہے (حاتم)

مغز اس کا سوباس ہوتا ہے
گل بدن کے جو پاس ہوتا ہے (ولی)

اس پری رو کا مجھے ہر دم تصور کام ہے

جس تصور سے دل بے صبر کو آرام ہے (حاتم)

نشہ بخش عاشقاں وو ساقیٔ گل فام ہے

جس کی انکھیاں کا تصور بے خودی کا جام ہے (ولی)

الفت کی مجھ کو پیارے تیری نگاہ بس ہے

گر پے بہ پے نہ ہووے تو گاہ گاہ بس ہے (حاتم)

ہم کوں شفیع محشر وو دیں پناہ بس ہے

شرمندگی ہمارا عذر گناہ بس ہے (ولی)

مست دل ہے مدام تجھ لب کا

جام صہبا ہے نام تجھ لب کا (آبرو)

روح بخشی ہے کام تجھ لب کا

دم عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا (ولی)

جو کہ محرم ہے عشق بازی کا

دل سے عاشق ہے جاں گدازی کا (آبرو)

شغل بہتر ہے عشق بازی کا

کیا حقیقی و کیا مجازی کا (ولی)

منھ دھوتے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب

کھاوے گا آفتابہ کوئی خود سر آفتاب (میر)

کیا ہو سکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب

تجھ حسن کی اگن کا ہے یک اخگر آفتاب (ولی)

سرکتی جائے ہے رخ سے نقاب آہستہ آہستہ

نکلتا آرہا ہے آفتاب آہستہ آہستہ (امیر مینائی)

کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ

کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ (ولی)

ولی کے کلام کو عروضی اصولوں پر پرکھنے سے پہلے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ عروض میں مکتوبی کے بجائے ملفوظی حروف کا اعتبار کیا جاتا ہے۔اس اصول کو ذہن میں رکھیں اور یہ بات بھی سمجھ لیں کہ ولی کا لہجہ علاقائی لہجہ تھا۔اردو کا وہ لہجہ جو آج ہم اور آپ بولتے ہیں وہ اورنگ آبادی لہجہ نہ تھا۔اسی سبب کچھ الفاظ جیسے لکھے جاتے تھے اسی آہنگ میں پڑھے نہیں جاتے تھے۔مثلاً پڑھیا، کھلیا،پڑیا،دنیا،نئیں،وغیرہ اور اس قسم کے کئی الفاظ۔دنیا لفظ کی مثال کے لئے اوپر مذکور مثالیہ کے ذیل میں درج شعر کو دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں لفظ "دنیا" چہار حرفی کے بجائے سہ حرفی استعمال کیا گیا ہے۔مثال:

چاروں طرف کھلیا ہے گلزار رنگ درس کا
اس سیر جاں فزا سوں سینہ کھلیا ہوس کا
مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

کھلیا میں ی ملفوظی نہیں شمار کی جائے گی۔یہ لفظ کھلا بروزن فعل کے شمار کیا جائے گا۔آخر میں رنگ درس کا میں ولی نے گ ،گرادی ہے۔تقطیع میں گ کو شمار نہیں کیا جائے گا۔

دوسری صورت ولی کے یہاں یہ ہے کہ کچھ الفاظ ولی کے عہد میں جس طرح عوام میں مستعمل تھے اسی صورت استعمال میں آگئے ہیں۔مثلاً کفر کو ف پر زبر کے ساتھ استعمال کیا ہے۔غرض کی ر کو ساکن،اوّل کو بروزن فعَل، قفل کو قفَل فعل کے وزن پر ،امید کو اِمید بروزن فعول، شمع کو م مشدد،ساکن اور مفتوح تین صورتوں میں استعمال کیا ہے۔

سجن اول کے زمانے میں یوں نہ تھا گستاخ
اسی دنوں میں ہوا ہے یو کیا بلا گستاخ
قسمت تری ہے حق پہ نہ ہونا امید یہاں
نئیں اس قفل کوں غیر توکل کلید یہاں

اس قسم کی اور بھی مثالیں ولی کے یہاں نظر آئیں گی۔یہ صورتیں ولی کی علم عروض میں دسترس نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتیں ۔الفاظ کے استعمال کی صورت اس اورنگ آبادی لہجہ کی بنا پر ہے جو ولی کے عہد میں رائج تھا۔ہمیں ولی کی شاعری کو اسی لہجہ میں پڑھنا ہوگا جس لہجہ میں ولی نے شعر کہے ہیں۔اسے ولی کی علم عروض میں کم علمی نہیں تصور کرنا چاہئے۔

ولی کی غزلوں سے کچھ اشعار کے بحور و اوزان یہاں نمونے کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔ غزلوں کے مطلع کا وزن اور کیفیت یہاں لکھی گئی ہے، تاکہ پوری غزل کے وزن اور کیفیت کا اندازہ ہو جائے۔

غزل نمبر ۱۔

کیتا ہوں ترے نانوں کو میں ورد زباں کا　　کیتا ہوں ترے شکر کو عنوان بیاں کا

بحر: ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف　وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۲۔

وو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ　　آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

بحر: رمل مثمن مخبون محذوف/مسکن　وزن: فاعلاتن فاعلاتن فعلاتن فعِلن

غزل نمبر ۳۔

اے گل عذار غنچہ دہن ٹک چمن میں آ　　گل سر پہ رکھ کے شمع نمن انجمن میں آ

بحر: مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن

غزل نمبر ۴۔

وو نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا　　خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا

بحر: مضارع مثمن اخرب　وزن: مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

غزل نمبر ۵۔

کتاب الحسن کا یہ مکھ صفا تیرا صفا دستا　　ترے ابرو کے دو مصرع سوں اس کا ابتدا دستا

بحر: ہزج مثمن سالم وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۶۔

تو آج ہے سینہ شاد دستا　　مطلب ہے کہ بامراد دستا

بحر: ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف وزن: مفعول مفاع لن فعولن

غزل نمبر ۷۔

یو تل تجھ مجھ کے کعبہ میں مجھے اسود حجر دستا　　ز نخداں میں ترے مجھ چاہ زمزم کا اثر دستا

بحر: ہزج مثمن سالم وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل ۸۔

طاق ابرو ترا حرم دستا　　محرم اس کا عرب عجم دستا

بحر: خفیف مسدس مخبون محذوف / مخبون مسکن ؟ وزن: فاعلاتن مفاعلن فعلن

غزل نمبر ۹۔

مت آتش غفلت سوں مرے دل کوں جلاجا　　مشتاق درس کا ہوں ٹک یک درس دکھاجا

بحر: ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۱۰۔

تن پیس سرمہ کر کے بسا تجھ نین میں جا　　ہو بوے گل بسا ہوں ترے پیرہن میں جا

بحر: مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن

غزل نمبر ۱۱۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا　　ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھاتی جا

بحر:ہزج مثمن اخرب وزن:مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

غزل نمبر ۱۲۔

دل ربا آیا نظر میں آج میری خوش ادا　　خوش ادا ایسا نہیں دیکھا ہوں دو جا دلربا

بحر:رمل مثمن محذوف وزن:فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۱۳۔

غضب سوں چہرہ رنگیں بہار ناز ادا　　بہار حسن میں ہے لالہ زار ناز و ادا

بحر:ہزج مثمن محذوفوزن:مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن فعولن

غزل نمبر ۱۴۔

دل کوں لگتی ہے دل ربا کی ادا　　جی میں بستی ہے خوش ادا کی ادا

بحر:خفیف مخبون محذوف مخبونوزن:فاعلاتن مفاعلن فعلن

غزل نمبر ۱۵۔

ہوش کھوتی ہے نازنیں کی ادا　　سحر ہے سرو گل جبیں کی ادا

بحر:خفیف مسدس محذوف مخبونوزن:فاعلاتن مفاعلن فعلن

غزل نمبر ۱۶۔

ترے فراق میں دل کوں کیا ہوں بند جدا　　کیا ہوں خال اپر جی کو جیوں سپند جدا

بحر:مجتث مثمن مخبون مخبون محذوف مسکن　　وزن:مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلن

غزل نمبر ۱۷۔

ہے فیض سوں جہاں کے دل بافراغ میرا　　مرہم سوں نئیں ہوا ہے محتاج داغ میرا

بحر:مضارع مثمن اخرب وزن:مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

غزل نمبر ۱۸۔

ہوا ہے سیر سوں مشتاق بے تابی سوں من میرا　　چمن میں آج آیا ہے مگر گل پیرہن میرا

بحر:ہزج مثمن سالم وزن:مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۱۹۔

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا　　نئیں دیکھتا سرج کی جھلکار کا تماشا

بحر:مضارع مثمن اخرب وزن:مفعول فاع لاتن مفعول فاعلاتن

غزل نمبر ۲۰۔

موسی اگر جو دیکھے تجھ نور کا تماشا　　اس کوں پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

بحر:مضارع مثمن اخرب وزن:مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

غزل نمبر ۲۱۔

بے تاب آفتاب ہے تجھ مکھ کی تاب کا　　پیاسا ہے اس جہاں میں ترے لب کے آب کا

بحر:مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوفوزن:مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن

غزل نمبر ۲۲۔

روح بخشی ہے کام تجھ لب کا　　دم عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا

بحر:خفیف مسدس محذوف مخبونوزن:فاعلاتن مفاع لن فعلن

غزل نمبر ۲۳۔

مجھ گھٹ میں اے نگھر گھٹ ہے شوق تجھ گھونگھٹ کا　　دیکھے سوں لٹ گیا دل تیری زلف کا لٹکا

بحر: مضارع مثمن اخر بوزن: مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

غزل نمبر ۲۴۔

نہیں شوق اس کے دل میں کدھیں لالہ زار کا　　مشتاق ہے جو پیو کے رخ آب دار کا

بحر: مضارع مثمن اخرب مکفوف محذو فوزن: مفعول فاع لات مفا عیل فاع لن

غزل نمبر ۲۵۔

جگ منیں دوجا نئیں ہے خوب رو تجھ سار کا　　چاند کوں ہے آسماں پر رشک تجھ رخسار کا

بحر: رمل مثمن محذوف وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۲۶۔

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا　　ہے مطالعہ مطلع انوار کا

بحر: رمل مسدس محذوف وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۲۷۔

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا　　ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا

بحر: ایضا وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۲۸۔

گر میری طرف ہوے گزر اس شوخ پسر کا　　سب راہ کروں فرش اپس نور نظر کا

بحر:ہزج مثمن اخرب مکفوف مکفوف محذوف وزن:مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۲۹۔

زخمی ہے جلاد فلک تجھ غمزۂ خوں ریز کا ہے شور دریا میں سدا تجھ زلف عنبر بیز کا

بحر:رجز مثمن سالم وزن: مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

غزل نمبر ۳۰۔

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا بغیر از دیدۂ حیراں نئیں جگ میں نقاب اس کا

بحر:ہزج مثمن سالموزن:مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۳۱۔

سناوے مجکوں گر کئی مہربانی سوں سلام اس کا کہاؤں آخر دم لگ بہ جاں منت غلام اس کا

بحر:ایضا

غزل نمبر ۳۲۔

چاروں طرف کھلیا ہے گلزار رنگ درس کا اس سیر جاں فزا سوں سینہ کھلیا ہوس کا

بحر:مضارع مثمن اخرب وزن:مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

غزل نمبر ۳۳۔

گزر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا ہوا دھاوا مٹھائی پر مگس کا

بحر:ہزج مسدس محذوفوزن:مفاعیلن مفاعیلن فعولن

غزل نمبر ۳۴۔

تری زلفاں کا ہر تار سیہ ہے کال عاشق کا ہوا ہے اس کے جلوے سوں پریشاں حال عاشق کا

بحر:ہزج مثمن سالم وزن:مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۳۵۔

مجھ درد پہ دوانہ کرو تم حکیم کا بن وصل نئیں علاج برہ کے سقیم کا

بحر:مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف وزن:مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن

غزل نمبر ۳۶۔

دل کو گر مرتبہ ہو درپن کا مفت ہے دیکھنا سری جن کا

بحر:خفیف مسدس مخبون محذوف مخبون وزن:فاعلاتن مفاع لن فعلن

غزل نمبر ۳۷۔

ہر طرف ہے جگ میں روشن نام شمس الدین کا چین میں ہے شور جس کے ابروے پر چین کا

بحر:رمل مثمن محذوف وزن:فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۳۸۔

بدخشاں میں پڑیا ہے شور تیرے لعل رنگیں کا ہوا ہے چین میں شہرہ تری اس زلف پرچیں کا

بحر:ہزج مثمن سالم وزن:مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۳۹۔

ہوا ہے دل مرا مشتاق تجھ چشم شرابی کا خراباتی اپر آیا ہے شاید دن خرابی کا

بحر،وزن:ایضا

غزل نمبر ۴۰۔

نئیں کئی تا سنے احوال میری دل فگاری کا　　کہوں کس کن گریباں چاک کر دکھ بے قراری کا

بحر،وزن:ایضا

غزل نمبر ۴۱۔

طالب نئیں مہر و مشتری کا　　دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا

بحر:ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف وزن:مفعول مفاعلن فعولن

غزل نمبر ۴۲۔

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　کیا حقیقی و کیا مجازی کا

بحر:خفیف مسدس مخبون محذوف مخبون وزن:فاعلاتن مفاعلن فعلن

غزل نمبر ۴۳۔

یکایک مجھ دسا یک شہ جواں آسوار تازی کا　　کہ جن نے حق سوں پایا ہے خطاب عاشق نوازی کا

بحر:ہزج مثمن سالم وزن:مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۴۴۔

پڑیا ہے لعل میں پر تو سجن تجھ لب کی لالی کا　　بیاں ہے مہ سوں روشن تر تری صاحب کمالی کا

بحر،وزن:ایضا

غزل نمبر ۴۵۔

کیا ہوں جب سوں دعویٰ شاہ خوباں کی غلامی کا　　علم برپا ہوا ہے تب سوں میری نیک نامی کا

بحر،وزن:ایضا

غزل نمبر ۴۶۔

عبث غافل ہوا ہے گا فکر کر پیو کے پانے کا　　صفا کر آرسی دل کی سکندر ہو زمانے کا

بحر،وزن:ایضا

غزل نمبر ۴۷۔

کیا یک بات میں واقف مجھے راز نہانی کا　　لکھوں غنچے اپر حرف اس دہن کی نکتہ دانی کا

بحر،وزن:ایضا

غزل نمبر ۴۸۔

لیا ہے جب سوں موہن نے طریقہ خود نمائی کا　　چڑھیاں ہے آرسی پر تب سوں رنگ حیرت فزائی کا

بحر،وزن:ایضا

غزل نمبر ۴۹۔

جس وقت اے سری جن تو بے حجاب ہوے گا　　ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جیوں آفتاب ہوے گا

بحر:مضارع مثمن اخرب وزن:مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

غزل نمبر ۵۰۔

اس قد سوں جس چمن میں وو نو نہال ہو گا　　کیا سرو کیا صنوبر ہر یک نہال ہو گا

بحر،وزن:ایضا

غزل نمبر ۵۱۔

تجھ غمزۂ خوں ریز سوں لڑکون سکے گا　　تجھ ناز ستم گر سوں جھگڑکون سکے گا

بحر:ہزج اخرب مکفوف محذوفوزن:مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۵۲۔

تجھ نین کے شسوار سوں لڑکون سکے گا　　بن نیند اس انکھیاں کوں پکڑکون سکے گا

بحر،وزن:ایضا

غزل نمبر ۵۳۔

زرد رو ہے جو کیا ہے فکر تسخیر طلا　　مت ہوا ے وحشی صفت زنہار نخچیر طلا

بحر:رمل مثمن محذوف　وزن:فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۵۴۔

پی کے ہوتے نہ کروں توں مہ کی ثنا　　معتبر نئیں ہے حسن دور نما

بحر:خفیف مسدس مخبون محذوف مخبون وزن:فاعلاتن مفاع لن فعِلن

غزل نمبر ۵۵۔

تیرے شکر لب کوں اب مثل عسل بولنا　　بلکہ عسل ہے یو اصل اس کوں نقل بولنا

بحر:رجز مثمن مطوی مرفوع امذال　　وزن: مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

دوسرے مصرعہ کا دوسرا رکن فاعلان وزن پر ہے۔

غزل نمبر ۵۶۔

تجھ حسن عالم تاب کا جو عاشق شیدا ہوا　　ہر خوبرو کے حسن کے جلوے سوں بے پروا ہوا

بحر: رجز مثمن سالم وزن: مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

غزل نمبر ۵۷۔

تجھ برہ کی آتش منیں دل جل کے انگارا ہوا اس کے اوپر جلنے کوں جیو جیوں عنبر سارا ہوا

بحر، وزن: ایضا

غزل نمبر ۵۸۔

تجھ مکھ کا یو تل دیکھ کر لالے کا دل کالا ہوا تجھ دور خط سوں طوق جیوں مہتاب پر ہالہ ہوا

بحر، وزن: ایضا

غزل نمبر ۵۹۔

جب صنم کوں خیال باغ ہوا طالب نشۂ فراغ ہوا

بحر: خفیف مخبون محذوف مخبون وزن: فاعلاتن مفاع لن فعِلن

غزل نمبر ۶۰۔

جلوہ گر جب سوں وو جمال ہوا نور خورشید پائمال ہوا

بحر، وزن: ایضا

غزل نمبر ۶۱۔

جب تجھ عرق کے وصف میں جاری قلم ہوا عالم میں اس کا ناؤں جواہر رقم ہوا

بحر: مضارع مثمن اخرب مکفوف محذو فوزن: مفعول فاع لات مفا عیل فاع لن

غزل نمبر ۶۲۔

تصویر تیری دیکھ کر سراجگت حیراں ہوا　　تجھ زلف کے کوچے منیں دل جاکے سر گرداں ہوا

بحر: رجز مثمن سالم وزن: مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

غزل نمبر ۶۳۔

عشق سوں تیرے صنم جیو پہ طوفاں ہوا　　مسکن اشک نین ساحل داماں ہوا

بحر: بسیط مثمن مطوی وزن: مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

غزل نمبر ۶۴۔

وو مرا مقصود جان و تن ہوا　　جس کا مجھ کوں رات دن سمرن ہوا

بحر: رمل مسدس محذوف وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۶۵۔

ہرا نجھو تجھ غم میں اے رنگیں اداگل گوں ہوا　　غیرت گلزار جنت دامن پر خوں ہوا

بحر: رمل مثمن محذوف وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۶۶۔

تجھ لب مٹھے کو دیکھ پھکا انگبیں ہوا　　چیں بہ جبیں کو دیکھ خجل نقش چیں ہوا

بحر: مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن

غزل نمبر ۶۷۔

تخت جس بے خانماں کا دشت ویرانی ہوا　　سر اپر اس کے بگولا تاج سلطانی ہوا

بحر: رمل مثمن محذوف وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۶۸۔

پھر میری خبر لینے وو صیاد نہ آیا　　شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

بحر: ہزج مثمن اخرب مکفوف محذو فوزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۶۹۔

افسوس اے عزیزاں وو سیم بر نہ آیا　　مجھ درد کی خبر سن وو بے خبر نہ آیا

بحر: مضارع مثمن اخرب وزن: مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

غزل نمبر ۷۰۔

بے داد ہے بے داد ہے وو یار نہ آیا　　فریاد ہے فریاد کہ غم خوار نہ آیا

بحر: ہزج مثمن اخرب مکفوف محذو فوزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۷۱۔

صد حیف کہ وو یار مرے پاس نہ آیا　　میرا سخن راست اسے راس نہ آیا

بحر: ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۷۲۔

ترے بن مجکوں اے ساجن یو گھر اور بار کرناں کیا　　اگر تو نا اچھے مجھ کن تو یو سنسار کرناں کیا

بحر: ہزج مثمن سالم وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۷۳۔

پرت کی کنٹھا جو پہنے اسے گھر بار کرناں کیا　　ہوئی جو گن جو کئی پی کی اسے سنسار کرناں کیا

بحر،وزن:ایضا

غزل نمبر ۷۴۔

اہل گلشن پہ ترے قد نے جب امداد کیا　　او لا سرو غلامی ستی آزاد کیا

بحر:رمل مثمن مخبون محذوف مسکن وزن:فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

غزل نمبر ۷۵۔

مستی نے تجھ نین کی مجھ بے خبر کیا　　دل کوں مرے بھواں نے تری جیوں بھنور کیا

بحر:مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف وزن:مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن

غزل نمبر ۷۶۔

دل میں جب عشق نے تاثیر کیا　　فرد باطل خط تدبیر کیا

بحر:رمل مسدس مخبون مخبون محذوف　　وزن:فاعلاتن فعلاتن فعلن

غزل نمبر ۷۷۔

کشور دل کوں ترے ناز نے تسخیر کیا　　فوج مجنوں کوں تری زلف نے زنجیر کیا

بحر:رمل مثمن مخبون محذوف مسکن وزن:فاعلاتن فاعلاتن فعلاتن فعِلن

غزل نمبر ۷۸۔

خدا نے مکھ پہ ترے باب حسن باز کیا　　قد بلند کوں تیرے تمام ناز کیا

بحر مجتث مثمن مخبون مخبون محذوف　　وزن:مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلن

غزل نمبر ۷۹۔

صحن گلشن میں جب خرام کیا　　سرو آزاد کوں غلام کیا

بحر: خفیف مسدس مخبون محذوف وزن: فاعلاتن مفاع لن فعِلن

غزل نمبر ۸۰۔

تجھ زلف کے مشتاق کوں مشک عنبر سوں کام کیا　　طالب جو تیرے لب کے ہیں ان کو شکر سوں کام کیا

بحر رجز مثمن سالم وزن: مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

غزل نمبر ۸۱۔

ہے قد ترا سراپا معنی ناز گویا　　پوشیدہ دل میں میرے آتا ہے راز گویا

بحر مضارع مثمن اخرب وزن: مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن

غزل نمبر ۸۲۔

چشم دلبر میں خوش اداپایا　　عالم دل کوں مبتلاپایا

بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مسکن وزن: فاعلاتن مفاع لن فعلن

غزل نمبر ۸۳۔

ترے جلوے سوں اے ماہ جہاں تاب ہوا دل سر بسر دریاے سیماب

بحر ہزج مسدس مقصور مفاعیلن مفاعیلن فعولان

غزل نمبر ۸۴۔

کیوں ہو سکے جہاں میں ترا ہم سر آفتاب　تجھ حسن کی اگن کا ہے یک اخگر آفتاب

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۸۵۔

ترے مکھ پر اے نازنیں یو نقاب　　جھلکتا ہے جیوں مطلع آفتاب

بحر متقارب مثمن سالم مقصور وزن: فعولن فعولن فعولن فعول

غزل نمبر ۸۶۔

جب سوں وو نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب　　دل میں مرے خیال ہیں تب سوں عجب عجب

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف　وزن: مفعول فاع لات مفا عیل فاع لن

غزل نمبر ۸۷۔

ملیا وو گل بدن جس کوں اسے گلشن سے کیا مطلب　　جو پایا وصل یوسف اس کوں پیراہن سے کیا مطلب

بحر ہزج مثمن سالم　وزن: مفا عیلن مفا عیلن مفا عیلن مفا عیلن

غزل نمبر ۸۸۔

ہوا تجھ غم سوں جاری شوق کا طومار ہر جانب　　ہوا ہے گرم تیرے عشق کا بازار ہر جانب

بحر ہزج مثمن سالم　وزن: مفا عیلن مفا عیلن مفا عیلن مفا عیلن

غزل نمبر ۸۹۔

مدت کے بعد آج کیا جوں اداسوں بات　　کھلنے سوں اس لباں کے ہوا حل مشکلات

بحر: مضارع مثمن اخرب مکفوف مکفوف مقصور　وزن: مفعول فاع لات مفا عیل فاع لان

غزل نمبر ۹۰۔

سبز چیرے نے ترے اے سبز بخت　　زہر قاتل ہو کیا جیو لخت لخت

بحر رمل مسدس مقصور وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلان

غزل نمبر ۹۱۔

سجن ہے بسکہ تیرے حسن عالم گیر کی شہرت　　سکندر کوں ہوئی حاصل مثال آرسی حیرت

بحر ہزج مثمن سالم وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۹۲۔

سینے میں ہے تجھ ابروے پیوست کی نشت　　جیوں تیر دل میں ہے نگہ مست کی نشت

بحر: مضارع مثمن اخرب مکفوف مکفوف محذوف/مقصور　　وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لن/فاع لان

دوسرے مصرعہ کا آخری رکن فاع لان ہے اور پہلے مصرعہ کا آخری رکن فاع لن۔

غزل نمبر ۹۳۔

زبان حال سوں کہتا ہے یوں شمشاد ہر ساعت　　پڑیں گے قید میں اس قد کوں دیکھ آزاد ہر ساعت

بحر ہزج مثمن سالم وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۹۴۔

لب ترے پر کہ روح کا ہے قوت　　کاتب ناز نے لکھا ہے سکوت

بحر خفیف مسدس مخبون مخبون مقصور مسکن　　وزن: فاعلاتن مفاع لن فعلان

اس میں پہلے مصرعہ میں فعلان کے ع پر زیر ہے اور دوسرے پر ساکن یعنی دوسرے شعر میں آخری رکن مسکن صورت میں ہے
۔

غزل نمبر ۹۵۔

کیا اس بات نے مجھ دل کو مبہوت کہ کیوں آتا نئیں وو روح کا قوت

بحر ہزج مسدس سالم وزن: مفاعیلن مفاعیلن فعولان

غزل نمبر ۹۶۔

گمراہ ہیں تجھ زلف میں کئی اہل ہدایت یہ باٹ ہے ظلمات کی نئیں جس کوں نہایت

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف مکفوف محذوف وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۹۷۔

خوباں کی ہر اداسوں ہے نازک ادائے بیت معنی ستی بنا ہے نقاب حیائے بیت

بحر مضارع اخرب مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۹۸۔

ملتا نہیں ہے مجھ سوں وو دل دار الغیاث اس بے وفا کے جور سوں صد بار الغیاث

مستفعلن مستفعلن مستفعلن فعول

بحر: مضارع مثمن اخرب مکفوف مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۹۹۔

شوخ میرا بے میا ہے الغیاث صاحب جور و جفا ہے الغیاث

بحر رمل مسدس مقصور وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلان

غزل نمبر ۱۰۰۔

کدھی میری طرف لالن تم آتے نئیں سو کیا باعث چھبیلا مکھ اپس کا ٹک دکھاتے نئیں سو کیا باعث

بحر ہزج مثمن سالم وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۱۰۱۔

ہے جلوہ گر صنم میں بہار عتاب آج لینا ہے اس کے ناز و ادا کا حساب آج

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۱۰۲۔

ہے حسن کے نگر میں سجن تجھ کوں راج آج خوش دلبری کا تجھ کوں ملا تخت و تاج آج

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۱۰۳۔

جو لاں گری میں گرم ہے وو شہسوار آج سینے سوں عاشقاں کے اٹھے ہے غبار آج

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۱۰۴۔

دیکھے سے تجھ لباں کے اپر رنگ پان آج چونا ہوئے ہیں لالہ رخاں کے پر ان آج

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۱۰۵۔

دستا ہے تجھ جبیں سوں سر اسر ظہور صبح تجھ دیکھنے کوں جگ میں ہوا ہے عبور صبح

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۱۰۶۔

بر نگ صافی دل کیوں نہ ہو صفاے قدح　　کہ دست آئینہ رو ہے مدام جائے قدح

بحر مجتث مثمن مخبون، مخبون مسکن مقصور وزن: مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلان

غزل نمبر ۱۰۷۔

سجن اول کے زمانے میں یوں نہ تھا گستاخ　　اسی دنوں میں ہوا ہے یو کیا بلا گستاخ

بحر مجتث مثمن مخبون، مخبون مقصور مسکن وزن: مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلان

غزل نمبر ۱۰۸۔

مژہ بتاں کی ہیں تجھ غم میں خواب مخمل سرخ　　لگی ہے ترک کے پٹکے کوں یا مسلسل سرخ

بحر مجتث مثمن مخبون، مخبون مقصور مسکن وزن: مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلان

غزل نمبر ۱۰۹۔

ہمیشہ ہے بہار سرو آزاد　　نہ جاوے دولت حسن خداداد

بحر ہزج مسدس مقصور وزن: مفاعیلن مفاعیلن فعولان

غزل نمبر ۱۱۰۔

تجھ گل بدن پہ جگ کے ہوئے گل عذار بند　　گلشن میں تجھ بہار کے ہے نو بہار بند

بحر مضارع مثمن مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۱۱۱۔

جب سوں ہوا ترا یو قد دل ربا بلند　　سنتا ہوں ہر طرف سوں صداے بلا بلند

بحر مضارع مثمن مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۱۱۲۔

ہوا ہے گرم توں جب آفتاب کے مانند　　کیا ہے ہوش نے پرواز آب کے مانند

بحر مجتث مثمن مخبون، مخبون مقصور مسکن وزن: مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلان

غزل نمبر ۱۱۳۔

تیری نین کی سختی ہے دلبری کے مانند　　تیری نگاہ موزوں ہے عبہری کے مانند

بحر مضارع مثمن اخرب مسبغ وزن: مفعول فاع لاتن مفعول فاعلیان

غزل نمبر ۱۱۴۔

چنچل کوں جا کے بولو آبیجلی کے مانند　　اس وقت انکھیاں برستی ہیں بادلی کے مانند

بحر مضارع مثمن اخرب مسبغ وزن وزن: مفعول فاع لاتن مفعول فاعلیان

غزل نمبر ۱۱۵۔

سخن شناس کے نزدیک نئیں ہے کم زیزید　　کسی کے مطلب رنگیں کوں جو کیا ہے شہید

بحر مجتث مثمن مخبون مقصور وزن: مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلان

غزل نمبر ۱۱۶۔

اے شکر لب قند سوں تجھ لب کی ہیں باتاں لذیذ　　حرف تر اس کے ہیں جیسے حلوۂ سوہاں لذیذ

بحر رمل مثمن مقصور وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلان

غزل نمبر ۱۱۷۔

گر چمن میں چلے وو رشک بہار　　گل کریں نقد آب ورنگ نثار

بحر خفیف مسدس مخبون مقصور وزن: فاعلاتن مفاع لن فعلان

غزل نمبر ۱۱۸۔

مجھ کوں پہنچی اس شکر لب کی خبر حق شکر خورے کوں دیتا ہے شکر

بحر رمل مسدس محذوف وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۱۱۹۔

آیا توں کمر باندھ کے جب جور وجفا پر میں جی کوں تصدق کیا تجھ بانکی ادا پر

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۱۲۰۔

کیتا ہے نظر جب ستی اس رشک پری پر باندھیا ہے جو کئی جیوں کوں اس چھند بھری پر

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۱۲۱۔

سجن تجھ گل بدن کا آج نئیں ثانی چمن بھیتر غلط بولا چمن کیا بلکہ جنات عدن بھیتر

بحر ہزج مثمن سالم وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۱۲۲۔

اب جدائی نہ کر خدا سے ڈر بے وفائی نہ کر خدا سے ڈر

بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مسکن وزن: فاعلاتن مفاع لن فعلن

غزل نمبر ۱۲۳۔

سنایا جب خبر شادی کی قاصد صبح دم آ کر　　منگا رخصت مرے نزدیک باہر دل سوں غم آ کر

بحر ہزج مثمن سالم وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۱۲۴۔

اگر گلزار میں بیٹھے وو سرو نازنیں آ کر　　کرے نظارگی اس کی سو فردوس بریں آ کر

ایضا

غزل نمبر ۱۲۵۔

پڑا ہوں کوہ غم میں اس دل ناشاد سوں جا کر　　دعا بولو مری جانب سوں کئی فرہاد سوں جا کر

ایضا

غزل نمبر ۱۲۶۔

عاجزاں کے اپر ستم مت کر　　اس قدر سختی اے صنم مت کر

بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مسکن وزن: فاعلاتن مفاع لن فعلن

غزل نمبر ۱۲۷۔

چمن میں جب چلے اس حسن عالم تاب سوں اٹھ کر　　کرے تعظیم خوش بو ہر گل سیراب سوں اٹھ کر

بحر ہزج مثمن سالم　وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۱۲۸۔

میں تجھے آیا ہوں ایماں بوجھ کر　　باعث جمعیت جاں بوجھ کر

بحر رمل مسدس محذوف وزن : فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۱۲۹۔

اے بادِ صبا باغ میں موہن کے گزر کر　　　مجھ داغ کی اس لالۂ خونیں کوں خبر کر

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۱۳۰۔

ہشیار زمانے کے ترے مکھ پہ نظر کر　　　تجھ نیہہ کے کوچے میں گئے ہوش بسر کر

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف　وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۱۳۱۔

شوخ نکلا جب قدم کوں تیز کر　　　ناز کے شبدیز کوں مہمیز کر

بحر رمل مسدس محذوف　وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

غزل نمبر ۱۳۲۔

اے سرو خراماں توں نہ جا باغ میں چل کر　　　مت قمری و شمشاد کے سودے میں خلل کر

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف　وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۱۳۳۔

ہوا ہوں بے خبر تجھ مست انکھیاں کی خبر سن کر　　　ہوا ہوں ناتواں جیوں موتری نازک کمر سن کر

بحر ہزج مثمن سالم　وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۱۳۴۔

دل مرا ہے وو آتشیں پیکر　　　راکھ ہو گئے ہیں جس کوں دیکھ شرر

بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مسکن وزن: فاعلاتن مفاع لن فعلن

غزل نمبر ۱۳۵۔

جو آیا مست ساقی جام لے کر گیا یک بارگی آرام لے کر

بحر ہزج مسدس محذوف وزن: مفاعیلن مفاعیلن فعولن

غزل نمبر ۱۳۶۔

عجب نئیں جو کرے دل میں شیخ کے تاثیر اگر مقدمۂ عشق کوں کروں تحریر

بحر مجتث مثمن مخبون، مخبون مقصور مسکن وزن: مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلان

غزل نمبر ۱۳۷۔

ہوا مجھ چشم سوں بستاں غم سبز ہوا تجھ جور سوں بخت الم سبز

بحر ہزج مسدس مقصور وزن: مفاعیلن مفاعیلن فعولان

غزل نمبر ۱۳۸۔

لباس اپنا کیا وو گل بدن سبز ہوا سر تا قدم مثل چمن سبز

بحر ہزج مسدس مقصور وزن: مفاعیلن مفاعیلن فعولان

غزل نمبر ۱۳۹۔

نہ مل ہر بلبل مشتاق سوں اے گل بدن ہر گز ہر اک گلشن میں جیوں نرگس نہ کھول اپنے نین ہر گز

بحر ہزج مثمن سالم وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

غزل نمبر ۱۴۰۔

ہوا نئیں وو صنم صاحب اختیار ہنوز　　بجائے خود ہے رقیباں کا اعتبار ہنوز

بحر مجتث مثمن مخبون، مخبون مقصور　　وزن:　مفاع لن فعلاتن مفاع لن فعلان

غزل نمبر ۱۴۱۔

مت جا سجن کہ ہوش دل آیا نئیں ہنوز　　میں درد اپس کا تجھ کوں سنایا نئیں ہنوز

بحر مضارع مثمن اخرب مقصور　وزن: مفعول فاع لاتن مفعول فاع لان

غزل نمبر ۱۴۲۔

تو ہے رشک ماہ کنعانی ہنوز　　تجھ کوں ہے خوباں میں سلطانی ہنوز

بحر مضارع مثمن اخرب مقصور　وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلان

غزل نمبر ۱۴۳۔

داغ سوں دل قرص زر اندودر کھتا ہے ہنوز　　مثل سورج آتش بے دودر کھتا ہے ہنوز

بحر مضارع مثمن اخرب مقصور　وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلان

غزل نمبر ۱۴۴۔

میں جب ستی دیکھا ہوں بہار گل نرگس　　ہے وحشی دل تب سوں شکار گل نرگس

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف　وزن: مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

غزل نمبر ۱۴۵۔

عشق کے ہاتھ سوں ہوے دل ریش　　جگ میں کیا بادشاہ کیا درویش

بحر خفیف مسدس مخبون، مخبون مقصور مسکن وزن: فاعلاتن مفاع لن فعلان

غزل نمبر ۱۴۶۔

کیوں نہ ہو محبوب میرا جگ میں خاص　　اس کی کرتے ہیں صفت سب عام خاص

بحر رمل مسدس مقصور وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلان

غزل نمبر ۱۴۷۔

نئیں مرے دل کوں تری زلف کے چوگاں سوں خلاص　　زلف تیری سوں ہے لینا مجھے یک روز قصاص

بحر رمل مثمن مخبون، مخبون مقصور وزن: فاعلاتن فاعلاتن فعلاتن فعلان

غزل نمبر ۱۴۸۔

تجھ مکھ کے اس چمن میں یو خط ہے بہار محض　　جنت ہے جس کے لطف اگے شرمسار محض

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۱۴۹۔

آزاد کوں جہاں میں تعلق ہے جال محض　　دل باندھنا کسی سوں ہے دل پر وبال محض

بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور وزن: مفعول فاع لات مفاعیل فاع لان

غزل نمبر ۱۵۰۔

تجھ زلف کے بے تاب کوں مشک ختن سوں کیا غرض　　تجھ لعل کے مشتاق کوں کان یمن سوں کیا غرض

بحر رجز مثمن سالم وزن: مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

حواشی:

۱۔ شمس الرحمن فاروقی۔ شعر شور انگیز جلد سوم۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ بار اول ۱۹۹۲ء۔ ص ۸۵

۲۔ فخر دین نظامی۔ کدم راؤ پدم راؤ۔ مرتبہ: جمیل جالبی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔ اشاعت اول، ۱۹۷۳ء۔ ص ۱۳۳

۳۔ امیر خسرو۔ دیباچہ غرۃ الکمال۔ مترجم: پروفیسر لطیف اللہ۔ ناشر: شہر زاد، کراچی۔ شوال ۱۴۲۵ھ۔ ص۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ اردو غزل کے اہم موڑ۔ اردو غزل کے اہم موڑ۔ غالب اکیڈمی نظام الدین اولیا، دہلی۔ اشاعت سوم ۲۰۰۶ء۔ ص ۴۱

۵ ۔ فیض احمد فیض۔ میزان۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی، طبع اول: ۱۹۸۲ء، ص۔ ۴۸۔ ۴۷

۶۔ ظفر احمد صدیقی۔ ولی کا تاریخی کارنامہ۔ مشمولہ: ولی دکنی تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر۔ مرتب: گوپی چند نارنگ۔ ساہتیہ اکادمی، دہلی۔ سنہ اشاعت، ۲۰۰۵ء۔ ص ۷۱

۷۔ قاضی افضال حسین۔ کلاسیکی غزل کی شعریات۔ مشمولہ: اردو غزل شناخت و صفات۔ مرتب: ڈاکٹر تبسم جہاں۔ شعبۂ اردو علی گڑھ۔ سنہ اشاعت، ۲۰۱۵ء۔ ص ۲۹۷، ۲۹۶

۸۔ گوپی چند نارنگ۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ سن اشاعت، ۱۹۹۱ء۔ ص ۱۵، ۱۴

۹۔ مرزا خلیل احمد بیگ۔ تنقید اور اسلوبیاتی تنقید۔ شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ سن اشاعت، ۲۰۰۵ء۔ ص ۲۱۸

۱۰۔ ایضا۔ ص ۲۱۹، ۲۱۸

۱۱۔ ظفر احمد صدیقی۔ ولی کا تاریخی کارنامہ۔ مشمولہ: ولی دکنی تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر۔ مرتب: گوپی چند نارنگ۔ ساہتیہ اکادمی، دہلی۔ سنہ اشاعت، ۲۰۰۵ء۔ ص ۶۷

۱۲۔ جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اول۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سن اشاعت ۲۰۱۳ء۔ ص ۴۱۲

باب پنجم

ولی اور ہندی ادبیات

ولی اور ہندی کی ادبی تاریخ نگاری

ہندی کی ادبی تنقید میں ولی کی تلاش ہمیں جن کتابوں تک لے جاتی ہے ان کے نام ہمیں "دکنی ہندی" کے نام سے آشنا کرتے ہیں۔ یہ کتابیں بیسویں صدی کے نصف میں لکھی گئیں۔ اس لیے ان کتابوں کا لسانی سیاست سے خالی ہونا بعید از قیاس ہے اور اس پہلو کو ان کتابوں کے ابتدائی صفحات تقویت پہنچاتے ہیں۔ وہ سرمایہ جسے قدیم اردو یا دکنی اردو کے نام سے ہم ادبی تاریخ میں پڑھتے ہیں وہی سرمایہ "دکنی ہندی" کے نام سے ہندی کی تنقید میں متعارف کرایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں راہل سنسکرتیاین ،رام بابو سکسینہ اور شری رام شرما کی کتابیں ہمیں ملتی ہیں جو دکنی سرمایۂ ادب کو "دکنی ہندی" کے نام سے پیش کرتی ہیں۔ ہندی میں ولی شناسی کی نوعیت اور کیفیت کا جائزہ لینے سے پہلے دکنی کو "دکنی ہندی" کے نام سے موسوم کرنے کے اسباب کا جائزہ لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ رام بابو سکسینہ ان اولین مصنفین میں سے ہیں جو دکنی کو "دکنی ہندی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور لسانی ارتقاء کے زمانی سیاق سے صرف نظر کرتے ہوئے اردو کے عام محاورے اور لفظیات سے اس کا تقابل کرتے ہیں۔ یہ تقابل لفظوں کی بنت اور سلسلۂ زبان پر مبنی ہے۔ دکنی کو " دکنی ہندی " کہنے کا جواز اردو کے اس قدیم اسم لسان سے حاصل کیا جاتا ہے جو "ہندی" کے نام سے موسوم ہے۔ دکنی شاعروں نے اپنی زبان کو دکنی کے علاوہ ہندی کے نام سے بھی کثرت سے پکارا ہے اور یہی نام فی الواقع دکنی کو " دکنی ہندی" کہنے کا جواز بنا ہے۔ یہی جواز ولی کو " دکنی ہندی "کے شاعروں میں شمار کرنے کی دلیل بنتا ہے اور پوری دکنی شاعری "دکنی ہندی" کے عنوان سے ہندی کی ادبی تنقید میں زیر بحث آتی ہے۔ " ہندی "اسم لسان کی چند مثالیں دکنی متون سے درج کرنا مناسب ہے۔ ملا وجہی داستان "سب رس" میں لکھتے ہیں: "ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم اور نثر ملا کریوں نے بولیا" (۱)اشرف نوسرہار میں کہتے ہیں: "یک یک بول یہ موزوں آن تقریر ہندوی سب بکھان"(۲)

شاہ برہان الدین جانم " ارشادنامہ "میں کہتے ہیں:

ہندی بولوں کیا بکھان
جے کے پرساد تھا منجھ گیان(۳)

لفظ "دکنی "کو بھی بطور اسم لسان دکنی شعراء استعمال کرتے رہے۔ یہ اسم لسان کی مقامی نسبت تھی جو زبان کو شمالی کے بجائے دکن سے مخصوص کرتی تھی۔ وجہی اپنی مثنوی "قطب مشتری" میں اپنی زبان کو "دکنی "کے نام سے یاد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

دکن میں جو دکنی مٹھی بات کا
ادا نیں کیا کوئی اس گھات کا(۴)

نشاطی اپنی زبان کے عام فہم اور عوامی ترسیل کی اہلیت و قوت سے مملو ہونے کا اعلان ان الفاظ میں کرتا ہے:

اسے ہر کس کے تئیں سمجھا توں بول
دکنی کی بات سوں سریاں کھول(۵)

رستمی نے " خاور نامہ "" دکنی "بطور اسم لسان استعمال کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

خاور نامہَ دکنی کیتا ہوں نام
ہوا خاوراں پہ قصہ سب تمام(۶)

دکنی کو " دکنی ہندی "کا نام دینے والوں نے اس زبان کے تخلیق کاروں کے ذریعے استعمال کیے گیے دو اسم لسان یکجا کر لیے اور اس طرح "دکنی ہندی" سے نئے معنی پیدا کیے جو جدید ہندی میں اس سرمائے کو سمونے اور کھپانے کے لیے زیادہ با معنی تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دکنی شعراء اپنی زبان کے لیے دکنی اور ہندوی ہندی کا نام استعمال کرتے ہیں اور ہندی تنقید و تحقیق کے اساطین اسے "دکھنی ہندی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں گو صوتی اصالت پسندی کے اپنے منشور کو گنجائش کی حد تک یہاں بھی بروئے کار لاتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ 'دکنی ہندی "کو سنسکرت سے مملو ہندی سے مختلف زبان خیال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

हिन्दी शब्द का इस्तेमाल आज कई थोड़े बहुत विभिन्न अर्थों में किया जाता है । भाषा-विज्ञानी इस शब्द के अन्तर्गत पंजाब के पूरबी प्रदेश में बोली जाने वाली बाँगड़ू से लेकर संयुक्त प्रान्त के पूरबी जिलों में बोली जाने वाली अवधी पर्यन्त सभी बोलियों को समझते हैं और फ़ारसी लिपि में लिखी गई उर्दू और देवनागरी में की खड़ी बोली को इसी हिन्दी की एक शाखा हिन्दुस्तानी के दो साहित्यिक रूप मानते हैं । इसी प्रयोग के अनुकूल उर्दू को हिन्दी ही

> के भीतर एक विशेष शैली की हिन्दी समझा गया है। लेकिन आजकल हिन्दी शब्द को अधिकतर संस्कृत शब्दावली पर निर्भर एक विशेष शैली के लिए ही काम में लाया जाता है। जिस भाषा का विवेचन करने हम खड़े हुए हैं, उसके तीन नाम मिले हैं- हिन्दवी, हिन्दी और दक्खिनी। आरम्भ में ही इतना बता देना जरूरी है कि संस्कृत निष्ठ शैली से 'यह भाषा कई बातों में अलग है।(7)

لفظ ہندی آج بہت سے قدرے مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ماہر لسانیات اس لفظ کے تحت پنجاب کے مشرقی علاقے میں بولی جانے والی بانگڑو سے لے کر متحدہ صوبوں کے مشرقی اضلاع میں بولی جانے والی اودھی تک کی تمام بولیاں مراد لیتے ہیں اور فارسی رسم الخط میں لکھی گئی اردو اور دیوناگری میں لکھی گئی کھڑی بولی اس ہندی کی ایک شاخ ہندستانی کے دوادبی روپ مانتے ہیں۔ لیکن آج کل ہندی کا لفظ زیادہ تر سنسکرت الفاظ پر منحصر ایک خاص اسلوب کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔ ہم جس زبان پر بات کی تشریح کر رہے ہیں اس کے تین نام ہیں- ہندوی، ہندی اور دکھینی۔ شروع میں یہ بتانا ضروری ہے کہ 'یہ زبان کئی لحاظ سے سنسکرت زدہ اسلوب سے مختلف ہے۔

رام بابو سکسینہ کے اس اقتباس سے ہم جدید ہندی کے اس توسیعی رویے کو سمجھ سکتے ہیں جس نے لسانی تشکیل اور علاقائی زبانوں کی مقامی شناختے قطع نظر اپنے دامن کو وسعت دیتے ہوئے کئی زبانوں کو ہندی کی ادبی تاریخ کا حصہ بنانے کا کام کرتی رہی۔ جدید ہندی کے وجود اور لسانی تشکیل کے مباحث اس کی جدت کو ثابت کرتے ہیں اور بعض ہندی محققین نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اعتراف کے باوجود مختلف زبانوں کو ہندی کے نام سے موسوم کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اودھی، برج اور ہریانوی جیسی زبانیں "جدید ہندی" (ادبی تاریخ) کے خانے میں شامل کر لی گئیں جن کی اساس کھڑی پر استوار بھی نہ تھی تو زبان دکنی اس سے کیوں کر اور کیسے محفوظ رہ سکتی تھی۔ دکنی زبان اردو ہندی کے مشترک لسانی سرمائے کے طور پر نہ اپنائی گئی بلکہ لسانی کشمکش میں اجارہ داری اور مالکانہ حق کی مسابقت نے لسانی ورثے پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے یہ ترکیب سجھائی اور یوں دکنی سرمایہ ہندی کے الگ اسلوب کی حیثیت سے جدید ہندی میں متعارف کرایا گیا اور رائج اردو زبان کے بارے میں بھی جدید ہندی کے ایک اسلوب ہونے کی بات بار بار دہرائی گئی۔ "جدید ہندی" کی اولین تاریخوں میں شامل "ہندی ساہتیہ کا اتیہاس" میں رام چندر شکل نے باضابطہ کوئی ایسی کوشش نہ کی لیکن بعد کی ہندی کی ادبی تاریخوں میں باضابطہ اردو کو "جدید ہندی" کی ایک شیلی کہا گیا۔ یہ بات کہنے سے پہلے جدید ہندی کے تقدم زمانی کا ثابت کیا جانا ضروری تھا لیکن یہ ضروری کام اردو کے بدیہی تقدم زمانی کے وجہ سے ممکن نہ تھا۔ تاہم "جدید ہندی" کی تنقید نے اردو اور دکنی کے بارے "جدید ہندی" کی شیلی ہونے

کا تأثر عام کر لیا۔ راہل سانکرتیاین نے اپنی کتاب "دکنی ہندی" میں ایسی باتیں کہیں ہیں جو بالعموم "جدید ہندی" کی ادبی تاریخ میں بطور بیانیہ نہیں ملتیں۔ وہ لکھتے ہیں:

दक्खिनी हिन्दी साहित्य की ऐसी कड़ी है, जिसको भुलाया नहीं जा सकता। खुसरो को खड़ी (कौरवी) हिन्दी का प्रथम कवि बतलाया जाता है, पर इसमें सन्देह है। खुसरो के समय अर्थात १३वीं सदी का अन्त अपभ्रंश और आधुनिक भाषाओं का सन्धि काल था। उस समय प्राकृत तत्सम शब्दों का प्रयोग ज्यादा होता था। खुसरो के समकालीन फारसी इतिहासकार राजपूत के लिए राउत शब्द का प्रयोग करते हैं, जो स्पष्ट राउत का ही अरबी लिपि द्वारा भ्रष्ट लेख है। ऐसे शब्दों का खुसरो की कविता में अभाव है। दूसरे, खुसरो की कविताओं का कोई भी समकालीन या उससे तीन-चार सौ वर्ष बाद के हस्तलेख नहीं मिलते। इस प्रकार खड़ी हिन्दी के सर्वप्रथम कवि यही दक्खिनी कवि थे। एक ओर उन्होंने बोलचाल की कौरवी को साहित्यिक भाषा का रूप दिया, तो दूसरी तरफ उनकी कृतियों ने उर्दू कविता का प्रारम्भ किया। हमारी हिन्दी उर्दू की, विशेष तौर से गद्य की ऋणी है। दिल्ली के राज्यपालों, सेनापतियों और दूसरे शासकों के साथ कौरवी भारत के भिन्न-भिन्न भागों में पहुँची है, हाँ साधारण बोलचाल के लिए ही, राजकीय कार्य या साहित्य के लिए नहीं। वह काम तो फारसी सँभाले हुई थी । कुरू के अज्ञातप्राय जनपद की दिल्ली को मुस्लिम शासकों ने अपनी और भारत की राजधानी बनाया। इस प्रकार ६ शताब्दियों के कन्नौज के महत्व को मिटा दिया। उपनिषद् और ब्राह्मणकाल में कुरु भारत का सबसे बड़ा सांस्कृतिक केन्द्र था, पर प्रायः अठारह उन्नीस शताब्दियों से वह अपने महत्व को खो चुका था। दिल्ली के कारण उसका भाग्य लौटा। और आज उसकी भाषा हमारे समस्त देश की सम्मिलित भाषा वन गई।

हिन्दी के साहित्यिक विकास में दक्खिनी हिन्दी और उर्दू का बहुत बड़ा हाथ है। उर्दू को बहुत से लोग हिन्दी का प्रतिपक्षी समझते हैं, जो गलत है। हम हिन्दीवाले उसे हिन्दी की एक शैली मानते है। जो विरोध है, वह केवल उसकी अरबी लिपि के कारण है वह समय दूर नहीं है, जब उर्दू का समस्त श्रेष्ठ साहित्य नागरी अक्षरों में आकर सबके लिए सुलभ हो जायेगा । कौरवी लोकभाषा से व्यवधान करने के लिए उर्दू ने जो विधि-निषेध बनाये, हिन्दी ने उसे स्वीकार कर लिया । कौरवी में 'आवे है' का प्रयोग आज भी होता है, उर्दू ने 'आता है' कर दिया, तो हिन्दी भी इस लक्ष्मण रेखा के बाहर जाने की शक्ति नहीं रखती।(8)

دکھنی ہندی ادب کی ایک ایسی کڑی ہے، جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ خسرو کو کھڑی (بولی) (کوروی) ہندی کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے، لیکن اس میں شک ہے۔ خسرو کے زمانے میں، یعنی ۱۳ویں صدی کے آخر میں اپبھرنش اور جدید زبانوں کا دور تھا۔ اس وقت پراکرت سے ملتے جلتے الفاظ زیادہ استعمال ہوتے تھے۔ خسرو کے ہم عصر فارسی مؤرخین راجپوت کے لیے لفظ راؤت استعمال کرتے ہیں، جو واضح طور پر عربی رسم الخط سے راوت کا بھرشٹھ لیکھ ہے۔ خسرو کی شاعری میں ایسے الفاظ کی کمی ہے۔ دوسری بات یہ کہ خسرو کی نظموں کے کوئی معاصر یا تین چار سو سال بعد کے مخطوطے نہیں ملے۔ اس طرح یہ کھڑی ہندی کا پہلے شاعر یہی دکنی شاعر تھے۔ ایک طرف انھوں نے بولی جانے والی کوروی کو ادبی زبان کی شکل دی تو دوسری طرف ان کی تخلیقات سے اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ ہماری ہندی اردو کی مقروض ہے، خاص طور پر نثر کی۔ کوروی، دہلی کے صوبیداروں، جرنیلوں اور دیگر حکمرانوں کے ساتھ، ہندوستان کے مختلف حصوں میں پہنچی، ہاں صرف عام بات چیت کے لیے، سرکاری کام یا ادب کے لیے نہیں۔ وہ کام فارسی میں ہوتا تھا۔ مسلم حکمرانوں نے نامعلوم ضلع کورو کی دہلی کو اپنا اور ہندوستان کا دارالحکومت بنایا۔ اس طرح ۶ صدیوں کی قنوج کی اہمیت مٹا دیا۔ کورو اپنشدوں اور برہمنوں کے دور میں ہندوستان کا سب سے بڑا ثقافتی مرکز تھا، لیکن تقریباً اٹھارہ اور انیس صدیوں تک اپنی

> اہمیت کھو چکا تھا۔ دہلی کی وجہ سے ان کی قسمت لوٹ آئی۔ اور آج ان کی زبان ہمارے پورے ملک کی مشترکہ زبان بن چکی ہے۔
>
> ہندی کی ادبی ترقی میں دکنی ہندی اور اردو کا بڑا ہاتھ ہے۔ بہت سے لوگ اردو کو ہندی کا مخالف سمجھتے ہیں جو کہ غلط ہے۔ ہم ہندی والے اسے ہندی کا انداز سمجھتے ہیں۔ جس کی مخالفت صرف اس کے عربی رسم الخط کی وجہ سے ہے،وہ وقت دور نہیں جب اردو کا تمام بہترین ادب ناگری حروف کی صورت میں سب تک پہنچ جائے گا۔ ہندی نے کوروی لوک بھاشا سے اختلاف کرنے کے لیے اردو نے جو ممانعتی اصول بنائے ہندی نے ان کو قبول کیا۔ کوروی میں آج بھی 'آوے ہے' استعمال ہوتا ہے،اردو نے 'آتا ہے' کیا ہے، تو ہندی بھی اس لکشمن ریکھا سے آگے جانے کی طاقت نہیں رکھتی۔

راہل سانکرتیاین یہاں خسرو کے دستیاب کلام پر اعتراض کرتے ہیں، ان کے اس اعتراض میں قدیم مخطوطات کا عدم وجود ایک معقول دلیل ہے البتہ الفاظ کی ریخت شکلوں کی عدم موجودگی خسرو کے ہندوی کلام کے سلسلے میں عدم صحت دلیل نہیں بن سکتی کہ خسرو نہ صرف سنسکرت سے واقف تھے بلکہ انھوں نے سنسکرت شعریات پر فارسی شاعری کا نیا مزاج و منہاج مرتب کیا تھا۔ اگر وہ سنسکرت سے براہ راست واقف تھے تو اصل الفاظ کا شاعری میں استعمال بھی بخوبی کر سکتے تھے اس لیے یہ دلیل معقول نہیں کہی جا سکتی۔ راہل سانکرتیاین قنوج اور کرو کے علاقے کو موضوع بحث بناتے ہوئے تاریخ کے نو آبادیاتی بیانیے کی پیروی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں کہ کُرو اٹھارہ انیس صدیوں سے اپنی اہمیت کھو چکا تھا تو اہمیت کے زوال کا سبب مسلم عہد حکمرانی کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں "اپ بھرنش" کی اصطلاح اور بھرشٹ الفاظ کا نظریہ لسانی زاویے سے اس لیے قابل قبول نہیں کہ یہ زبان اصالت پسندی کی نفسیات کی نمائندگی کرتا ہے اور مرور زمانہ کے ساتھ لفظی تقلیبات کو الٹے پاؤں اصل کی طرف لوٹانے کی روش کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو "اپ بھرنش زبان" کا تصور لسانی ارتقاء کے بارے میں متعصب زاویۂ نگاہ کی شہادت دیتا ہے اور اس لسانی اصطلاح کی تصحیح کی طرف ہمیں راغب کرتا ہے۔ راہل سانکرتیاین اردو کے تقدم زمانی کو قبول کرتے اور جدید ہندی کے لیے بالخصوص جدید ہندی نثر کے لیے اسے اہم تسلیم کرتے ہیں۔ وہ بجا طور پر جدید ہندی کو اردو کا مقروض مانتے ہیں۔ ساتھ وہ اردو کے ادبی سرمائے کی ناگری رسم الخط میں منتقل کیے جانے کو ہندی کے لیے نفع بخش قرار دیتے ہیں کہ اس طرح اردو سرمایۂ ادب ہر ایک کے لیے

دستیاب ہو گا اور رسم الخط کی مشکل یا مانع جاتا رہے گا۔ ہم اسے جدید ہندی کی توسیع پسند نفسیات کا لطف آمیز اور نرم جو بیانیہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس بحث کے بعد ہم ولی کے ہندی تنقید میں استقبال اور تحسین کی پشت پر کار فرما عوامل سمجھ سکتے ہیں۔ اب ہمیں "ہندی میں ولی شناسی" کا رخ کرنا چاہیے۔

راہل سانکرتیاین اس محولہ بالا کتاب میں ولی پر ڈیڑھ صفحے میں گفتگو کرتے ہیں۔ جس میں نے نصف حصہ محی الدین قادری زور کی کتاب "شہ پارے" سے مندرج حوالہ ہے۔ پہلے صفحے کا دو تہائی حصہ ولی کی شاعری کی تاریخی اہمیت اور فنی قدر و قیمت پر مبنی ہے نیز ولی کے سوانحی حالات بھی درج ہیں۔ راہل سانکرتیاین ولی کو ایک شاعر مانتے ہیں جس پر شاعری کی قدیم دکنی روایت منتہی ہوتی ہے اور اس کی جگہ اردو کی ادبی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ بین السطور سے ایک معنی یہ بر آمد ہوتا ہے کہ ولی کی روایت اپنے سابق سے علاحدہ روایت ہے اور اس کی شناخت اس سابقہ روایت سے نہیں کی جا سکتی۔ ان کے نزدیک ولی شاعری کے اہم موڑ کا عظیم شاعر ہے۔ ولی نے دکنی شاعری کی ترجیحی اصناف یعنی بیانیہ شاعری سے الگ راہ اپنائی اور غزل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ غزل کو غالب صنف کا درجہ گو ولی کی وجہ سے ملا۔ ولی نے ایسے سہل اور معجز نما اسلوب میں شاعری کی کہ اس کے بعد آنے والے شعراء ولی کے اسلوب کو اپنانے پر مجبور ہوئے۔ راہل سانکرتیاین غزل کو رواج دینے میں قلی قطب شاہ کو بھی ولی کا شریک و سہیم بتاتے ہیں کہ اس نے ولی سے ایک صدی قبل غزل کا آغاز کیا تھا۔ وہ غزل کو ولی کی ایجاد و اختراع کہنے سے اس لیے انکار کرتے ہیں کہ ان سے ایک صدی قبل یہ کام قلی قطب شاہ انجام دے چکے تھے۔ یہاں ولی کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کی تردید کے ساتھ قلی قطب شاہ کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کا اقرار ہے۔ اس کتاب کی آمد سے بہت پہلے یہ بات متحقق ہو گئی تھی لیکن مصنف نے اپنے معلومات کا ماخذ درج نہیں کیا ہے۔ ولی کی شاعری نے دہلی کے ادبی ماحول میں جو ہلچل پیدا کی اور ریختہ کی طرف دہلی کے ادبی معاشرے کو متوجہ کیا، اس کا ذکر بھی مصنف نے کیا ہے۔ مصنف نے ولی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

> वली के साथ पुरानी दक्खिनी काव्यधारा की एक तरह समाप्ति होती है और उसके स्थान पर उर्दू काव्यधारा का युग आरम्भ होता है। वह संधिकाल का महान् कवि है। एक समय था, जब वली को ही उर्दू-काव्य का आदिकवि माना जाता था। उर्दू में वली का नाम सबसे पहले आता है। अबतक दक्खिनी काव्य मे मस्नवी या कथा-काव्य की प्रधानता थी, किन्तु वली ने पीटी लकीर को छोड़ गजल (स्फुट प्रेम-पदावलि) का रवाज दिया। उसकी गजले इतनी सरस और चमत्कार पूर्ण थीं, कि आगे आनेवालों को उसीके पदचिह्नों पर चलना पड़ा। यद्यपि गजलों का प्रारम्भ उससे एक शताब्दी पहिले मुहम्मद कुल्ली कुतुब ने भी किया था, इसलिए इसे वली का नवाविष्कार नहीं कह सकते । दक्खिनी

कवियों में शायद ही कोई हो, जो फारसी का पंडित नहीं था। फारसी में गजलों के लिए हाफिज बहुत पहिले ही मशहूर हो गये थे । वली की एक यह भी विशेषता मानी जाती है कि उसने सर्वप्रथम अपना दीवान ग्रथित किया। यह भी बात ठीक नहीं है कि क्यों मुहम्मद कुल्ली कुतुब ने यह काम पाँच-छह पीढ़ी पहिले ही कर डाला था। हाँ, वली की एक बड़ी विशेषता यह जरूर मानी जायेगी, कि इस दविखनी कवि के देशी भाषा में लिखे पद्यों के चमत्कार को देखकर औरंगजेब कालीन दिल्ली के कवि-देवताओं का आसन डगमगा उठा। अभी तक शाहों, शाहजादों तथा उसके दरबार की भाषा फारसी थी, फारसी ही काव्य की भाषा भी समझी जाती थी । कोई सम्भ्रान्त कवि हिन्दी में छन्द जोड़ना अपनी शान के खिलाफ़ समझता था। लेकिन अब उन्हें साफ दिखलाई देने लगा कि यदि हम नहीं चेते, तो जिस तरह आरवा की कविताओं पर दरबार के लोगों के सर झूम रहे हैं, उसमें वली और उसके चेले बाजी मार ले जायेगे, और हम मुँह देखते ही रह जायेंगे । वली उसी समय का कवि है, जब कि उत्तर भारत में वृन्दू, लाल, घन आनन्द, नागरीदास हिन्दी काव्य की श्रीवृद्धि कर रहे थे।

वली का असली नाम वली मुहम्मद था। यह १६८२ ई० (१०९३ हि०) के आसपास औरगाबाद में पैदा हुआ था, और १७३० ई० (११५५ हि०) मे अहमदाबाद (गुजरात) में मरा जहाँ ही इसकी कब्र है । बली की शिक्षा-दीक्षा गुजरात में हुई, उसका गुजरात से प्रेम था, जैसा गुजरात वियोग तथा सूरत वर्णन सम्बन्धी उसकी कविता से मालूम होता है। पुराने लेखकों ने इसी भ्रम से उसे गुजराती समझा, यद्यपि वह दक्खिन का निवासी था। (9)

ترجمہ:

ولی کے ساتھ ایک طرح سے پرانی دکنی روایت ختم ہوتی ہے اور اس کی جگہ پر اردو کی شعری روایت کا عہد شروع ہوتا ہے۔ وہ تقلیبی عہد کا عظیم شاعر ہے۔ ایک وقت تھا جب ولی کو اردو شاعری کا پہلا شاعر مانا جاتا تھا۔ اردو میں ولی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اب تک دکنی شاعری میں مثنوی یا داستانوی شاعری کی اجارہ داری تھی، لیکن ولی نے پیٹی لکیر کو چھوڑ کر غزل کو رواج دیا۔ اس کی غزلیں اتنی پیاری اور لاجواب تھیں کہ آگے آنے والوں کو ان کے نقش قدم پر چلنا پڑتا تھا۔ غزل اگرچہ اس سے ایک صدی پہلے محمد قلی قطب نے شروع کی تھی، اس لیے اسے ولی کی ایجاد نہیں کہا جا سکتا۔ دکن کے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو فارسی کا عالم نہ ہو۔ حافظ بہت پہلے فارسی میں اپنی غزلوں کے لیے مشہور ہو چکے تھے۔ یہ بھی ولی کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے کہ اس نے سب سے پہلے اپنا دیوان مرتب کیا۔ یہ بھی درست نہیں کہ محمد قلی قطب نے یہ کام پانچ چھ نسلوں پہلے کر چکا تھا۔ ہاں یہ ضرور ولی کی ایک بڑی خصوصیت سمجھی جائے گی کہ اس دکھنی شاعر کی مادری زبان میں لکھی گئی نظموں کا کرشمہ دیکھ کر اورنگ زیب کے زمانے میں دہلی کے شاعر استادوں کی مسند ہل گئی۔ اب تک شاہوں، شہزادوں اور ان کے دربار کی زبان فارسی تھی، فارسی کو شاعری کی زبان بھی سمجھا جاتا تھا۔ ایک اشرافیہ شاعر ہندی میں شعر کہنا اپنے شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن اب ان کو صاف نظر آرہا تھا کہ اگر ہم نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو جس طرح دربار والے بھاکا کی شاعری پر جھوم رہے ہیں ولی اور اس کے ہمنوا بازی لے جائیں گے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ ولی اسی زمانے کے شاعر ہیں، جب شمالی ہندوستان میں ورندو لال، گھن آنند، ناگرید اس ہندی شاعری کو بڑھا رہے تھے۔

ولی کا اصل نام ولی محمد تھا۔ یہ ۱۶۸۲عیسویں ۱۰۹۳ہجری کے آس پاس اورنگ آباد میں پیدا ہوا، اور ۱۷۳۰عیسویں ۱۱۵۵ہجری میں احمد آباد (گجرات) میں فوت ہوا جہاں اس کا مقبرہ ہے۔ ولی کی تعلیم گجرات میں ہوئی، وہ گجرات سے محبت کرتا تھا، جیسا کہ گجرات سے متعلق قطعہ اور سورت کی تفصیل سے متعلق اس کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے۔ پرانے ادیبوں نے اسے اسی بھرم کی وجہ سے گجراتی سمجھا، حالانکہ وہ دکن کا رہنے والا تھا۔

مندرجہ بالا آخری پیراگراف میں راہل سانکرتیاین ولی کا مولد اورنگ آباد بتاتے ہیں اور ان کی تاریخ پیدائش ۱۰۹۳ہجری مطابق ۱۶۸۲ء کے آس پاس بتاتے ہیں۔ تاریخ وفات ۱۱۵۵بمقام احمد آباد ہجری مطابق ۱۷۳۰ء لکھتے ہیں۔ ولی کی تعلیم گجرات میں ہوئی، اسے گجرات سے بڑا لگاو تھا۔ وہ ولی کو گجراتی قرار دیے جانے کا سبب گجرات سے متعلق اس کی مثنویوں کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ دکھن کا باشندہ تھا۔ ان پہلو پر پہلے باب میں گفتگو ہو چکی ہے، اس لیے نئے حقائق سے اس مقام پر موازنہ تحصیل حاصل ہے۔

رام بابو سکسینہ اپنی کتاب "دکھنی ہندی" میں ولی کا بطور خاص ذکر نہیں کرتے، البتہ جہاں نظم و نثر کا نمونہ دکنی کے نمائندہ شاعروں کا درج ہے، ولی کے کلام کے نمونے دیے گئے ہیں۔ یہ کتاب رام بابو سکسینہ کے خطبات پر مبنی ہے، اس لیے یہاں ولی کا باضابطہ ذکر ممکن نہ تھا۔ خطبے کے مقاصد جیسا ان کے ماحصل سے واضح ہے، دکنی ادب کو جدید ہندی ادب سے ہم آہنگ بتانا اور توسیعی منہاج کو قائم کرنا تھا۔ یہ کتاب اپنے اس ہدف کو بحسن و خوبی پورا کرتی ہے۔ وہ ایک مقام پر ولی کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ دکنی زبان پر بحث کرتے ہوئے اس کے اسلوبی تنوع کا اعادہ کرتے ہیں۔ ساتھ یہ بھی بتاتے ہیں کہ دکنی زبان کے دواوین اور متون میں کسی معیاری زبان کا سراغ نہیں ملتا۔ اسی طرح قواعد میں بھی تنوع و کثرت ہے۔ سکسینہ زبان کی معیار بندی کے فقدان کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی زبان کا گریمر نہیں ہے یا اس کے متون کسی ایک قواعد پر پورے نہیں اترتے اور زبان و محاورے کسی ایک معیار کی پیروی نہیں کرتے تو ان کی ادبی و لسانی قدر و قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ وہ نظام کی ریاست کی زبان کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو معیاری اردو ہے لیکن ان کے افسران دکنی ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس مقام پر وہ "جدید ہندی" لکھنے والوں کی بولیوں کا ذکر بھی کر سکتے تھے کہ اتر پردیش اور دوسرے صوبے جہاں کی کام کاج کی زبان ہندی ہے اور سکسینہ کے وقت اسے دفتری زبان سہولت حاصل ہو گئی تھی۔ کاغذات میں ہندی استعمال کرنے والوں کی زبان میں بھی دکنی کے مختلف متون میں موجود اختلاف سے زیادہ قواعدی اختلافات موجود ہیں۔ تقاضائے انصاف یہی تھا وہ اس فرق کو بھی

درج کرتے۔ سکسینہ اسلوب کے سلسلے میں لفظیات کو بنیادی اور اساسی قرار دیتے ہیں۔ وہ دکنی دواوین میں عربی فارسی کے غیر ملکی الفاظ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ برائے نام ہیں اور ان کی ہم عصر مروج اردو سے تو بہت کم ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> पिछले व्याख्यान में दक्खिनी भाषा पर विचार करते समय देखा गया है कि इसका जो रूप पुराने ग्रन्थों में मिलता है उसमें काफ़ी बोली-भेद है, व्याकरण के रूपों की बहुलता मिलती और यह नहीं कहा जा सकता कोई स्टैंडर्ड रूप प्रचलित था । इसी भाषा की यह रूप-बहुलता आज भी मिलती है पर बोल चाल में । निजाम राज्य की सरकारी भाषा आज स्टैंडर्ड उर्दू है, पर वहाँ के ऊँचे अधिकारी भी दक्खिनी का ही बोल-चाल में प्रयोग करते हैं। उत्तर भारत से गए हुए बटोही को यह उच्चारण और व्याकरण का बोलीपन वहाँ तुरन्त दिखाई पड़ जाता है।
>
> शैली के विचार में प्रधान बात शब्दावली की होती है। दक्खिनी के ग्रन्थों को देखने से पता चलता है कि उनमें अरबी फारसी आदि विदेशी भाषाओं के शब्द बहुत नहीं हैं और निश्चय ही आजकल की उर्दू में जितने मिलते हैं उनसे बहुत कम यह सच है कि एक ही ग्रन्थकार के दो विभिन्न विषयों के प्रतिपादक ग्रन्थों में ही शब्दावली का भेद पड़ जाता है। दक्खिनी में इस्लाम धर्म के प्रचारक (मीराजुल आशिक़ीन आदि) ग्रन्थों मे अरबी शब्द ज्यादा हैं पर (सबरस आदि) कहानी क़िस्से के ग्रन्थों में उतने नहीं।

پچھلے خطبے میں دکھنی زبان پر خیال (ظاہر) کرتے وقت یہ دیکھا گیا کہ اس کی جو شکل دواوین میں ملتی ہے اس میں زبان کا فرق ہے، قواعدی شکلوں میں تنوع (گھال میل) ملتا ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی معیاری شکل رائج تھی۔ اسی زبان کی صوری کثرت آج بھی ملتی ہے مگر بول چال میں۔ نظام کی ریاست میں سرکاری زبان آج معیاری اردو ہے، لیکن وہاں کے اعلیٰ افسران بھی دکنی روزمرہ ہی برتتے ہیں۔ شمالی ہند سے گئے ہوئے داروغہ کو یہ تلفظ اور قواعد کا بولی پن فوراً دکھائی پڑ جاتا ہے۔

اسلوب کے سلسلے میں بنیادی بات لفظیات کی ہوتی ہے۔ دکھنی کے دواوین کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں عربی فارسی وغیرہ بدیسی زبانوں کے لفظ زیادہ نہیں ہیں اور یقیناً آج کل کی اردو میں جتنے ملتے ہیں ان سے بہت کم۔ یہ سچ ہے کہ ایک ایک ہی مصنف کے دو مختلف موضوعات کی نمائندہ کتابوں میں لفظیات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ دکھنی میں اسلام مذہب کے مبلغ (معراج العاشقین وغیرہ) کتابوں میں عربی الفاظ زیادہ ہیں لیکن (سب رس وغیرہ) کہانی قصے کی کتابوں میں اتنے نہیں ہیں۔

رام بابو سکسینہ ولی کی زبان کا بطور خاص ذکر کرتے ہیں۔ ولی کی زبان کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ سفر دہلی سے پہلے ولی کے یہاں دیسی الفاظ زیادہ ہیں اور سفر دہلی کے بعد غیر ملکی الفاظ کچھ زیادہ ہو گئے ہیں۔ سکسینہ لکھتے ہیں:

> यही बात समान रूप से दक्खिनी के अधिकतर ग्रन्थों के बारे में कही जा सकती है। वलीऔरंगाबादी' के दिल्ली आने के पूर्व की कृतियों में देशी शब्द अधिक हैं, दिल्ली से लौटने के बाद की रचनाओं में विदेशी शब्दों की संख्या की मात्रा कुछ अधिक हो गई है। परकालीन ग्रन्थकारों की कृतियों में यह और बढ़ती गई है। कभी कभी तो कोई भी विदेशी शब्द नहीं दिखाई पड़ता।(10)

ترجمہ:

یہی بات دکھنی کے بیشتر کتب کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ ولی اورنگ آبادی کے دہلی آنے پہلے کی تخلیقات میں دیسی الفاظ زیادہ ہیں، دہلی سے لوٹنے کے بعد کی تخلیقات میں بدیسی الفاظ کی تعداد کچھ بڑھ گئی ہے۔ کبھی کبھی تو کوئی بھی بدیسی لفظ دکھائی نہیں دیتا۔

مندرجہ بالا عبارت میں اہم بات یہ ہے کہ سکسینہ ولی کو اورنگ آبادی لکھتے ہیں۔ ولی کے یہاں زبان کے سلسلے میں اجنبی الفاظ کی شناخت کا پہلو سکسینہ کے اس تاریخی تصور کا زائیدہ ہے جسے نو آبادیاتی تاریخی بیانیے نے پروان چڑھایا۔ اس سلسلے کے دیگر پہلو جیسے کہ سفر دہلی کے بعد ولی کی شاعری فارسی طرز کی ہوئی یا نہیں ہوئی، پچھلے ابواب میں زیر بحث آچکے ہیں، اس لیے انھیں یہاں دہرانا بے سود ہے۔ ہاں تاریخ کے نو آبادیاتی بیانیے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے؛ وہ بھی اس لیے کہ ہم دونوں مصنفین کے یہاں زبان کی اصالت کا رجحان دیکھ آئے ہیں۔ راہل سانکرتیاین مقامی ادبیات کے ارتقاء میں مسلم عہد حکمرانی کو حارج اور مانع خیال کرتے ہیں اور رام بابو سکسینہ اپنی ادبی تاریخ کی طرح یہاں بھی لفظ کی سطح پر دیسی اور بدیسی لفظیات کے استعمال سے اس غیریت کا سراغ فراہم کرتے ہیں جو نو آبادیاتی بیانیے سے یہاں کے تعلیم یافتہ طبقے میں پیدا ہو گئی تھی اور اسی تعلیم یافتہ احیائیت پسند طبقے کی کارروائیاں روز بروز آپسی خلیج کو بڑھانے کا کام کر رہی تھیں۔ تاریخ کے نو آبادیاتی بیانیے سے یہ بات پڑھنے والوں کے ذہن اور ادراک میں آئی کہ عہد وسطیٰ کا زمانہ ہندوؤں کے لیے ظلم واستبداد کا زمانہ تھا اور اس زمانے کے مسلم سلاطین نے زمام اقتدار اپنے پاس رکھنے کے لیے یہاں باشندگان پر بے انتہا ظلم کیے۔ ان سے ان کے تشخص کو چھین لیا۔ حتیٰ کہ شعر وادب کی دنیا میں وہ شجاعت اور بہادری کی گاتھائیں لکھنے کے بجائے بھجن اور بھکتی کے گیت لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ نو آبادیاتی مؤرخین نے قدیم ہندستان سے متعلق مذہبی متون کا مطالعہ اور ان علوم کی ستائش کی کہ یہ بیش قیمت علوم ہندستان کے زریں ماضی کی خبر دیتے ہیں جو کہ بہت شاندار اور ان گنت خوبیوں کا مالک تھا۔ زبان کے بارے میں اسی طرح کے خیالات رائج کیے گئے کہ یہاں کے لوگوں کی اصل زبان سنسکرت ہے اور جو زبان رائج ہے وہ ایک بیرونی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اس کے لکھنے بولنے والے زیادہ تر مسلمان ہیں۔ یہ ہندوؤں کا اسلوب نہیں بلکہ مسلمانوں کا اسلوب ہے۔ اس طرح زبان میں اصالت پسندی کے رویے کو نو آبادیاتی بیانیے نے رواج دیا اور یمانی بھاشا سے الگ زبان کی طرف لوگ مائل ہونا شروع ہوئے۔ ہمارے قوم پرست مؤرخین نے بعد میں اس طرف توجہ کی اور فرقہ پرستی کے دور عروج میں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ برطانوی مؤرخین اور ان کے پیروکار ہندستانی مؤرخین نے ہندستانی

تاریخ کے عہد وسطیٰ کو مسلم عہد کے طور پر متعارف کرایا۔ ترکوں، مغلوں اور افغان کی حکومتیں مسلم حکومتیں قرار پائیں۔ اس بات سے سروکار نہ رکھا گیا کہ اگر کسی زمانے میں عوام بے حال ہوئے تو اس بے حالی اور بدحالی میں بلا شرکت مذہب و ملت سارے عوام شریک تھے۔ جب تاریخی بیانیہ ہندو بنام مسلم وضع کر لیا گیا تو تمام ہندو محکوم اور تمام مسلمان حاکم قرار پائے تو اس طرح آپسی نفرت کی بنا رکھی گئی۔ مسلم دور اقتدار و تسلط میں ہندو اپنے ماضی کی شان بحال کرنے میں ناکام رہے اور مسلسل زوال وادبار کا شکار ہوتے رہے۔ عہد وسطیٰ میں جو ترقیاں ہوئیں اور معیشت، تکنالوجی، فن، آرٹ، ادب، فلسفہ تہذیب و تمدن اوراشیائے خورد و نوش کے مختلف میدانوں جو حصولیابیاں اہالیان ہند کا حصہ بنیں، وہ سب نو آبادیاتی تاریخی بیانیے میں مسترد قرار پائیں، گو وہ بے وقعت اور نالائق ذکر تھیں۔ گاندھی جی نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور محرف تاریخ کی مسلسل تدریس کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے مضر خیال کیا۔ ان کی نظر میں جب تک نصابی کتابوں میں محرف تاریخ کی تدریس ہوتی رہے گی؛ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا مستقل قیام نہ ہو سکے گا۔ بپن چندرا نے بتایا ہے کہ فرقہ وارانہ نظریہ شاعری، ڈراما، تاریخی ناول، افسانہ، اخبارات یہاں تک ادب اطفال کے ذریعے وسیع پیمانے پر پھیلایا جاتا رہا۔ وہ لکھتے ہیں :

> As students of history we should also know that the manner in which Indian history was taught in schools and colleges in those days also contributed to the growth of communalist feelings among the educated Hindus and Muslims. British historians and, following them, Indian historians described the medieval period of Indian history as the Muslim period. The rule of Turk, Afghan and Mughal rulers was called Muslim rule. Even though the Muslim masses were as poor and oppressed by taxes as the Hindu masses, and even though both were looked down upon by the rulers, nobles, chiefs and zamindars, whether Hindu or Muslim, with contempt and regarded as low creatures, yet these writers declared that all Muslims were rulers in medieval India and all non-Muslims were the ruled. They failed to bring out the fact that ancient and medieval politics in India, as polotics everywhere els, were based on economic and political interest and not on religious consideration. Rulers as well rebels use religious appeal as an outer colouring to disguise the ply of material interest and ambition. More ever the British and communal historians attacked the notion of the composite culture.
>
> The Hindu communal view of history also relied on the myth that Indian society and culture had reached great, ideal heights inthe ancient period from which they fell into permanent and continuous decay during the medieval period because of 'Muslim' rule and domination. The basic contribution of the medieval period to the development of Indian economy and technology, religion and philosophy, arts and literature, culture and society, and fruits, vegetables and dress was denied.
>
> All this was seen by many contemporary observers. Gandhiji, for example, wrote: "Communal harmony could not be permanently established our country so long as highly distorted versions of history were taught in her schools and colleges, through the history textbooks." In addition, the communal view of history was spread widely through poetry, drama, historical novels and short stories, newspapers and popular magazines, children's magazines, pamphlets and, above all, orally through the public platform, classroom teaching, socialisation through the family and private conversation..(11)

تاریخ کی نو آبادیاتی تعبیر کا یہ سلسلہ صرف بیسویں صدی کا حصہ نہ تھا، بلکہ یہ پہلے سے چلا آتا تھا۔ اور نصابی کتب میں ہنوز قائم تھا۔ رام بابو سکسینہ کی کتاب میں یہ خیالات اس لیے حیرت اور تعجب کا باعث ہیں کہ ان کی یہ کتاب "ہندستانی اکیڈمی " الہ آباد سے چھپی جو کہ گاندھی جی کے لسانی تصور کی مبلغ تھی۔ اس کے باوجود دیسی اور بدیسی تفریق کا یہ تصور ان کے یہاں موجود رہا اور ولی کی زبان کو بھی انھوں نے دہلوی اثر سے ملوث قرار دے دیا حالانکہ کہ نئی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ولی کی تمام تر شاعری دہلوی اثر سے آزاد اور خود مکتفی طور پر وجود میں آئی۔ سکسینہ صاحب اردو رسم الخط کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ رسم الخط کی وجہ سے بہت سی لفظیات بآسانی استعمال کر لی جاتی ہیں۔

بچن سنگھ نے "ہندی ساہتیہ کا دوسرا اتیہاس " میں "اردو ہندی کی دوسری شیلی "کے عنوان ایک باب قائم کیا ہے۔ اس باب میں سب سے پہلے ولی کی شاعری کا ذکر ہوا ہے۔ ولی کے بارے میں وہ معلومات جو تذکروں سے ہوتی ہوئی ادبی تاریخوں میں درج ہوئیں، وہی معلومات یہاں بھی ملتی ہیں۔ ولی کی وفات کا سن بچن سنگھ ۱۷۰۷ء بتاتے ہیں۔ وہ اس تاریخ کو ترجیح دینے پر کیوں آمادہ ہوئے ؟اس سوال پر ان کے یہاں خاموشی ہے۔ (۱۲)

ہندی کی ادبی تاریخوں میں ایسی تاریخیں ولی پر قدرے مفصل بحث کرتی ہیں جو علاقائی تاریخ کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ تاریخیں یا علاقائی ادبی تاریخ کے زمرے میں آنے والے کتابیں ولی کا ذکر دکنی ہندی کے سیاق میں کرتی ہیں۔ زبان کی سطح پر اگرچہ وہ ولی کے ہندی کی فہرست استناد میں شامل کرتی ہیں لیکن نو آبادیاتی تصور تاریخ کے زیر اثر مقامیت، اصالت اور عدم اصالت کا نقطۂ نظر واضح شکل میں ان کے یہاں عمل پیرا نظر آتا ہے۔ راہل سانکرتیاین کا نقطۂ قدرے وسعت نظری کا ثبوت کا پیش کرتا ہے۔ "دکنی ہندی" کی اصطلاح جو کہ اس زبان کے دوناموں کا مجموعہ ہے، فی الواقع زبان کے حامیان کی لسانی توسیع پسندی کا غماز ہے۔

ولی اور ہندی تحقیق

ہندی میں ولی کا انتخاب ہندی پرنٹنگ پریس کوین روڈ دہلی سے دیوناگری میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں سن اشاعت درج نہیں ہے۔ ولی کی زندگی اور شاعری پر کسی راجیش نامی شخص کی تعارفی تحریر بھی شامل کتاب ہے۔ اس تعارفی تحریر میں ایسی معلومات درج ہیں جو عام کتابوں اور تاریخوں کا حصہ ہیں یعنی نئی تحقیق کا پہلو اس کتاب میں شامل تعارفی تحریر میں موجود نہیں ہے۔ تعارف کا عنوان ولی دکنی ہے۔ شاہ سعد اللہ گلشن کی روایت کا ذکر اس اضافے کے ساتھ ہے کہ انھوں نے ولی کو اصلاح زبان یعنی عربی فارسی الفاظ کے استعمال کا مشورہ دیا۔ گو اس بات کا کوئی معیار نہیں لیکن یہ ایک دلیل ولی کے سلسلے میں ہو گئی کہ شاہ سعد اللہ گلشن کا مشورہ اصلاح زبان یعنی زبان کو مفرس اور معرب بنانے کے لیے تھا۔ راجیش کے مطابق عشق مجازی ولی کی بنیادی آواز ہے۔ وہ ولی کے یہاں تصوف کی جھلک دیکھنے لیکن استغراق کے بجائے ان کے یہاں خارجی حسن کی کثرت سے وہ اسے صوفی ماننے سے باز رہتے ہیں۔ ولی کی زبان کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کی زبان ان عوامی زبان تھی اسی میں وہ شاعری کرتے تھے دلی سے متاثر ہو کر ان میں کچھ مشکل پسندی ضرور آگئی تھی اور درباری روش کی وجہ سے کچھ عربی فارسی بھی آ گیا تھا پھر بھی ان کی زبان کو کو ہم عصر عوامی زبان سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ برج اودھی اور سنسکرت کا اثر بھی ولی کے یہاں موجود ہے۔ ولی کو راجیش نے ابتدائی کوی کہا ہے۔ اس کا مطلب وہ مراد نہیں لیتے کہ ولی اردو کے پہلے شاعر ہیں۔ لیکن ولی نے اردو شاعری کو جو معیار و وقار دیا اسی وجہ سے وہ اردو شاعری کے باوا آدم کہے جاتے ہیں۔ ولی نے اپنے بعد کے جن شاعروں کو متاثر کیا، راجیش ان شاعروں کا نام بھی لیا ہے۔ (۱۳)

वलीऔरंगबादीकीकाव्यसधना: एकअध्ययन:

"ولی کی کاویہ سادھنا: ایک ادھین" کے عنوان سے عالیہ جانی میاں خاں پٹھان (سید) نے تحقیقی مقالہ ہندی میں قلم بند کیا ہے۔ یہ مقالہ سوریہ نارایرن سوبھے کی نگرانی میں لکھا گیا اور بابا صاحب امبیڈکر یونیورسٹی اورنگ آباد میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے جمع کیا گیا۔ یہ مبسوط مقالہ تین سو بیاسی صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ولی سے پہلے کی ادبی واجتماعی صورت حال کے ساتھ پہلے کیا دبی روایت، ولی کی ہم عصر ادبی واجتماعی دنیا کا جائزہ اپنی پس منظری گفتگو میں لیتا ہے۔ ولی کی زندگی شخصیت، ان کے جہان شعر، فنی طریقۂ کار، فکر و فلسفہ، ولی کے فن کی جمالیات اور دکنی شعری روایت میں ولی کے مقام و مرتبے کو زیر بحث لاتا ہے۔ اس مقالے کے مندرجات مجموعی طور پر اطمینان بخش نہیں کہے جاسکتے البتہ جس شرح و بسط سے مقالہ نگار نے ولی کی

شخصیت کو موضوع بحث بنایا ہے وہ پہلو قابل تحسین ضرور ہے کہ ہندی میں ولی پر یہ منفرد تفصیلی کام ہے۔ اس کام پر لسانی رسہ کشی کے اثرات بہت واضح ہیں۔ مقالہ نگار نے یہ بتایا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں یا اس کے تابع رہنے والے دکنی فرمانرواؤں نے تہذیبی وادبی ترقی کو جاری رکھا اور دکنیت کا تحفظ کیا۔ (۱۴)

سیاسی رسہ کشی کے اود اندرونی رسہ کشی کے ذکر میں مقالہ یہ بتاتی ہیں کہ ۱۹۶۷ میں جب شواجی حیدرآباد آئے تو ابوالحسن قطب شاہ نے ان سے سیاسی مہم کی خاطر مدد کا وعدہ کیا۔ (۱۵) گو کہ شواجی کی مہم کی اساس مذہب اساس قومیت نہیں بلکہ علاقہ اساس قومیت تھی جس میں اس علاقے کے تمام اہل اقتدار ایک رائے تھے اور ان کا مشترکہ مقصد ہندستان جیسی بیرونی طاقت کو ملک دکن سے کھڈیرنا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی نامناسب نہیں ہے کہ دکن اور ہندستان کے مابین رسہ کشی کا سلسلہ بہت پہلے سے چلا آتا تھا۔ اس لیے وہ بلا شرکت مذہب وملت علاقائی بنیاد پر اپنے دفاع کے لیے مجتمع اور متحد ہونے پر آمادہ ہوئے۔ یہاں یہ پہلو بھی دلچسپی اور اہمیت سے خالی نہیں کہ محمد شاہ بہمن (اول) کے زمانے میں گلبرگ کو مسلم تہذیب اور عربی فارسی کی تعلیم کا مرکز بنانے کی کوشش کی گئی۔ جو مسلمان شمال سے جنوب میں آکر بسے تھے وہ اپنے آپ کو دکنی اور ملکی کہتے تھے۔ دوسری طرف ایران، عراق اور عرب سے آنے والے مسلمان آفاقی کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ مقالہ نگار بتاتی ہیں کہ طبعی طور پر دکنی مسلمان مقامی ہندوؤں سے ملے جلے، اس طرح وہ قدیم تہذیب وثقافت سے آگاہ ہوئے۔ اس آگاہی کے نتیجے میں دکنی مسلمانوں اور آفاقی مسلمانوں کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ یہ کشمکش انتظامی امور تک محدود نہ تھی بلکہ روزمرہ زندگی اور تہذیبی امور کو محیط تھی۔ عالیہ آگے بتاتی ہیں کہ محمد بہمنی ثانی نے گل برگہ کو تہذیبی مرکز بنا کر دہلی کو نیچا دکھانے کی کوشش کی لیکن اس کے نائب نے سیاسی اغراض کے لیے اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور دکنی طبقے کو ترجیح دینے پر آمادہ ہوا (۱۶) یہاں چند باتیں محل نظر ہیں۔ دکنی اور آفاقیکی جو نسبتیں یہاں بیان ہوئیں، ان کی رو سے دکنی تو پہلے سے مقامی تھے اور مقامی ہونے کی حیثیت سے وہ یہاں کی قدیم تہذیب وتمدن سے بھی آگاہ رہے ہوں گے، اس لیے ہندوؤں کے میل جول سے مقامی رنگ میں قدیم تہذیبی شعور میں رنگتے گئے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ جب بیرونی افراد کو ترجیح دی جانے لگی تو اس کا رد عمل یقیناً مقامی لوگوں میں پیدا ہوا ہو گا اور نظر انداز کیے جانے پر وہ مقامی لوگوں کی طرف رجوع ہوئے ہوں گے، اس لیے اسے سیاسی حصہ داری اور انتظامیشراکت سے محروم ہونے کی نفسیات سے مربوط کیا جانا چاہیے ورنہ ان کے مقامی ہونے کو مشکوک قرار دیا جانا چاہیے، جب وہ مقامی تھے تو مقامی کلچر و تہذیب سیکھنے کیا معنی اور اس زمانے میں قدیم کلچر اور جدید کلچر کے

معنی بھی اس قدر واضح نہ ہوئے تھے کہ یہ تصور نو آبادیاتی نظام کا پیدہ کردہ ہے، مذہب اجتماعی زندگی میں ایک زندہ روح کی طرح جاری وساری تھا، اس لیے وہ ہر طرح جاری وساری تھا۔ اس کلچر کا ہر فرد چاہے وہ عامی ہو یا خاص اسے اپنے ہمسایوں سے قدیم تہذیب سیکھنے کی حاجت کیا رہی ہوگی کہ جس چیز کو یہاں قدیم مراد لیا جائے گا وہ اجتماعی زندگی کا حصہ ہونے کی وجہ سے اپنی قدامت کو قائم کرنے میں کامیاب نہ تھی۔ اس لیے قدیم تہذیب کا تصور اور اس سے دکنیوں کیییگانگت اور مانوسیت کی باتیں محل غور معلوم ہوتی ہیں۔

دکنی شاعری کی ایک خصوصیتیہ بھی ہے کہ اس عہد میں قصہ اساس شاعری زیادہ رائج رہی اور اسی میں زیادہ سے زیادہ ادب تخلیق کیا گیا۔ ایسی صنف (مثلاً غزل، قطعہ اور رباعی) جو محض مضمون وخیال پر اکتفا کرکے مربوط دو چار مصرعوں میں معنی بندی کا عمل انجام دے، غالب صنف سخن کی حیثیت سے دکنی شاعری میں موجود نہ تھی اور ایسا بھی نہیں کہ بالکل ناپید تھی۔ دکنی شاعری میں مثنوی کو ایک غالب صنف سخن کا درجہ ضرور حاصل تھا۔ عالیہ صنف مثنوی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ

> मसनवी क़ाफिया और रदीफ के बंधनों से मुक्त होने के कारण इस के विविध विषयों का वर्णन सहजता और जोर व जोश के साथ किया जा सकता है। ये विषय जैसे दर्शन, अखलाक , ईश्को -मोहबब्त, सवानेह, मनाज़िरे क़ुदरत,इतिहास आदि। (17)

ترجمہ

> مثنوی" قافیہ اور ردیف کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی وجہ سے متنوع موضوعات کو سلیقے سے زور بیان اور جوش کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے۔ یہ موضوع جیسے فلسفہ اخلاق، عشق و محبت، سوانح، مناظر قدرت، تاریخ وغیرہ۔

یہاں ردیف و قافیے سے مثنوی کے آزاد ہونے کی بات پوری طرح درست معلوم نہیں ہوتی۔ مثنوی کا ہر مصرعہ ہم وزن و ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اور ہر شعر پر یہ قافیے بدل جاتے ہیں۔ پوری مثنوی میں ایک قافیہ کو نبھانے کی پابندی نہیں ہوتی۔ لیکن ہم اس سہولت اور آسانی کو قافیہ کے بندھن سے آزاد ہونا نہیں کہہ سکتے۔

مقالہ نگار نے ولی سے پہلے کی شاعری میں مروج مضامین کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ عشقیہ، رزمیہ، تاریخی، اخلاقی، معاشرتی، مناظر قدرت، صوفیانہ مضامین وغیرہ سے متعلق شاعری۔ ساتھ ہی قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ۔ ولی سے پہلے کی دکنی شاعری کے ساتھ

ان سے پہلے کے ہندی ادب کا بھی طائرانہ جائزہ لیا ہے۔ ولی کے ہم عصر ہندی شاعروں میں گھنانند، بودھا، دیو، وغیرہ کا تعارف کرایا ہے۔

ولی پر شاعری کا ایک اہم موڑ ہیں اور اس موڑ پر زبان کی سلاست اور روانی اپنی مطلوب جنس پالیتی ہے اور صحیح معنوں میں مختلف تہذیبوں کا ادغام ولی کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اسے ہم ہند ایرانی ادبی روایت کا حسین امتزاج اور ان دونوں روایتوں کے بہترین صوتی، معنوی و صوری محاسن کا امتزاج بھی کہہ سکتے ہیں۔ نو آبادیاتی شعور نے لفظ اور طرز اظہار میں اجنبیت کے تشخص کا جو پیمانہ ہم ہندیوں کو دیا، اس کی رو سے فارسی اور عربی کی لفظیات شاعری میں معیوب قرار پائیں۔ ہند ایرانی روایتوں کا امتزاج قابل نفریں خیال کیا گیا۔ اچھے سے اچھا شہ پارہ محض پنیلفظیات کی وجہ سے عیب دار قرار پایا۔ ہندی کے ادبی معاشرے میں یہ طرز فکر ایک عام وبا کی صورت حال پھیلا ہوا ہے۔ زیر بحث مقالہ بھی اس صورت حال سے خالی نہیں ہے:

> वली औरंगाबादी की दिल्ली की यात्रा कर के लौटने के बाद जहां दिल्ली के कवि और गरंथकारों ने फारसी को छोड़ कर हिंदी या रेखता में लिखना शुरू किया, वहां दक्खिन में भी ज़बान का मानक निखरने लगा और साथ ही साथ स्वदेशी शब्दों का बहिष्कार और फारसी अरबी शब्दों की भर्ती आरंभ हुई। दिल्ली से लेनदेन आना जाना १७ सदी के मध्य से ही चल पड़ा था।(18)

ترجمہ

> ولی اورنگ آبادی کے سفر دہلی سے لوٹنے کے بعد جہاں دہلی کے شاعر اور صاحب دیوان (لکھنے والوں) نے فارسی کو چھوڑ کر ریختہ میں لکھنا شروع کیا، وہاں دکن میں بھی زبان کا معیار نکھرنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ دیسی لفظوں کا اخراج اور عربی فارسی الفاظ کا داخلہ شروع ہوا۔ دہلی سے لین دین، آنا جانا ستر ہویں صدی کے وسط سے ہی جاری ہو گیا تھا۔

زبان کی تنقیح اور صفائی کا یہ تصور جس قدر زور و شور سے پیش کیا جاتا ہے کیا واقعی اس کیبھی صورت ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ ہم ولی کی زبان اور محاورے کو دیکھتے ہیں تو اس میں لسانی ارتقاء کا عمل صاف محسوس ہوتا ہے۔ دکنی کے پورے سرمایۂ ادب میں عربیفارسی لفظیات کا انکار ممکن نہیں بلکہ ان کا وجود تو کافی مقدار میں اودھی، برج، مراٹھی اور گجراتی زبانوں میں ہے۔ دکنی میں تو روایتوں کا تفاعل جاری تھا۔ "دکنی ہندی" کے ہندی مؤرخین نے اس پہلو کی شکایت بھی کی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ولیا دہلوی شعراء کے یہاں اسی وصف کو جو کہ شاعریمیں پہلے میں موجود تھا، اس شد و مد کے ساتھ نمایاں کیا گیا گویا کہ زبان کی ساتھ کوئی ناروا سلوک انجام پایا ہو جو پہلے نہیں ہوا تھا۔ اس رد عمل کے وجوہ کا جاننا ضروری ہے۔ "جدید ہندی" نے اپنی لسانی اساس کھڑی بولی پر رکھی جس پر اردو پہلے سے قائم تھی۔ اس نے اپنی شناخت کو قائم اور اردو کے مقابلے میں اپنی پوزیشن کو مستحکم

کرنے کے لیے دو طریقے لفظ کی سطح پر اختیار کیے۔ پہلے تو یہ کیا کہ بہت سے ریختہ لفظوں کو جن میں ادائے معانی کی سہولت تھی، وہ عام فہم اور رائج تھے، انھیں ترک کیا۔ عربی فارسی کے جو الفاظ محاورے میں تھے، انھیں بھی باہر کا راستہ دکھایا اور زبان میں اصیل الفاظ داخل کیے، اس طرح ان کا مطلوب محاورہ وضع ہوا، جس سے زبان کی شناخت قائم ہوئی۔ یہی شناخت اپنی رقیب زبان کے سامنے لائی گئی کہ اس نے اس نئی ڈگر پر چلنے سے انکار کیا تھا۔ سو اصلاح زبان کا اعادہ اس روش تنقید کو دو طرح کے فائدے پہنچاتا ہے۔ ایک تو وہ رائج زبان کو جلاب دے کر اصیل بنانے کا جواز پاتے ہیں، دوسرے اردو کے مقابلے میں ہندی کے استحقاق کو ثابت کرنے اور اردو کو غیر ملکی عناصر سے مملو باور کرا کے اپنے حلقے میں قابل نفریں بنانے کا ہدف حاصل کرتے ہیں۔

عالیہ ولی کو دکنی شاعری میں بلند مقام دیتی ہیں۔ وہ انھیں طبقۂ اول کا شاعر مانتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ انھیں ایک کارنامے کا حامل بتاتی ہیں کہ ولی نے دکنی ادب کے عام، آسان اور فطری دھارے کو زبان اردوئے معلیٰ کی مہذب لہر میں غرقاب کر دیا۔ وہ شمالی ہند میں اردو چراغ کو ولی سے منسوب کرتی ہیں کہ وہ انھیں کی وجہ سے جلے لیکن دکنی زبان کے شاعر اس شمع کی روشنی میں پتنگوں کی طرح جل گئے۔ یہاں جو باتیں محل نظر ہیں وہ یہ کہ ولی نے جس اردوئے معلیٰ کی لہر میں دکنی روایت کو غرقاب کیا، وہ لہر کہاں بنی اور کیسے بنی؟ اور پھر دکن میں کیا ولی کے بعد اچھے شاعر نہ ہوئے؟ عزلت اور سراج واضح طور پر اس کی نفی کرتے ہیں۔ دکن یا اورنگ آباد کی محفل کیوں دیرپا ثابت نہ ہوئی، اس کے وجوہ ادبی سے زیادہ اجتماعی ہیں۔ ولی کے سخن نے اہل دہلی پر جو نفسیاتی اثر ڈالا، اہل دہلی نے اس کے تدارک کی سبیل بڑی تیزی سے کی، وہ بہت جلد ولی کے رنگ سخن کو لے اڑے۔ اور ایک اہم سوال مرکزیت کا بھی ہے۔ اورنگ آباد کی جس فضا میں ولی کا طلوع وغروب ہوا، (نئی تحقیق ولی اور اورنگ زیب کی موت میں زیادہ فاصلہ نہیں رکھتی کہ وہ موت میں ہم سن ہیں) کیا بعد والوں کے لیے اس کی وہی اہمیت باقی رہی؟ اس کا جواب نفی میں ہے تو ولی کو ادبی زبان میں آسان روایت کو غرقاب کرنے کا الزام بھی بے جا معلوم ہوتا ہے۔ لسانی ارتقا اور اجتماعی تغیر یہی دو پہلو ایسے ہیں جہاں اس تغیر کے اسباب تلاش کیے جانے چاہئیں۔

عالیہ نے اس تحقیقی کام کے دوسرے باب میں ولی کی زندگی کے شخصی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔ جیسا کہ باب اول میں میں بتا آئی ہوں کہ ولی کے نام، ولادت، تاریخ وفات اور جائزے رحلت وغیرہ میں کسی پر بھی محققین کا اتفاق نہیں ہے۔ جتنی باتیں اس سلسلے میں کہی گئی ہیں سب کی سب قیاسی ہیں اور ایسے دلائل پر مبنی ہیں جو ٹھوس معلومات فراہم کرنے اور یقینی تاریخ ومقام کو

متعین کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ عالیہ نے مختلف تذکروں اور کتابوں میں پھیلی ہوئی معلومات اور اختلاف کو درج کرنے کے بعد کسی ایک معروف رائے سے اتفاق کیا ہے۔ نام کے سلسلے میں وہ ولی اورنگ آبادی کو ہی مناسب خیال کرتی ہیں۔(۱۹) جائے ولادت اورنگ آباد بتاتی ہیں،اس کے حق دلیلیہ دی ہے کہ کیو کہ ولی نے بھی دکنی ہونے کا فخریہ اظہار کیا ہے۔(۲۰) تاریخ ولادت ۱۶۶۸اور تاریخ وفات ۱۷۴۴کو درست قرار دیا ہے۔(۲۱)تعلیم،اسفار، تلامذہ واحباب کے بارے میں معلومات یکجائی ہیں۔عالیہ ایک مقام ایسی بات لکھتی ہیں جو ان کے پہلے کے لکھے کو مسترد کرتی ہے۔ کہتی ہیں :

दक्खिनी हिन्दी-उर्दू में सर्वप्रथाम दिवान प्रस्तुत करने वाले पहले कवि वली औरंगाबादी ही थे। वली ने उर्दू में हिन्दी की ऐसी सुदृढ नींव डाली कि आज तक इसमें अल्पता भी परिवर्तन नहीं हो सका। इनके पूर्व के अधिकांश कवियों के कलाम में अधिकतर फ़ारसी का प्रभाव दिखाई देता था, मगर वली ने फारसी की जगह हिन्दी उर्दू को अधिक महत्व दिया। इनके कलाम में स्थान स्थान पर हिन्दी तथा दक्खिनी शब्द अंगूठी पर नगीने की तरह जड़े गए हैं। वैसे प्रायः प्रत्येक काव्य प्रकार में वली ने अपनी लेखनी का कमाल बताया है। किंतु आधिक्य ग़ज़ल का ही है। वे ग़ज़ल के सम्राट थे।(22)

ترجمہ:

ہندی اردو میں سب سے پہلے دیوان پیش کرنے والے پہلے کوی ولی اورنگ آبادی تھے۔ ولی نے اردو میں ہندی کی ایسی مضبوط بنیاد ڈالی کہ آج تک میں اس میں ذرا سی تبدیلی تبدیلی نہیں ہو سکی۔ ان سے پہلے کے بیشتر شاعروں پر فارسی کا اثر دکھائی دیتا تھا مگر ولی نے فارسی جگہ ہندی اردو کو زیادہ اہمیت دی۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ پر ہندی اور دکنی الفاظ انگوٹھی پر نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ یوں تو ولی نے ہر صنف شاعری میں اپنی قلم کاری (طباعی) کا کمال دکھایا ہے۔ لیکن زیادہ تر حصہ غزل کا ہے۔ وہ غزل کے شہنشاہ تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ولی غزل کے شہنشاہ ہیں اور اردو غزل ان کے بغیر متصور نہیں لیکن جس ہندی زبان اور دکنی رنگ کو ان سے متصف اور خاص کر کے ان کے اسلاف شعراء کو الزام دیا گیا ہے کہ ان کے یہاں فارسی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ بات قرین انصاف نہیں ہے۔ عربی فارسی لفظیات کا ذکر جس نفسیات کے تحت ہوا ہے اس کے بارے میں پیچھے گفتگو ہو چکی ہے اور جس وصف کو عیب جان کر ولی کو اس سے پاک کرنے کا تحقیق کار انتظام کیا ہے وہ وصف نہ تو عیب ہے اور نہ ہی ولی کے یہاں ناپید ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ولی نے شاعری کی دو عظیم روایتوں میں ایسا حسین، متوازن اور نادر امتزاج پیدا کیا ہے کہ دو روایتیں ایک ہو گئی ہیں۔ اسی روایت کا نام اردو ہے۔ دکنی اور ہندی الفاظ کا ولی کے یہاں التزام دکھا کر یہ ہر گز ممکن نہیں کہ انھیں ہندی روایت کا شاعر باور کرانے میں کامیابی حاصل کی جائے۔ یہ بات تو پہلے باب میں ہیاپنا استرداد رکھتی ہے کہ ولی وجہ سے دکنی روایتکے سوتے خشک ہو گئے اور شمالی ہند کی طرف رخ مڑا اور ولی نے جو وضع شاعری کی نکالیبھولی کی وجہ سے ہوا۔

شاعری کے اوصاف شعر سے بر آمد کیے جاتے ہیں اور اس کی خوبیاں شعر کی طرز تعمیر میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ کلیدی الفاظ، مصرعوں کا ربط، مضمون کو ادا کرکے لیے استعمال میں لائی گئی رسومیاتیہ وہ چیزیں ہیں جو شعر کے مقام اور مرتبے کو متعین کرتی ہیں۔ تخلیق نہ تو تخلیق کار کی شخصیت کو پوری طرح سمجھنے میں معاون ہے اور نہ ہی شخصیت شاعری کو سمجھانے اور اس کے فنی حسن کو نمایاں کرنے میں مفید ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ قاری تخلیق کی مدد سے شاعر کے فنی طریقۂ کار اور اس کے تخئیلی مدارج اور منطقوں تک رسائی حاصل کرلیتا ہے اور کلام کی طرز تعمیر میں کارفرما اس کی ترجیحی فنی تدابیر تک پہنچ جاتا ہے۔ شاعر یا تخلیقکار کی شخصیت کا پرتو اس کی تخلیق میں تلاش کرنا اور اس کی مدد سے شخصیت کی اہمیت اور فن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ایک مناسب ادبی طریقۂ کار نہیں کہاجاسکتا۔ عالیہ فنی قدر کی تعیین میں اسی گمراہ کن طریقے کو اختیار کرتی ہیں۔ کہتی ہیں:

> ।। अब यह मालूम करेंगे कि वली की इस महानता का रहस्य क्या है ? मीर, गालीब और इकबाल केवल नफ्स शेर लिखनेवालों में से नहीं। बल्कि इनका कलाम इनके व्यक्तित्व का दर्पण है। वली के कलाम में भी यह गुण पाया जाता है। उनका प्रत्येक शेर उनके स्वभाव एवं व्यक्तित्व का दर्पण है। यहाँ व्यक्तित्व से तात्पर्य विचार, भाव, आदि से भी है। जो शायद अपने अधिक-से अधिक भावों को, विचारों को कविता के माध्यम से प्रकट करेगा उसका व्यक्तित्व उतना ही अधिक उभर कर स्पष्ट होता जाता है।-
>
> ज़ौक़ आतश, नासिख़ आदि ने अपने व्यक्तित्व की तस्वीर प्रस्तुत नहीं की बल्कि बाहरी परिवर्तन प्रभाव को ही अपनी शायरी के माध्यम से प्रस्तुत करने में प्रवीणता प्राप्त करने का प्रयत्न किया, इसलिए इनके कलाम से सामान्य मनुष्य को कोई लाभ नहीं पहुंचा। इसके बिल्कुल विपरित वली ने ग़ालिब आदि की तरह अपने काव्य में व्यक्तिगत उपमेयों को बहुत ही सुंदरता के साथ प्रस्तुत किया ।(23)

ترجمہ:

> اب یہ معلوم کریں گے کہ ولی کی اس عظمت کا راز کیا ہے؟ میر،غالب اور اقبال محض نفس شعر لکھنے والے نہیں؛بلکہ ان کا کلام ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ ولی کے کلام میں بھئ یہ وصف پایاجاتا ہے۔ ان کا ہر ایک شعر ان کے برتاواور شخصیت کا آئینہ ہے۔ یہاں شخصیت سے مراد نظریہ،جذبہ وغیرہ سے بھی ہے۔ جو شاید اپنے زیادہ سے زیادہ جذبات کو،نظریات کو شاعری کے ذریعے ظاہر کرے گا اس کی شخصیت اتنی ہی زیادہ ابھر واضح ہوجاتی ہے۔
>
> ذوق، آتش،ناسخ وغیرہ نے اپنی شخصیت کی تصویر پیش نہیں کی بلکہ باہری تبدیلی کے اثر کو ہی اپنی شاعری کے ذریعے سے پیش کرنے میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی،اس لیے ان کے کلام سے عام آدمی کو فائدہ نہیں پہنچا۔ اس کے بالکل برخلاف ولی نے غالب وغیرہ کی طرح اپنی شاعری میں شخصی تشبیہات کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

عالیہ نے جس طرح ولی کی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے اساطین شعراء کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور لکھنوی اسکول کے عظیم شعراء کے سلسلے میں چلتی ہوئی رائے (جو کہ ادب کے نو آبادیاتی تصور سے اخذ کی ہوئی اردو دانوں کی رائے ہے) چپا کیہے؛اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نو آبادیاتی تصور ادب کس حد تک ہمارا تعاقب کرتا ہے ۔ چونکہ اس تصور ادب میں ادب شخصیت سازی کا کام انجام دیتا ہے بلکہ اسی نوع کا ادب جو کسی نہ کسی ناحیے سے فائدہ مند ہو،وہی اچھے ادب کے زمرے میں رکھے جانے کے لائق ہے ۔ سو تحقیق کار یہ خیالکہ اس قدر روشن خیالات اور معنی آفریں تخلیقی اظہارات شخصیت سے ہی نکل کر سامنے آئے ہیں،اس لیے یہ ساری خوبیاں اس میں ہوں گی ۔ ذوق آتش اور ناسخ نے اپنی شخصیت کی تصویر پیش نہیں کی،اس لیے ان کے یہاں خارجیت پیدا ہو گئی ۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں کے اوائل تک رائج رہنے والے ادبی تصورات وہیں تک محدود نہیں رہے بلکہ انھوں نے بیسویں کے اواخر تک ذہن کا پیچھا کیا اور یہ اقتباس اس کی عبرت ناک مثال ہے ۔ ولی کے رنگین مضامین اس لیے خوب ہیں کہ ان میں ولی نے حقیقی ذاتی واردات کو قلم بند کیا ۔ انھیں زندگی کے فلسفے سے لگاؤ تھا بہت ہی لگاؤ تھا اس لیے زندگی کے چھوٹے چھوٹے طنز اور رازوں کی تفصیل سے تفسیر کی ۔ گو ولی کی شاعری ولی کی شخصیت کا عکس ہے ۔ اس مقالے میں فنی پیمانے پر بھی ولی کو دیکھنے اور جاننے کی سعی کی گئی ہے لیکنیہاں جس زایے ولی کی تحسین شناسی کی گئی ہے وہ فنی مطالعے سے میل نہیں کھاتی ۔

عالیہ ولی کے جہان شعر کا جائزہ لیتے وقت ان کے یہاں موجود جملہ اصناف پر نظر کرتی ہیں اور وہ جس جس انداز میں یا جس ہیئت میں شعر کہتے تھے ان تمام ہیئتوں کا تعارف کرایا ہے ۔ غزل،قصیدہ،رباعی،مخمس،مثلث وغیرہ میں ولی نے جو تخلیقات پیش کی ہیں؛ان کا جائزہ لیا ہے ۔

ولی کا فن شعر بھی اس مقالے میں موضوع بنایا گیا ہے ۔ ولی کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے مقالہ نگار نے یہ بتایا ہے کہ ولی نے نہ صرف اپنے عہد کے خیالات اور رسوم کو اپنی شاعری میں جگہ دی بلکہ بیان کی شیرینی اور زبان کی تخلیقیت بھی بطور افتخار دکھائی ہیں کہ اسی وصف ولی کی کرشمہ سازی کا راز پوشیدہ ہے ۔

ادب کے ترقی پسندی اور اصلاحی اسکولوں کے زیر اثر ہمارے یہاں ہندی اور اردو دونوں جگہوں پر یہ بات چلن میں آئی کہ تخلیق کار کی تخلیقی سرگرمی اور ادبی سرمائے کو اس کی ذاتی زندگی سے مربوط کر کے دیکھا گیا ۔ اس طرح ایک ثنوی عمل متن پارے کی تفہیم میں جاری ہوا کہ بسا اوقات شاعر کی زندگی سے شاعری کی تعبیر و تفہیم کا کام انجام دینے کی کوشش ہوئی تو کبھی شاعری

میں شاعر کے احوال زندگی تلاش کیے گئے۔ جیسا کہ اب یہ بات سبھی جانتے اور مانتے ہیں کہ ادب یا شاعری زندگی کا راست اظہار نہیں کہ اسے سوانح یا تاریخ کی طرح زندگی کا نمائندہ مان لیا جائے۔ اظہار کی سطح پر انسانی زندگی ہی مواد فراہم کرتی ہے اور یہ مواد تخیل کی گزرگاہ سے ہوتے تقلیب کے عمل سے گزرتا ہے اور یہی تقلیب کا عمل ادبی متن کی حقیقت کو زندگی کی حقیقت سے الگ اور علاحدہ شناخت عطا کرتا ہے۔ اس لیے ہم تاریخ گوئیا تلمیح سے کچھ معاون حقائق ضرور حاصل کر سکتے ہیں لیکن اس سے ہم تخلیق کار کی شخصی ترجیحات واخلاقیات کا تعین نہیں کر سکتے۔ ادب کی دنیا ہماری دنیا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خود مکتفی وجود بھی رکھتی ہے،اس میں صنف، ہیئت اور مضامین کے اپنے حدود ہیں۔ یہ حدیں متن کو خاص تخلیقی وضع کا پابند بھی کرتی ہیں اس لیے ادب زندگی کی جوں کی توں نمائیندگی نہیں کر سکتا۔ ادب ہی کیا علم کا کوئی شعبہ زندگی کی صد فیصد نمائندگی کا دعویٰ اس لیے نہیں کر سکتا کہ انسانی ادراک کی اپنی حدود اور دائرے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی اپنی ترجیح بھی ہے جو وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے متن کو زندگی کا ہو بہو آئینہ سمجھنا یا متن بنانے والی کی زندگی اور شعور کے بارے میں اسے اساسی متن کے طور پر استعمال کرنا مناسب ادبی رویہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ یہاں اسی رویے کو جاری وساری دیکھتے ہیں۔ مقالہ نگار ولی کی شاعری میں ان کے کردار و عمل کا واضح طور پر دیکھتی ہیں۔ ولی کی اہلیت، علمیت، اعلیٰ خیالات اور وسیع النظری میں صوفیانہ سلوک شامل تھا۔ صوفی طبیعت کے ولی بقول عالیہ تصوف کے نظریے کو اپنی زندگی اور رویے میں نہ شامل کیا بلکہ اس کا تخلیقی سطح پر اظہار بھی کیا۔ (۲۴) عالیہ ولی کے متن سے یہ نتیجہ بھی اخذ کرتی ہیں کہ ولی مختلف مذہب میں ہم آہنگی اور اتحاد ولی کی دلی خواہش تھی۔ مختلف مذاہب کے لوگوں کو ساتھ مل جل رہتے دیکھ کر ولی کو سچی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ وہ اپنی شاعری میں ہندو مسلم اتحاد کا اظہار کرتے ہیں۔(۲۵)عالیہ مبالغہ آمیز انداز میں ولی کے یہاں صد فیصد ہندستانیت کا اثبات کرتی ہیں اس اور دکنی ہندی کے پرانے و نئے شاعروں میں اس وصف میں کسی کو ولی کا ہم پلہ نہیں پاتی ہیں۔ کیوں کہ ولی نے مختلف ہندستانی مدرسہائے فکر کے شاعروں اور بیانیوں کو جی کھول کر برتا ہے۔ (۲۶)یہاں ہمیں یہ بات بھی پڑھنے کو ملتی ہے کہ ولی کے ہم عصر شاعروں کے یہاں فارسی کا زیادہ اثر تھا۔ ولی صوفی تھے یا نہیں تھے اور ان کی ذاتی زندگی میں تصوف کا کس حد تک عمل دخل تھا،اس بات کے قوی دستاویزی ثبوت اب تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں،اس لیے ان کے شعری اظہار میں نظم کیے گئے مضامین کی بنیاد پر انھیں صوفی خیال کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں تصوف اور بھکتی کے مضامین نے شعری دنیا میں خود کو اتنا پختہ اور مستحکم کر لیا تھا کہ شعراء ان مضامین کو برتنا کمال خیال کرتے تھے اور ایک طرح یہ وصف شعری

مضامین میں بطور فیشن داخل ہو گیا تھا،اس لیے کسی بھی شاعر کے خیال کو اس کا عمل قرار دینا غیر محتاط رویہ ہے،جب ہمیں تخلیقی متن کے باہر کوئی ایسی مضبوط دلیل ہاتھ نہ آئے،اس وقت تک شعری خیال کو فن کی دنیا تک محدود رکھنا چاہیے۔

ولی کے فن میں فلسفے کی نشان دہی اس طرح کی گئی ہے کہ ولی نے اپنے فن میں فلسفے کی آمیزش صناعانہ انداز میں کی ہے۔ ولی کے یہاں نفس موضوع تعقل کے دائرہ سے باہر نہیں جاتا بلکہ عام انسانی رویے سے بہت ہی قریبی تعلق رکھتا ہے۔ ولی کی شاعری میں لطیف خیال کی پرواز ایسی ہے جس کی نرمی،شیرینی ہر ایک کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ شاعر اپنی ملائم و حسین لطافت خیال سے شاعری میں ایسی ساحری بھر دیتا ہے کہ قاری مدہوش ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ جمال،ملائمت،لطافت خیال کے ساتھ ہی ولی کے شعری جہان میں جذبے کی گہرائیاں ہیں۔ (۲۷)ولی کی شاعری میں ہم عصر سماجی نظام کی عکاسی کا سوال بھی زیر بحث آیا ہے کہ ولی کی شاعری میں مخصوص طبقے کا ذکر ہے لیکن مکمل سماج کی عکاسی ناپید ہے۔ اس عہد کے عام آدمی کی نفسیات اور مسائل ولی کی شاعری میں موجود نہیں ہیں۔ عورتوں کے مسائل بھی ولی کی شاعری میں موجود نہیں ہیں۔ عالیہ لکھتی ہیں:

> वली के काव्य में तत्कालीन सामाजिक व्यवस्था का चित्रण किस सीमा तक मिलता है ? वली के काव्य में विशिष्ट वर्ग का चित्रण मिलता है अथवा संपूर्ण समाज का १ इत प्रश्न का उत्तर मी नकारात्मक है। उस काल के सामान्य व्यक्ति की मानसिकता का, उसकी मजबूरी का, उसकी दैन्यावस्था का, गरीबी का, स्त्रियों की समस्याओं का चित्रण वली के काव्य में नहीं के बराबर है। इस दृष्टि से वली दक्खिनी काव्य परंपरा तक को निबाह नहीं पाए हैं। मिरॉजी, फिरोज बीदरी, अब्दुल और मिरा हाशमी के दक्खिनी काव्य में स्थानिक रंग बहुत हैं। अमीर खुसरो की तरह विभिन्न स्थितियों मनोदशाओं, खेत खालिहानों का चित्रण दक्खिनी परंपरा की बहुत बड़ी ताकत रही। परंतु वली में इसका अभाव है।
>
> डॉ. श्रीराम शर्मा इस मत से पूर्णतः सहमत हैं कि दक्खिनी के कवि यथार्थवादी थे, वली यथार्थ से मुँह मोड़कर कल्पना की दुनिया में ओ जाते हैं। वे विशुद्ध रूप से श्रंगार के कवि हैं। यह श्रंगार भी विशिष्ट वर्ग का है। थोड़ी बहुत अध्यात्मिकता है, ठीक रीतिकालिन कवियों की तरह(28)

ولی کی شاعری میں ہم عصر معاشرتی نظام کی عکاسی کس حد تک ملتی ہے؟ولی کی شاعری ایک مخصوص طبقے یا پورے معاشرے کی عکاسی کرتی ہے۔ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ ولی کی شاعری میں اس دور کے عام آدمی کی ذہنیت،اس کی بے بسی،اس کی غربت،عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس نقطہ نظر سے ولی دکن کی شاعرانہ روایت کو بھی برقرار نہیں رکھ سکے۔ میراں جی،فیروز بیدری،عبدل اور میراں ہاشمی کی دکنی شاعری میں بہت سے مقامی رنگ ہیں۔ امیر خسرو کی طرح مختلف حالات،مزاج، کھیتوں اور کھلیانوں کی عکاسی دکن کی روایت کی ایک بڑی طاقت رہی۔ لیکن ولیکے یہاں اس کی کمی ہے۔

ڈاکٹر شری رام شرما اس خیال سے پوری طرح متفق ہیں کہ دکن کے شاعر حقیقت پسند تھے،ولی حقیقت سے منہ موڑ کر تخیل کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ وہ خالصتاً جمال کا شاعر ہے۔ یہ زینت بھی ایک خاص زمرے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں تھوڑی بہت

روحانیت ہے، بالکل رسمی شاعروں کی طرح۔ ولی کی شاعری میں حقیقت نگاری کی جستجو دو وجہوں سے نامعقول معلوم ہوتی ہے۔ اردو اور ہندی دونوں میں حقیقت نگاری بہت بعد میں شروع ہوئی۔ حقیقت نگاری کی روبیسویں صدی کا واقعہ ہے اور ولی کی شاعری سترہویں صدی کے مکمل ہوتے ہوتے اپنے نبوغ اور کمال کو پہنچ گئی تھی۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کی تنقید اگر ولی سے حقیقت نگاری کا تقاضا کرتی یا اس وصف کے ان کے یہاں ناپید ہونے کی شکایت کرتی ہے تو یہ ولی کی شاعری کو دائرۂ سوال لانے کی بجائے تنقید نگار کے فہم اور طریقۂ رسائی پر ایک سوال ہے۔ دکنی کی جس روایت سے ولی پر نباہ نہ کرنے کی بات کہی گئی اور جن شاعروں کا نام لیا گیا، ان کی تخلیقات کا صنفی دائرہ بھی پیش نظر ہونا چاہیے۔ مثنوی کی صنف سخن صراحت و وضاحت اور ربط کلام کی جو صورتیں اپنے اندر رکھتی ہے، اس کے ذریعہ اشیاء، احوال اور اشخاص کی تصویر کشی اور عمل کے تطابق و تخالف سے انسانی زندگی کی عکاسی کا امکان زیادہ ہے۔ ولی نے جس صنف سخن سے زیادہ سے زیادہ معاملہ کیا، وہ غزل ہے۔ غزل صراحت و وضاحت کے اس طور کی پابندی ہی نہیں کرتی۔ غزل کے صنفی تقاضے اور اہداف کچھ اور ہیں۔ اس مختصر سے دائرے میں رہتے ہوئے ولی جس جمال پرست اور انسان دوست متصوفانہ و عالمانہ طرز اظہار کو خلاقانہ سطح پر کامیاب بنایا، وہ اپنے آپ میں معجزۂ فن کی نمود کہے جانے کے لائق ہے۔ غزل کی رسومیات سے عدم آگہی اور بے توجہی نے اس نوع کے نتائج پیدا کیے۔ ولی جمال کے شاعر ہیں لیکن محض جمال کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کے یہاں واردات اور کیفیتوں کے بیان میں تنوع ہے۔ متصوفانہ اور عام انسانی سروکار کا اظہار بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ ولی کو غزل کی شعریات اور مجموعی رسومیات کے سیاق میں ہی پڑھا جانا ممکن ہے۔

ڈاکٹر امبا شنکر ناگر اور پروفیسر عالم بخش شیخ نے ”گجرات کی ہندستانی کاویہ دھارا“ کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس کتاب نام سے ہی یہ بات واضح ہے کہ اس میں گجرات کے شاعروں کا تذکرہ ہے۔ ولی کا ذکر اس کتاب میں بطور گجراتی شاعر ہی آیا ہے:

> उर्दू शायरी के बाबा आदम वली मुहम्मद 'वली' गुजराती नाम से मशहूर हैं। उनका निवासस्थान अहमदाबाद (गुजरात) था। वली फ़ारसी-अरबी के विद्वान थे। वे अहमदाबाद से सूरत, औरंगाबाद और दिल्ली गए, इसलिए उनकी शायरी में गूजरी, दकनी और दहलवी- तीनों रंग मिलते हैं। कहा जाता है कि उनकी मृत्यु १७०७ ई० में अहमदाबाद में हुई। अहमदाबाद में शाहीबाग अंडरब्रिज के नुक्कड़ पर उनका मज़ार है, जो नीली गुम्बद नाम से मशहूर है।
>
> वली का काव्य संग्रह फ्रांसीसी विद्वान गार्सा-द-तासी ने प्रकाशित किया। उसके बाद उसके अनेक संग्रह प्रकाशित हुए हैं। उनकी मसनवियों, कसीदों और ग़ज़लों ने हिन्दवी भाषा और साहित्य में युगपरिवर्तन उपस्थित किया, इसलिए गूजरी के अंतिम और उर्दू के प्रथम कवि के रूप में उन्हे सदा याद किया जाएगा। (28)

ترجمہ:

> اردو شاعری کے بابا آدم ولی محمد گجراتی میں 'ولی' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی رہائش احمد آباد (گجرات) تھی۔ ولی ایک فارسی عربی عالم تھے۔ وہ احمد آباد سے سورت، اورنگ آباد اور دہلی گئے، چنانچہ ان کی شاعری میں تینوں رنگ گجری، دکنی اور دہلوی شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا انتقال احمد آباد میں ۱۷۰۷ء میں ہوا۔ ان کا مقبرہ احمد آباد میں شاہ باغ انڈر برج کے کونے پر واقع ہے جو نیلی گمبد کے نام سے مشہور ہے۔

ولی کا شعری مجموعہ فرانسیسی سکالر گارساں دتاسی نے شائع کیا تھا۔ تب سے ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی مثنوی، قصیدے اور غزلوں نے ہندوی زبان و ادب میں زمانی تبدیلی، اس لیے انھیں گجری کے آخری اور اردو کے پہلے شاعر کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

مندرجہ بالا اقتباس میں درج باتیں اس لسانی اور علاقائی کشمکش کا حصہ ہیں جو کسی نہ کسی ناحیے سے ایک بڑے شاعر پر استحقاق یا تعلق ثابت کرنے کے لیے اسے اپنے خانے میں شامل کرنے کے لیے کوشاں رہی۔ ولی کو گجراتی لکھنا وطن کی نسبت سے محل نظر ہے اور یہاں تو زبان کی نسبت ہی سے انھیں داخل کتاب کیا گیا، اس لیے یہ بات حقیقت سے اور زیادہ دور جا پڑتی ہے کہ ولی اورنگ آبادی دبستان کے موجد و موسس ہیں اور وہیں سے ان کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ تاریخ وفات اگرچہ یہاں حقیقت سے قریب ہی درج ہے۔ جائے وفات کے بارے میں پہلے باب میں بحث ہو چکی ہے۔ مصنفین نے جن تین رنگوں یعنی دکنی، گجری اور دہلوی کا ذکر کیا، اس کے شواہد فراہم نہیں کیے ہیں۔ اس بات کا جائزہ تو ولی کے ہم عصروں اور ان کے بعد آنے والے شاعروں کے کلام کی روشنی میں ہی لیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندی تحقیق و تنقید میں ذکر ولی کے اسباب مختلف ہیں۔ یہاں ولی کا مذکور ''دکنی ہندی'' کے تحت ہوا ہے۔ گو دکنی کی لسانی روایت؛ لسانی سیاست کے زیر اثر وجود میں آئی اور ادبی ورثہ پر بطور دعوا جو کتابیں اس طرح کے ناموں سے لکھی گئیں، ان کتابوں میں ولی کو ایک طرح سے ''دکنی ہندی'' کی روایت میں شامل کرنی کی کوشش ہوئی۔ ان کوششوں کا روشن پہلو یہ ہے کہ جدید ہندی کے یہ محققین اور ناقدین نو آبادیاتی تصور زبان کے زیر اثر فارسی و عربی لفظیات اور علائم سے اس درجہ وحشت رکھتے ہیں کہ یہ وصف زبان میں جہاں کہیں بھی انھیں نظر آتا ہے وہ اسے ایسے پیرائے میں ظاہر کرتے ہیں جس سے ان کی وحشت عیاں ہوتی ہے۔ ولی سے متعلق ہندی کتابوں اور تاریخوں میں پیش کیے جانے والے حقائق اردو کی تاریخوں اور

تذکروں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں کہ ہم ہندی محققین اور نقادوں کی کوئی انفرادیت ولی تحقیق و تنقید کے بارے میں نشان زد کر سکیں۔

حواشی:

۱۔ ملا وجہی۔ سب رس۔ مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن، ۱۹۳۲ ص ۱۱

۲۔ اشرف علی اشرف۔ نوسرہار۔ مرتبہ افسر صدیقی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۳، ص

۳۔ برہان الدین جانم۔ ارشاد نامہ، مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی، عثمانیہ پریس حیدرآباد، ۱۹۷۱ء، ص ۱۳۵

۴۔ ۔ ملا وجہی۔ قطب مشتری، انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۳۹، ص ۱۶

۵۔ ابن نشاطی۔ پھول بن۔ مرتبہ اکبر الدین صدیقی، ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۸، ص ۹۱

۶۔ کمال خاں رستمی بیجاپوری۔ خاور نامہ۔ مرتبہ شیخ چاند حسین، ترقی اردو بورڈ، کراچی ص ۸۳۵

۷۔ राम बाबू सकसेना, दक्खिनी हिंदी, हिंदुस्तानी एकेडमी इलाहाबाद, 1942,पृष्ठ 13

۸۔ राहुल सांकृत्यायन, दक्खिनी हिन्दी काव्यधारा, बिहार राष्ट्र भाषा परिसद, पटना,1951,पृष्ठ 5

۹۔ राहुल सांकृत्यायन, दक्खिनी हिन्दी काव्यधारा, बिहार राष्ट्र भाषा परिसद,पटना,1951,पृष्ठ31

۱۰۔ राम बाबू सकसेना, दक्खिनी हिंदी, हिंदुस्तानी एकेडमी इलाहाबाद, 1942,पृष्ठ67,68

۱۱۔ Bipin Chandra , History of Modern India, Orient Blackswan, New Delhi, 2011, p263,264

۱۲۔ बच्चन सिंह ,हिन्दी साहित्य का दूसरा इतिहास ,राधा प्रकाशन ,दिल्ली ,2021 ,पृष्ठ 237

۱۳۔ राजेश, आदि कवि वली। शम्शुद्दीन वली ,हिन्दी प्रिंटिंग प्रेस ,क़्वीन रोड़ ,दिल्ली

۱۴۔ आलिया जानी मियाँ खां पठान (सय्यद),वली औरंगबादी की काव्यसधना: एक अध्ययन बाबा साहब अम्बेडकर यूनिवर्सिटी ,औरंगाबाद ,पीएचडी थीसिस, पृष्ठ,4

۱۵۔ उक्त ,पृष्ठ,9

۱۶۔ उक्त ,पृष्ठ11

۱۷۔ उक्त ,पृष्ठ24

۱۸۔ उक्त ,पृष्ठ46,47

۱۹۔ उक्त ,पृष्ठ53

۲۰۔ उक्त ,पृष्ठ54

۲۱۔ उक्त ,पृष्ठ59

۲۲۔ उक्त ,पृष्ठ76

उक्त ,पृष्ठ84۔۲۳

उक्त ,पृष्ठ158۔۲۴

उक्त ,पृष्ठ159۔۲۵

उक्त ,पृष्ठ179۔۲۶

उक्त ,पृष्ठ173۔۲۷

उक्त ,पृष्ठ336,337۔۲۸

गुजरात की,हिंदुस्तानी काव्य धारा; ; संपादक व सह संपादक नागर,अम्बा शंकर;अला बख़्श शैख़ ;इलाहबाद हिंदुस्तानी एकैडमी,उत्तर प्रदेश ۔۲۹

गुजरात की,हिंदुस्तानी काव्य धारा; ; संपादक व सह संपादक नागर,अम्बा शंकर;अला बख़्श शैख़ ;इलाहबाद हिंदुस्तानी ۔۲۹1951 , ,पृष्ठ 86

एकैडमी,उत्तर प्रदेश 1951 , ,पृष्ठ 86

حاصل مطالعہ

ولی کے متعلق اب تک جو تحقیقی و تنقیدی کام سامنے آیا ہے،ان کی دو نوعیتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ ان کے سوانحی کوائف کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا اور دوسری یہ کہ ان کے شاعرانہ کمال کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تعین قدر کی گئی۔ ولی کے سوانحی کوائف سے متعلق خاطر خواہ معلومات نہ ہونے کے سبب محققین نے مختلف رائیں قائم کیں اور ان کی دلیلیں بھی فراہم کیں۔ ولی پر سب سے پہلا کام ۱۸۳۳ میں سامنے آیا۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۳۳ میں ولی کا دیوان مع مختصر مقدمہ بہ زبان فرانسیسی پیرس سے شائع کیا۔ مقدمہ کی یہ تحریر ولی کی شاعری کی قدر و قیمت اور سوانحی حالات پر مفصل بحث تو نہیں کرتی البتہ ولی کے متعلق مباحث کا آغاز ضرور کرتی ہے۔ دتاسی کے اس مقدمہ سے پہلی بار ولی کے کلام سے دلائل پیش کر کے اور تذکروں کی حاصل شدہ معلومات کو سامنے رکھ کر سائنٹفک انداز میں ولی شناسی کا آغاز ہوا۔ تذکروں کے روایتی طریقے سے ہٹ کر عقل و قیاس کا راستہ ہموار کیا گیا۔ مثلاً ولی کے شعر میں شہر سورت کے ذکر سے دتاسی یہ قیاس لگاتا ہے کہ ولی سورت میں پیدا ہوئے۔ دیگر شہروں، جن کا ولی نے ذکر کیا ہے،ان کے متعلق لکھتا ہے کہ کبھی ولی سورت میں کبھی گجرات میں کبھی دکن میں رہا۔یا یہ کہ دیوان جہاں میں بینی نرائن نے ولی دکنی اور مرزا محمد ولی دہلوی کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ ۱۸۳۳ کے بعد ۱۹۲۰ میں ابراہیم سایانی ولی کے کلام کا ایک ناقص نسخہ ترتیب دیتے ہیں اور اس کے مقدمہ میں ولی کے سوانحی کوائف سے بحث کرتے ہیں۔ ۱۸۲۷ میں احسن مارہروی کئی نسخوں کے تقابل سے ولی کی کلیات مرتب کرتے ہیں اور اس کے مقدمہ میں شد و مد سے ولی کو دکنی ثابت کرتے ہیں۔ احسن مارہروی ولی کے کلام میں موجود دکنی نسبت اور ابوالمعالی کے فرزند کے فقرہ "متوطن دکن" کے علاوہ ولی کے کلام کا لسانی جائزہ لیتے ہوئے ،دکنی الفاظ کی نشاندہی کرتے ہیں اور ولی کے دکنی ہونے کے ثبوت میں ایک نئی دلیل کا اضافہ کرتے ہیں۔ ۱۹۳۷ میں ولی کے دو صد سالہ جشن کے موقع پر محی الدین قادری زور "ولی کا وطن" کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کرتے ہیں اور اس میں ولی کو دکنی ہونے کی پرزور وکالت کرتے ہیں۔ ۱۹۲۵ میں حکیم شمس اللہ قادری نے اردو ادب کی ایک مختصر تاریخ قلم بند کی۔ اس میں وہ ولی کو اورنگ آبادی شعرا میں جگہ دیتے ہیں اور ولی کے شاہ وجیہ الدین علوی کے خانوادے سے ہونے کو رد کرتے ہیں۔ غرض اکثر مضمون،مقدموں اور تاریخوں میں ولی کے دکنی اور اورنگ آبادی ہونے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کی تردید کے لئے محمد میاں اختر جوناگڑھی نے رسالہ مصنف اکتوبر ۱۹۴۵ میں "ولی گجراتی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ جس میں ولی کے دکنی ہونے کے تمام دعاوی کو دلائل سے رد کرنے کی کوشش کی۔ اور ولی کے دکنی ثابت کرنے کو دکنی پروپیگنڈہ کا نام دیا۔ ولی کے دکنی ہونے کے متعلق جتنے دلائل پیش کیے گئے اختر جوناگڑھی نے ان تمام کا

جواب دیا۔ مثلاً۔ تذکرہ نویسوں نے گر ولی کو دکنی اور نگ آبادی لکھا ہے تو انھیں تذکروں میں ولی کو گجراتی بھی لکھا گیا ہے ۔ولی کے اشعار میں موجود دکنی نسبت کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ دکن کا اطلاق عام طور سے گجرات پر بھی ہوتا رہا ہے۔یا یہ کہ خود گجراتی مصنفین نے گجرات کو دکن میں شمار کیا ہے۔ولی کے یہاں سے دکنی الفاظ و محاورات پائے جانے کی دلیل میں گجراتی الفاظ و محاورات کی فہرست بھی پیش کر دی ہے۔ سید ابو المعالی کے فرزند کے نقل کردہ دیوان میں متوطن گجرات کی توجیہ کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے یہاں بھی متوطن دکن سے مراد متوطن گجرات ہی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نسخہ کسی دوسرے نسخہ کی نقل ہو جس میں کاتب نے ولی کو متوطن دکن لکھ دیا اور اسے ولی کے وطن کے متعلق درست علم نہ ہو۔اس کے علاوہ یہ بھی دلیل لاتے ہیں کہ ولی کے جتنے احباب کا ذکر ولی کے کلام میں ملتا ہے ان سب کا تعلق گجرات سے ہے دکن سے نہیں۔اگر ولی دکنی یا اورنگ آبادی ہوتے تو ان کے سوانحی کوائف کے متعلق اورنگ آباد سے بھی معلومات سامنے آنی چاہئے تھیں جب کہ ولی کی تعلیم،ان کی وفات اور احباب کے متعلق ساری تحقیقات گجرات سے معلوم ہوئیں ہیں۔ ظہیر الدین مدنی کے بھی تقریباً یہی دلائل ہیں۔ محمد اختر جونا گڑھی اور ظہیر الدین مدنی ولی کا مولد و مسکن گجرات ثابت کرتے ہیں اور ان کی بیشتر معلومات پیر حسینی علوی کی فراہم کردہ ہیں۔ سید نجیب اشرف کا تمسک نامہ اور شاہ وجیہ الدین علوی کے خانوادہ کے شجرۂ نسب میں مذکور شاہ ولی اللہ نامی شخص کا نام،ان دو صاحبان کی بنیادی دلیلیں ہیں۔ ظہیر الدین مدنی نے ۱۹۸۱ میں سخنوران گجرات لکھی اور اس میں انھوں نے ولی کے نام،وطن،احباب وغیرہ پر مفصل گفتگو کی۔غرض ۱۸۳۳ سے شروع ہوا یہ تحقیقی سلسلہ ولی دکنی یا ولی گجراتی کے گرد گھومتا رہا۔

غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ جو محققین دکنی اور گجراتی نسبت میں تطبیق کی صورت نکالتے ہیں،وہ بھی ولی کے کسی ایک نام پر اتفاق نہیں کر سکے ہیں۔ محمد صادق نے ولی کے گجراتی نسبت کی توجیہ کی ہے اور لکھا ہے کہ ممکن ہے ولی گجرات میں پیدا ہوئے ہوں اور وہیں تعلیم پائی ہو،لیکن ان کو خود کو دکھنی کہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا تعلق دکن سے بھی تھا۔اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ ولی دکن منتقل ہو گئے ہوں۔ کیوں کہ کسی گجراتی کا خود کو دکنی کہنا کسی طرح قابل قبول نہیں۔ محمد صادق اس توجیہ کے بعد بھی ظہیر الدین مدنی کا تحقیقی کردہ ولی کا نام درج نہیں کرتے۔اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ انھیں ولی کے گجراتی ہونے میں تردد ہے۔حالانکہ جب محمد صادق نے یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ ولی کا تعلق گجرات سے ہو سکتا ہے تو اس صورت میں کم از کم ولی کے نام پر اتفاق ہو جانا چاہیئے تھا۔اسی طرح ولی کو گجراتی کہنے والے محققین اس پر بضد ہیں کہ ولی گجراتی الاصل ہے

،یہیں پیدا ہوا،یہیں تعلیم پائی اور یہیں وفات ہوئی۔ ولی کو خود کو دکنی کہتے ہیں؛وہ اس بات کی نہ کوئی معقول توجیہ کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی ٹھوس دلیل لاتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ولی دکنی یا ولی گجراتی کے دعاوی و دلائل کسی آخری فیصلہ تک نہیں پہنچا تیں۔ جتنی دلیلیں ولی کی دکنی ہونے کی ہیں اتنی ہی ولی کے گجراتی ہونے کی بھی ہیں۔اس مقالہ میں میں نے کوشش کی ہے کہ ولی دکنی اور ولی گجراتی کہنے کی ایسی تطبیق پیدا کی جائے جو زیادہ قرین قیاس ہو۔ کیوں کہ سارے دعاوی اور دلائل کے باوجود ولی کا خود کو دکن سے منسوب کرنا ایسی بات ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔دوسروں کا ولی کو دکن سے منسوب کرنے کی توجیہ کی جاسکتی ہے لیکن اس کی توجیہ کیا ہو کہ ولی خود کو دکنی کہتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دکنی کی تمام روایت کو سامنے رکھ کر اس میں خود کو نمایاں کرنا چاہتے تھے۔یا دہلی (ہندوستان) میں کوئی ایسی ادبی روایت موجود تھے،جس کے مقابلے میں ولی نے خود کو دکنی کہہ کر اہل دہلی سے خود کو ممتاز کرنا چاہا اور دکنی کی روایت کی اہمیت کو تسلیم کرانا چاہا۔دوسری بات کا ہونا مشکل ہے کہ دہلی میں اس وقت تک اس قسم کی کوئی روایت نہ تھی۔دوسری بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ولی خود کو تمام دکنی روایتوں سے خود کو منسلک کرکے دیکھتے تھے اور اپنے کلام کو تمام دکن کے نمائندہ کے طور پر دیکھتے تھے۔

ولی کے نام و وطن کی طرح ولی کی دہلی آمد اور شاہ گلشن سے کسب فیض کا معاملہ بھی ادبی تحقیق کا نزاعی موضوع رہا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ ولی کی دہلی آمد کا سب سے پہلے میر کے یہاں ہوتا ہے۔ میر نے نکات الشعرا میں لکھا کہ کہا جاتا ہے،ولی دہلی آئے اور شاہ گلشن سے مستفید ہوئے۔ قیام الدین قائم کا بیان اسی روایت کی دوسری کڑی کہی جاسکتا ہے کہ میر نے جو بات می گویند سے کہہ کر اسے مجہول رکھا تھا،قائم نے آمد دہلی کی تاریخ اور ولی کی شعری منازل کی تخصیص کرکے اس بات کو حتمی کر دیا کہ ولی اس وقت باقاعدہ شاعری نہیں کر رہے تھے،بلکہ خدوخال کے بیان میں کچھ اشعار موزوں کر لیا کرتے تھے۔دہلی میں شاہ گلشن کے مشورے سے انھوں نے ریختہ میں باقاعدہ شاعری کی ابتدا کی۔اس طرح قائم اور میر ولی پر دہلوی احسان ثابت کرکے ان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تذکروں کا تحقیقی مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اکثر تذکرے ان دو تذکروں سے کسب فیض کرتے ہیں،اور مذکورہ انھیں تذکروں میں موجود مواد و مضامین کا اعادہ اپنے تذکروں میں کرتے ہیں؛خاص طور سے شمالی ہند کے تذکرے۔اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ اکثر تذکروں میں ولی کے متعلق یہی لکھا گیا ہے کہ وہ دہلی آئے اور شاہ گلشن سے فیض حاصل کیا تو اس بات کو کیسے نظر انداز کیا جائے۔ یہ دلیل اس لیے قابل قبول نہیں کہ تذکروں میں مندرج

معلومات تحقیقی نوعیت کے نہیں ہوتے ؛الاماشاء اللہ ۔بالعموم تذکرے پہلے سے موجود تذکروں میں مرقوم بیانات استوار کیے جاتے تھے ۔اس لیے ولی کے متعلق شاہ گلشن اور دہلی آمد کی روایت کو ان دو تذکروں کی باز گشت ہی تصور کرنا چاہئے ۔شمالی ہند کے تذکرہ نویسوں کے علی الرغم دکنی تذکرہ نویسوں نے ولی کی دہلی آمد کا کہیں ذکر تک نہیں کیا ہے ۔مثلا چمنستان شعرا کے مؤلف شفیق اورنگ آبادی اور گلشن گفتار کے مصنف حمید اورنگ آبادی ولی کی دہلی آمد کی بابت خاموش ہیں ۔ہم دیکھتے ہیں کہ میر کے تذکرے میں بیان کردہ یہ روایت، تذکروں سے آگے تاریخوں میں بھی جگہ پاتی ہے اور اسی روایت کو بنیاد بنا کر ولی کے سفر دہلی کے احوال مرتب کیے جاتے ہیں ۔مولانا محمد حسین آزاد نے اس روایت میں اضافہ کرتے ہوئے ولی کی دو مرتبہ آمد دہلی کو مندرج کیا اور تاریخ نگاروں نے اسے بھی اپنی تاریخوں میں نقل کیا ۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ولی کی دہلی آمد کی بابت روایتیں حقیقت سے اور دور جا پڑیں ۔محمد حسین آزاد نے مصحفی کے قول کو جو انھوں نے قائم کو حوالہ بناتے ہوئے درج کیا ہے کہ" محمد شاہی عہد کے دوسرے جلوس میں ولی کا دیوان دہلی آیا"،بنیاد بنا کر لکھا کہ ولی عہد محمد شاہی میں مع اپنے دیوان دہلی آئے ۔جبکہ مصحفی نے ولی کی آمد کا کہیں ذکر نہیں کیا ۔ولی کے سنہ وفات کی جب بحث چھڑی اور مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق ۱۷۰۷ء ولی کا سنہ وفات متعین کیا گیا تو جمیل جالبی کا اس پر بنیادی اعتراض یہی تھا کہ ولی گر ۱۷۰۰ میں دہلی آئے تو آخر اتنی جلدی کیسے دیوان جمع کر لیا؛ان کا یہ سوال درست ہے ۔لیکن قائم کی بیان کردہ روایت کہ" ولی نے دہلی میں شاہ گلشن سے شاعری سیکھی " کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ولی کو دہلی کا مرہون منت گردانا جائے اور ان کی وفات جس قدر دیر سے ثابت ہوگی اسی قدر دہلی کا احسان ثابت ہوگا ۔اسی روایت کا نتیجہ تھا کہ ولی کی وفات کو ۱۷۰۷ میں تسلیم کرنا ناقابل قبول تھا ۔اس لئے ولی کی وفات کو مؤرخین نے ۱۷۲۰،۲۵،۲۲،بلکہ رام بابو سکسینہ نے تو ۱۷۴۴ تک پہنچایا ہے ۔

مولانا محمد حسین آزاد کی ولی کی دو مرتبہ آمد دہلی والی روایت بالکل بے بنیاد ہے ۔آزاد کی ہی روایت کا مصنف گل رعنا اور دیگر تاریخ نویسوں نے اعادہ کرکے اسے مستحکم کر دیا ۔عبد القادر سروری، نصیر الدین ہاشمی، جمیل جالبی وغیرہم نے اس روایت پر تکیہ کرتے ہوئے اسی کو بنیاد بنا کر ولی کے سوانحی کوائف مرتب کیے ۔حد تو یہ ہے کہ نصیر الدین ہاشمی مولوی عبدالحق کی تحقیق کردہ ولی کے سنہ وفات کی تاریخ کو درست لکھتے ہیں،اس کے باوجود ولی کی دوسری آمد دہلی عہد محمد شاہی کے دوسرے جلوس میں بتاتے ہیں ۔کجدارو مریز کی یہ صورت اس لیے پیدا ہوئی کہ تاریخ نویسوں نے ان روایتوں پر اندھا اعتبار کیا ۔

میر نے ولی کی اہمیت کے پیش نظر خاموشی اختیار کی اور ایسی تجریدی روایت خلق کی جس کے کئی پہلو ممکن ہو سکتے تھے۔ شاہ گلشن سے ولی کی نسبت ضرور تھی کیوں کہ ولی شاہ گلشن کا ذکر اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔ اس نسبت کو میر نے مجہول روایت کا ایسا پیرایہ دیا کہ واقعی تعلق کا احتمال بھی باقی رہے اور کسی نئے تعلق کا گمان بھی پیدا ہو سکے۔ اور ان پر حرف بھی نہ آسکے۔ قائم نے اس روایت کو مستحکم کرنے میں کلیدی کردار نبھایا۔ قائم کے بیان کے مطابق ولی جب ۱۷۰۰ میں دہلی آئے اس وقت وہ باقاعدہ شاعری نہ کر رہے تھے۔ جبکہ ناصر علی سرہندی جس کی سنہ وفات ۱۶۹۷ ہے، اس سے ولی اپنا تقابل کرتا ہے اور انھیں للکارتا ہے۔

پڑے سن کر اچھل جیوں مصرع برق
اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

ظاہر ہے ناصر علی سرہندی جیسے شاعر کو للکارنا کسی معمولی شاعر کا حوصلہ تو نہیں ہو سکتا۔ ولی نے کسی دکنی گجری شاعر سے اپنا مقابلہ نہیں کیا ہے بلکہ ایسی توانا و زندہ روایت کے شاعر سے اپنا مقابلہ کیا جو اس عہد میں مسلم الحیثیت تھا۔ زمانہ اسے تسلیم کرتا تھا ۔ سرخوش جیسا شاعر جس کی بے حد توقیر کرتا تھا۔

شاہ گلشن والی روایت یوں بھی قابل قبول نہیں کہ شاہ صاحب خود بھی فارسی زبان کے شاعر تھے۔ جب ان کو ریختہ میں اس نوع کی شاعری کا امکان نظر آتا تھا پھر انھوں نے خود اس زریں خیال کو عملی جامہ کیوں نہ پہنایا کہ اس سے ان کے تا ابد زندہ رہنے کی راہ روشن ہوتی تھی۔

ولی کے شعری اوصاف پر بات کرتے ہوئے اکثر ناقدین ان کے یہاں موجود موضوعات کو بیان کر کے خاموش ہو جاتے ہیں ۔ ناقدین ولی کو جمال پرست

انھیں جمال پرست، نشاط و مسرت کا شاعر جو عشق کی حقیقی کیفیتوں سے نہ گزرا ہو، حسن کا مصور، سراپا نگار، یاس و حرمان کی عدم موجودگی، فلسفہ حکمت اور فکر و خیال سے عاری شاعری کرنے والا شاعر بتاتے ہیں۔ سید عبد اللہ، وزیر آغا، اور عبادت بریلوی کے خیالات ولی کی شاعری کے متعلق تقریبا اسی نوع کے ہیں جو اس کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ کچھ ناقدین اس کی شاعری میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کی تلاش کرتے ہیں۔ ولی کی شاعرانہ عظمت محض ان کے موضوعات سے عبارت نہیں ہے۔ حسن

و عشق کی باتیں اس سے قبل کی جارہی شاعری میں بھی موجود تھیں، پھر کیا وجہ ہوئی کہ ہم نے ولی کو جدید غزل کا باوا آدم کہا ۔اس سوال کا خاطر خواہ جواب اب تک سامنے نہیں آیا۔

اس مقالہ میں میں نے ولی کے ذریعہ موضوعات کو مرکزی حیثیت نہ دے کر اس امر کی تحقیق کی ہے کہ ولی نے اپنے کلام کو کن اصول شاعری کو برتا۔ ولی سے قبل کی غزلیہ شاعری کی کیفیت ولی کی کلام سے کیوں کر مختلف ہے اور ولی کا فنی اجتہاد صحیح معنی میں کیا ہے۔ اس مقالہ کا چوتھا باب "ولی کی غزلیات کا فنی مطالعہ" انھیں سوالات کی تلاش کہا جاسکتا ہے۔

ولی کی شاعری میں برتی گئی رسومیات فارسی سے مستعار ہیں۔ ولی نے عشق کا تصور فارسی سے ہی اخذ کیا ہے۔ اور عشق کے انھیں لوازمات کو اپنی شاعری میں کھپایا جو فارسی غزل میں مستعمل تھیں۔ عاشق و معشوق، کے کردار اور ان کی خصوصیات فارسی شاعری سے ہی مستعار ہیں۔ مثلا عاشق کا عشق میں برباد ہونا، عشق کے تعب کھینچنا۔ اور معشوق کا جفار کار و ستم پیشہ ہونا۔ عاشق کا عشق میں ناتوانی اور قریب المرگ کی کیفیات سے گزرنا اور معشوق کا ناز و ادا، عشوہ وغیرہ سے لیس ہونا۔ یہی سبب ہے کہ ولی کے متعلق بار بار کہا گیا کہ انھوں نے فارسی مضامین کو اردو غزلیہ شاعری میں برتا اور دکنی طریقہ غزل کو دست کش ہوئے۔ لیکن ولی کا فارسی مضامین کا اپنی شاعری میں استعمال یوں نہ تھا کہ کچھ مضامین فارسی کو ولی نے اپنے کلام میں جگہ دے دی ہو، بلکہ ولی نے اس کے ذریعہ اپنی شاعری کے لیے بنیاد فراہم کی، فارسی سے مضامین لیے اور سبک ہندی والوں سے دیگر فنی اصول۔ سبک ہندی کی شاعری جو فارسی شاعری کے ہندوی طرز کے نام سے جانی گئی، اس کی خصوصیات میں معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کے ساتھ پیچیدہ خیالی کے اوصاف نے اسے فارسی طرز شاعری سے مختلف صورت دے دی تھی۔ سبک ہندی کی ایک واضح خصوصیت، اس کے تصور کائنات میں ہندوستانی تصور کائنات کی شمولیت ہے اور الفاظ کا تجریدی استعمال۔ ہندوستانی تہذیب کے بنیادی کردار اور تہذیبی علامتوں کے استعمال نے سبک ہندی کی شاعری کو ایرانی الاصل شاعری سے خاصا مختلف بنادیا۔ ولی کی شاعری کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے سبک ہندی کی شاعری کو نمونہ بنا کر اپنی شاعری کا خمیر تیار کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لیے فارسی رسومیات کو بنیاد بنایا اور دیگر فنی لوازم سبک ہندی کے شعرا سے مستعار لیا۔ معنی آفرینی، مضمون آفرینی، الفاظ کا تجریدی استعمال، ایہام، مثالیہ اور پیچیدہ خیالی، جیسے تمام رنگ ولی کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ولی نے ایک ایسی شاعری کا تتبع کرکے جو اپنی عہد میں اعلی ترین شعری خصوصیات کی حامل ہونے کے ساتھ اعلی ترین شاعری کے درجہ پر بھی فائز تھی، اردو

(ریختہ) کی شاعری کو اس کے مقابل کر دیا۔ ولی کو اپنے اس کارنامہ کا پوری طرح ادراک تھا۔ تبھی وہ ناصر علی سرہندی جیسے قد آور شاعر سے اپنا مقابلہ کرتے ہیں۔

ایک زندہ و توانا روایت کے قد آور شاعر کو ایک نوزائیدہ زبان کا شاعر یوں للکارے تو اس سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسے اپنے شعری اجتہاد اور شاعرانہ ملکہ اور فنی بصیرت کا کس قدر ادراک تھا اور اسے خوب علم تھا کہ وہ ریختہ کی شاعری کو کس منزل پہ لے آیا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ و مصادر

دیوان ولی کے نسخے:

۱۔ سایانی، حیدر ابراہیم (مرتب)، دیوان ولی، دہلی، مطبوعہ حیدر پریس، ۱۹۲۱

۲۔ احسن مارہروی (مرتب)، کلیات ولی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۲۷

۳۔ نورالحسن ہاشمی (مرتب) کلیات ولی، لکھنؤ اردو اکادمی اتر پردیش، ۱۹۸۹

۴۔ عبدالحق (مرتب) کلیات ولی، نئی دہلی، نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، ۲۰۱۹

تذکرے:

(آ)

۱۔ آزاد، محمد حسین؛ آب حیات؛ لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، چھٹا ایڈیشن ۲۰۰۳ء

(الف)

۲۔ الہ آبادی، امر اللہ، ابوالحسن امیر الدین احمد؛ مسرت افزا؛ پٹنہ، دی آرٹ پریس سلطان گنج، ۱۹۸۶

۳۔ اورنگ آبادی، خواجہ خان، حمید؛ گلشن گفتار؛ حیدرآباد، خورشید پریس، ۱۹۳۳ھ

(چ)

۴۔ چاندپوری، محمد قیام الدین قائم؛ تذکرہ مخزن نکات؛ لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۵

(خ)

۵۔ خلیل، علی ابراہیم خاں؛ تذکرۂ گلزار ابراہیم؛ (مرتب، محی الدین قادری زور) علی گڑھ، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۳۴ء

(ش)

۶۔ شفیق، لچھمی نارائن؛ چمنستان شعراء؛ اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۴ء

۷۔ شورش، غلام حسین؛ تذکرۂ شورش (رموز الشعراء)؛ لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، پہلا ایڈیشن، ۹۱۸۴ء

(ص)

۸ صدیقی، منشی قدرت اللہ؛ طبقات الشعراء؛ لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء

(ع)

۹ علی، سردار، محمد؛ تذکرہ شعراء اورنگ آباد؛ حیدرآباد، مطبع شمس الاسلام پریس، ۱۹۲۶ء

(ف)

۱۰۔ فائق، قاضی نور الدین؛ تذکرہ مخزن الشعر؛ لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، دوسرا اکادمی ایڈیشن، ۲۰۱۰ء

(ک)

۱۱۔ کریم الدین؛ طبقات شعرائے ہند؛ لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، ۹۱۸۳ء

(گ)

۱۲۔ گردیزی، علی الحسینی؛ تذکرۂ ریختہ گویاں؛ مرتبہ؛ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری؛ لکھنؤ، نسخہ ندوہ، مکتوبہ؛ ۱۱۷۴ھ مطابق ۱۷۶۰ء، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۵ء

(ل)

۱۳۔ لطف، میر زا، علی؛ تذکرہ گلشن ہند؛ نئی دہلی، قومی کونسل، بہ اشتراک اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنئو، پہلا اکادمی ایڈیشن ۱۹۸۶ء، پہلا قومی کونسل ایڈیشن ۲۰۰۵ء

(م)

۱۴۔ مبتلا، میر زا کاظم؛ گلشن سخن؛ مرتبہ؛ مسعود حسن رضوی ادیب؛ علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۶ء

۱۵۔ مصحفی، غلام ہمدانی؛ ریاض الفصحاء؛ مرتب، مولوی عبد الحق، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۴ء

۱۶۔ محمد ممتاز، سید؛ آثار الشعراء؛ بھوپال، مطبع شاہجہانی

۱۷۔ ملکاپوری، خاں، عبد الجبار، محمد، صوفی؛ تذکرہ شعرائے دکن؛ حیدرآباد، مطبع رحمانی، ۱۹۱۱ء

۱۸۔ میر تقی میر؛ تذکرہ نکات الشعراء؛ مرتبہ؛ ڈاکٹر محمود الٰہی؛ لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، پہلا اکادمی ایڈیشن، ۱۹۸۴ء

۱۹۔ میر حسن؛ تذکرہ شعرائے اردو؛ لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء

۲۰۔ مصحفی، غلام ہمدانی؛ تذکرہ ہئ ہندی؛ اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو ۱۹۳۳ء

(ن)

۲۱۔ نساخ، عبد الغفور؛ سخن شعراء؛ لکھنؤ، اردو اکادمی اتر پردیش، ۱۹۸۲ء

۲۲۔ ندوی، عبد السلام؛ شعر الہند؛ اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۴۲ء

ادبی تاریخیں:

(ب)

۱۔ بابو، رام، سکسینہ؛ تاریخ ادب اردو؛ مترجم؛ مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، راجا رام کمار بک ڈپو، ۱۹۵۲ء

(ج)

۲۔ جعفر،ڈاکٹر سیدہ، گیان چند جین؛تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک؛دہلی، ترقی اردو بیورو ۱۹۹۸ء

۳۔ جالبی، جمیل،ڈاکٹر؛تاریخ ادب اردو؛جلد اول،دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۷۷ء

(ح)

۴۔ حسن، محمد؛قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ؛لکھنؤ،اتر پردیش اردو اکادمی،۲۰۰۵ء

۵۔ حسین،احتشام؛اردو ادب کی تنقیدی تاریخ؛دہلی،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۱۹۹۹ء

(ز)

۶۔ زور،سید محی الدین قادری؛دکنی ادب کی تاریخ؛حیدرآباد، مطبع اعجاز پریس ۱۹۹۴ء

(س)

۷۔ سرور، آل احمد؛(مرتب) علی گڑھ تاریخ ادب اردو؛علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی پریس،۱۹۲۶ء

۸۔ سروری،عبدالقادر؛اردو کی ادبی تاریخ؛دہلی،جمال پریس،۱۹۷۶ء

(ک)

۹۔ کاشمیری، تبسم؛اردو ادب کی تاریخ ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک؛لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء

تنقیدی و تحقیقی کتابیں :

ثانوی مآخذ و مصادر

(آ)

۱۔ آغا،وزیر؛ تنقید اور احتساب؛ لاہور، مکتبہ جدید پریس،۱۹۶۸ء

(الف)

۲۔ ابو العلائی،عارف؛ مرتب؛ دکن کی زبان؛ حیدرآباد، مطبع ادبیہ،۱۳۵۴ھ

۳۔ اثر،ڈاکٹر محمد علی؛ دکنی غزل کی نشو و نما؛ حیدرآباد، خورشید پریس، چھتہ بازار،۱۹۸۶ء

۴۔ احمد،ساحل؛ ولی فن و شخصیت اور کلام؛ الہ آباد، تاج پریس،۱۹۷۹ء

۵۔ ادیب،اویس احمد؛ اردو کا پہلا شاعر پہلا مدون ولی دکھنی؛ الہ آباد، اسرار کریمی پریس، طبع اول،۱۹۴۰ء

۶۔ اسلم مرزا؛ آئینہ معنی نما (ولی اورنگ آبادی۔ بعض حقائق)؛ نوائے دکن پبلی کیشنز، اکتوبر ۲۰۰۳ء

۷۔ انور سدید،ڈاکٹر؛ اردو ادب کی تحریکیں؛ دہلی، کتابی دنیا،۲۰۰۴ء

(ب)

۸۔ بیگ، آغا مرزا؛ ولی اورنگ آبادی؛ اورنگ آباد، کتب خانہ آغا مرزا بیگ،۲۰۰۲ء

(ج)

۹۔ جالبی، جمیل؛ دیوان حسن شوقی؛ مرتب، کراچی، انجمن پریس کراچی،۱۹۷۱ء

۱۰۔ جعفر،ڈاکٹر سیدہ؛دکنی رباعیاں؛حیدرآباد، آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی،۱۹۶۶ء

۱۱۔ جینابڑے، معین الدین؛عارف الدین خاں عاجز اورنگ آبادی حیات و ادبی خدمات؛نئی دہلی،اردو بک ریویو،۲۰۰۴ء

۱۲۔ جینابڑے، معین الدین؛دبستان اورنگ آباد؛نئی دہلی،اردو بک ریویو۲۰۰۶ء

(ح)

۱۳۔ حسین، ثریا؛گارسیں دتاسی اردو خدمات، علمی کارنامے؛لکھنؤ،اردو اکادمی اترپردیش،۱۹۸۴ء

(د)

۱۴۔ دتاسی، گارساں؛خطبات گارساں دتاسی؛مرتب؛مولوی عبدالحق،اورنگ آباد،انجمن ترقی اردو ہند،۱۹۳۵ء

۱۵۔ دتاسی، گارساں؛تاریخ ادبیات ہندوی وہندوستانی؛گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ، سلسلہئ مطبوعات رائل ایشیاٹک سوسائٹی۱۸۳۹ء

(ر)

۱۶۔ ردولوی،ڈاکٹر شارب؛مطالعہئ ولی (تنقید وانتخاب)؛لکھنؤ،نصرت پبلشرز وکٹوریہ اسٹریٹ،۱۹۷۲ء

(ز)

۱۷۔ زور،سید محی الدین قادری؛ادبی تحریریں؛حیدرآباد، مطبع نیشنل پریس ۱۹۶۳ء

(ش)

۱۸۔ شبلی نعمانی،علامہ؛شعر العجم؛جلد سوم،اعظم گڑھ، مطبع معارف،۱۹۴۵ء

۱۹۔ شرما،شری رام؛مترجم؛غلام رسول مہر؛دکنی زبان کا آغاز و ارتقاء؛حیدرآباد،انتخاب پریس،۱۹۶۷ء

۲۰۔ شعلہ،اے،ایم؛شعرائے گجرات؛دہلی،نعمانی پریس،اگست ۱۹۸۳ء

۲۱۔ شہپر، رسول؛ وہاج الدین علوی؛ قصیدے کی شعریات؛ دہلی، عرشیہ پبلی کیشن، ۲۰۱۷ء

(ص)

۲۲۔ صدیقی، عبد الستار؛ مقالات صدیقی؛ مرتب؛ مسلم صدیقی، لکھنؤ، اردو اکادمی اتر پردیش، ۱۹۸۳ء

(ض)

۲۳۔ ضیاء، حبیب؛ دکنی زبان کی قواعد؛ کراچی، باب الاسلام پریس، ۱۹۶۹ء

(ط)

۲۴۔ طالبات جامعہ عثمانیہ؛ مرتبین، نذر ولی؛ حیدرآباد، مکتبہ ابراہیمیہ پریس ۱۹۳۷ء

(ع)

۲۵۔ عارفی، آفتاب عالم؛ کلاسیکی تصور شعر؛ نئی دہلی، براؤن پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء

۲۶۔ عبد اللہ سید؛ ولی سے اقبال تک؛ لاہور، جدید اردو ٹائپ پریس، اگست ۱۹۷۶ء

۲۷۔ علوی، حسینی پیر، سید؛ تذکرۃ الوجیہ؛ گجرات اردو اکادمی، اکتوبر ۱۹۹۰ء

(ف)

۲۸۔ فاروقی، شمس الرحمن؛ اردو کا ابتدائی زمانہ؛ کراچی، آج پبلیکیشنز، ۲۰۰۹ء

۲۹۔ فاروقی، شمس الرحمن؛ شعر شور انگیز؛ جلد سوم، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جولائی ۲۰۰۸ء

۳۰۔ فاروقی، شمس الرحمن؛ اردو غزل کے اہم موڑ؛ نئی دہلی، غالب اکیڈمی، ۲۰۰۶ء

(ق)

۳۱۔ قادری، حکیم شمس اللہ؛ اردوئے قدیم؛ لکھنؤ، نولکشور پریس، ۱۹۴۷ء

۳۲۔ قیوم صادق،ڈاکٹر؛دکنی ادب؛ناشر؛ کرناٹک ادبی سرکل،صادق منزل راجا پور روڈ گلبرگہ،۱۹۸۸ء

(م)

۳۳۔ مارہروی،احسن؛کلیات ولی؛انجمن ترقی اردو،۱۹۵۳ء

۳۴۔ محمد،اشرف خاں؛ولی انتخاب و تہذیب؛نئی دہلی،اعجاز پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۱ء

۳۵۔ مدنی،ظہیر الدین،سید؛ولی گجراتی؛بمبئی،اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی،۱۹۵۲

۳۶۔ مدنی،ظہیر الدین؛اردو غزل ولی تک؛بمبئی،یونیورسل پریس،۱۹۶۱ء

۳۷۔ مدنی،ظہیر الدین؛اردو غزل گجرات میں؛گاندھی نگر،اردو ساہتیہ اکادمی،۱۹۹۵ء

۳۸۔ مدنی،ظہیر الدین؛سخنوران گجرات؛نئی دہلی،ترقی اردو بیورو،۱۹۸۱ء

(ن)

۳۹۔ نارنگ،گوپی چند؛ولی دکنی(تصوف،انسانیت اور محبت کا شاعر)؛نئی دہلی،ساہتیہ اکیڈمی،۲۰۰۵ء

(ہ)

۴۰۔ ہاشمی،نصیر الدین؛دکن میں اردو؛لکھنؤ،نامی پریس،۱۹۳۶ء

۴۱۔ ہاشمی،نصیر الدین؛دکنی ہندو اور اردو؛حیدرآباد،ابراہیمیہ۱۹۵۶ء

۴۲۔ ہاشمی،نصیر الدین؛مقالات ہاشمی؛لاہور،فیروز پرنٹنگ ورکس،۱۹۳۹ء

۴۳۔ ہاشمی،نصیر الدین؛دکنی کلچر؛لاہور،مطبع عالیہ،۱۹۶۳ء

۴۴۔ ہاشمی،نورالحسن؛ہندوستانی ادب کے معمار ولی؛دہلی،ساہتیہ اکادمی،۲۰۰۶ء

رسائل:

۱۔ الموسیٰ؛ سٹی کالج میگزین، مدیر، سید محمد، یادگار ولی نمبر، حیدرآباد، ۱۹۳۷ء

۲۔ مجلہ عثمانیہ؛ مدیر، سید معین الدین قریشی، حیدرآباد، شمارہ ۴۔ جلد اول، ۱۳۳۷ھ

۳۔ مصنف؛ مدیر، سید الطاف علی بریلوی، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی پریس، شمارہ نمبر ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء

हिंदी पुस्तकें:

(अ)

1. अहमद,इकबाल;दख्खिनी साहित्य का आलोचनात्मक इतिहास; संपदक, लोकभारती प्रकाशन,1986

(ग)

2. गोस्वामी ,डा; कृष्ण कुमार ,अग्रवाल डा' सरोज ;संपादक ,दक्खिनी भाषा और साहित्य ;प्रकाशक, उच्चय शिक्षा और संसथान 1991

(प)

3. पांचाल,डा, परमानंद,दख्खिनी हिंदी:विकास और इतिहास;अलंकार प्रकाशन शाहदरा,दिल्ली

(त)

4. तिवारी ,भोलानाथ ,कमल सिंह ;संपादक व सह संपादक ,सम्पर्क भाषा हिंदी ;प्रभात प्रकाशन,दिल्ली

(म)

5. मेत्तर,वी,पी ,मुहम्मद कुंज ; दक्खिनी हिंदी भाषा और साहित्य: विकास की दिशाएँ;लोकभारती प्रकाशन 2011

(न)

6. नागर,अम्बा शंकर;अला बख़्श शैख़; संपादक व सह संपादक,हिंदुस्तानी की काव्य धारा;इलाहबाद हिंदुस्तानी एकैडमी,उत्तर प्रदेश 1951

(व)

7. व्यास ,डा ,नटवर लाल अम्बाला ;गुजरात के कवियों की हिंदी काव्य साहित्य को देन ;आगरा, कैलाश प्रिंटिंग प्रेस ,1967

(श)

8. शर्मा ,डा,श्रीराम;दख्खिनी का पद्द और गद्द; हैदराबाद,हिंदी प्रचार सभा ,1954

9. शर्मा ,डा,श्रीराम;दख्खिनी हिंदी का साहित्य; हैदराबाद ,दख्खिनी प्रकाशन समिति,1962

(स)

10. सिंह ,बच्चन ;हिन्दी साहित्य का दूसरा इतिहास ;राजकमल प्रकाशन, 2018

11. सांकृत्यायन ,महा पंडित राहुल;दख्खिनी की काव्यधारा; पटना, बिहार राष्ट्र भाषा परिषद् ,1982

12. सक्सेना, बाबुराम; दखिनी हिंदी; इलाहाबाद, हिंदुस्तानी अकादमी,1952

ENGLISH BOOKS:

(B)

1. Babu,Ram saxsena;A History Of Urdu Literature; New Delhi, Asian Educational service ,1990

2. Bailey,Grahame; A History of Urdu Literature ;Bombay ,Wrasat Ka Silsila ,1932

(S)

3. Sadiq,Mohammad; A History of Urdu literature ;Oxford University press, second edition ,1984

4. Schimmel,Annemarie; Classical Urdu Literature From the beginning to Iqbal; Wiesbaden,Otto Harrasso Witz,1975

(Z)

5. Zaidi,Ali jawad ;A History OF Urdu Literature ;Sahitya Academy ,1990

Wali Dakhni ki Adabi Khidmaat ka Tanqeedi Motaliah

(Critical Study of Wali Dakhni)

Thesis submitted to the Jawaharlal Nehru University in partial fulfillment of the requirement for the award of the Degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

By

Khushter Zarreen Malik

Under the supervision of

Prof. Moinuddin A. Jinabade

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES

School of Language, Literature & Culture Studies

Jawaharlal Nehru University

New Delhi-110067

2022